صلح الامام الحسن علیہ السلام
تصنیف
قاری ظہور احمد فیضی
مکتبہ باب العلم
لاہور پاکستان

إِنَّ ابْنِي هٰذَا سَيِّدٌ

صلح الامام الحسن علیہ السلام

تصنیف

قاری ظہور احمد فیضی

مکتبہ باب العلم، لاہور، پاکستان

نام کتاب	:	صلح الامام الحسن علیہ السلام
مُصنِّف	:	قاری ظہور احمد فیضی
پروف ریڈنگ	:	علامہ نصیر احمد نقشبندی، اوچ شریف
تصحیح و ترتیب	:	محمد احمد فیضی
کمپوزنگ	:	حسنین ظہور قادری
بک ورک	:	محمد ساجد
تعداد	:	1100
اشاعت چہارم	:	۱۴۴۳ھ، ربیع الاول بمطابق اکتوبر 2021ء
ہدیہ	:	-/1300 روپے
باھتمام	:	**الزہراء دار التحقیق (0300-4150021)**

ناشر : مکتبۃ باب العلم، لاہور۔ پاکستان

Tel: 042-37321214, 0321-1788887

E-mail: maktbababulilmlhr@gmail.com

ڈسٹری بیوٹرز

ضیاء القرآن پبلی کیشنز: گنج بخش روڈ لاہور / اردو بازار، کراچی

اسلامک بک کارپوریشن، اقبال روڈ کمیٹی چوک، راولپنڈی

مکتبہ اسلامیہ: فیصل آباد

مکتبہ خورشیدِ ملت، نزد کینال ریسٹ ہاؤس، اوچ شریف (بہاول پور)

0300 249 5037 - 0300 415 0021
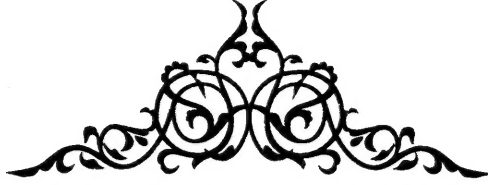
﴿وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ

إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ. وَإِنْ يُّرِيدُوا

أَنْ يَّخْدَعُوكَ فَإِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ﴾

اور اگر وہ مائل ہوں صلح کی طرف تو آپ بھی مائل ہو جایئے اُس کی طرف، اور بھروسہ کیجئے

اللہ تعالیٰ پر، بے شک وہی سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔ اور اگر وہ ارادہ

کریں کہ آپ کو دھوکہ دیں تو بیشک کافی ہے آپ کو اللہ تعالیٰ۔

(الأنفال: ٦١،٦٢)

صَالَحَ النَّبِيُّ الْمُشْرِكِينَ يَوْمَ الْحُدَيْبِيَةِ
عَلَىٰ ثَلَاثَةِ أَشْيَاءَ۔

(بخاری: ح ۲۷۰۰)

''نبی کریم ﷺ نے حدیبیہ کے دن مشرکین کے ساتھ
تین شرطوں پر مصالحت فرمائی''

آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ: إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَإِذَا أُتُمِنَ خَانَ.

منافق کی تین علامتیں ہیں: جب بولے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو اُس کے خلاف کرے اور جب اُسے امانت سپرد کی جائے تو خیانت کرے۔

(بخاري: كتاب الإيمان ، باب علامة المنافق، ح:٣٣)

آں یکے شمع شبستان حرم
حافظ جمعیت خیر الامم

وہ ایک جو شبستانِ حرم کی شمع ہیں
سب سے افضل اُمت کے محافظ

تا نشیند آتش پیکار و کیں
پشت پا زد بر سرِ تاج و نگیں

امت میں جنگ وجدال کو ختم کرنے کی خاطر
جنہوں نے تاج وتخت کو ٹھوکر ماردی۔

(اسرار و رموز ص ۵۲)

انتساب

تمام حق گو، حق پسند، اصحابِ صدق وصفا اور اربابِ عزیمت کے نام

بالخصوص فضیلۃ الشیخ عمدۃ الأولیاء نقیب الأشراف، مرشدِ شریعت

وطریقت السید محمد انور شاہ الجیلانی القادری الرزاقی

الحموی أَدَامَ اللہُ ظِلَّهُ وَمَتَّعَنَا بِهٖ سجادہ نشین

خانقاہ عالیہ سدرہ شریف۔ پاکستان

اِهْدَاء

یہ فقیر اپنی اِس معمولی کاوش کو اُس ہستی کی بارگاہ میں ھدیہ کرتا ہے جنہیں اللہ تبارک و تعالیٰ نے شیطان کے ہر مکر و فریب سے محفوظ فرما دیا تھا، جو ہستی حق و باطل، عدل و بغاوت، ہدایت و ضلالت اور دین و دنیا کے مابین حد فاصل اور امتیاز کی حیثیت رکھتی تھی۔ جن کی حقانیت کا یہ عالم تھا کہ ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے سامنے جنگِ جمل میں حق گوئی کا اظہار فرمایا تو اماں پاک نے فرمایا: میں دوسرے کسی بھی صحابی کے بارے میں کچھ کہنا چاہوں تو کہہ سکتی ہوں مگر ان کے بارے میں کہنے کو کچھ بھی نہیں، کیونکہ یہ سر کے بالوں سے قدموں کے تلووں تک سراپا ایمان ہیں۔ نیز اُم المؤمنین نے ان کے حق میں فرمایا: آپ بہت زیادہ حق گو ہیں، اس پر اُنہوں نے کہا: اُس اللہ جل جلالہ کے لیے حمد ہے جس نے آپ کی زبان پر میری حق گوئی کا فیصلہ جاری فرما دیا۔ یعنی پیکرِ حق، عاشق مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، سپاہی مرتضیٰ علیہ السلام، شہید ابن الشہیدَین سیدنا و مولانا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ. ع:

گر قبول افتد زہے عز و شرف

حمد و صلاۃ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَآلِهِ الطَّيِّبِيْنَ الطَّاهِرِيْنَ الْمُطَهَّرِيْنَ وَأَصْحَابِهِ الْمُنْتَخَبِيْنَ وَمَنْ تَبِعَهُمْ بِإِحْسَانٍ إِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ.

مقصدِ تالیف

یہ بات ضرور ذہن نشین رکھیے گا کہ اہل بیت کرام علیہم السلام کے متعلق میری کسی تحریر کا مقصد محض اُن کے فضائل یا تفضیل نہیں بلکہ اُن کی اعلیٰ سیرت سے آگاہ ہونا اور آگاہ کرنا، تمام امور میں اُن کے اعتدال و توازن سے اہل اسلام کو معلومات فراہم کرنا، خود غرضی سے اُن کا منزہ و مبرا ہونا اور ہر حال میں کتاب و سنت پر قائم رہنے اور اُمت کو قائم رکھنے میں اُن کی کاوشوں اور قربانیوں کو پیش کرنا میرا مقصد ہے۔

اُن کی افضلیت و تفضیل کا اثبات میرا مقصدِ تالیف ہے اور نہ ہی اُن ذواتِ مقدسہ کو اِس سے کوئی سروکار ہے۔ اُن کے مدنظر تو ہمیشہ دینِ اسلام کا تحفظ، اُس کا ابلاغ اور اُس کی برتری رہی ہے، اور اُن کی اتباع میں ہمارا مقصد بھی یہی ہے۔ نبی کریم ﷺ کو بھی سب سے زیادہ فکر اسی بات کی تھی، یہی وجہ ہے کہ آپ نے اپنے بعد اپنی خلافت کے لیے اہل بیت کرام علیہم السلام کے حق میں کوئی واضح حکم نہ فرمایا اور غیر اہل بیت کے لیے اشارات و کنایات فرما گئے تا کہ کسی مسلم اور غیر مسلم کے دل میں یہ خیال ہی نہ آ سکے کہ (سید العالمین) محمد (ﷺ) اپنے گھر والوں کے لیے سب کچھ کرتے رہے۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ بھی اسی نبوی طرزِ عمل پر گامزن رہے، اُن سے جب بعض لوگوں نے کہا کہ خلافتِ نبوت اہلِ بیت سے نکل کر دوسروں کی طرف جا رہی ہے، اور ساتھ ہی آفر بھی کر دی کہ اگر آپ چاہیں تو ہم آپ کی مدد کو تیار ہیں تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے برجستہ ارشاد فرمایا:

سَلَامَةُ الدِّيْنِ أَحَبُّ إِلَيْنَا مِنْ غَيْرِهٖ.

''دین کی بقا ہمیں دوسری باتوں سے زیادہ عزیز ہے''۔

(المرتضیٰ لأبي الحسن علي الندوي، عربي ص ٨٩، ومترجم اردو ص ١٤٩)

چنانچہ دین ہی کی سلامتی اور عروج کی خاطر وہ شیخین کریمین رضی اللہ عنہما کے ساتھ تعاون فرماتے رہے، اسی لیے اُن دونوں حضرات کا دورِ خلافت بہترین رہا، مگر خلیفۂ ثالث کے دور میں اُن کے رشتہ داروں نے اُن کے بڑھاپے سے ناجائز فائدے اُٹھانے کی کوشش کی اور معاملہ بگاڑ دیا۔ بغرض اصلاح سیدنا علی ؓ نے اُنہیں بھی سمجھانے کی بہت کوشش فرمائی اور بسا اوقات اُن کی نصیحتوں کو خلیفۂ ثالث نے قبول بھی کیا لیکن معاً بعد ہی خلیفۂ ثالث کے بعض رشتہ داروں نے آکر ایسی چکنی چپڑی باتیں کیں کہ سیدنا علی ؓ کی اخلاص بھری نصیحتوں پر عمل نہ ہو سکا۔ بالآخر اُن ہی عاقبت نااندیش رشتہ داروں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے خلیفۂ ثالث ؓ شہید کر دیے گئے۔ اس کے بعد بارِ خلافت خود سیدنا علی ؓ کے مبارک کندھوں پر آ پڑا۔ اُنہوں نے خلافت سنبھالتے ہی محض کتاب وسنت کی بالادستی کی خاطر بعض اُن نالائق لوگوں کو معزول کر دیا جن کا تقرر بوجوہ کتاب وسنت کے مطابق نہیں تھا اور اندیشہ تھا کہ اگر وہ اپنے منصب پر مزید بر قرار رہ گئے تو خلافت کا رُخ ملوکیت کی طرف مڑ جائے گا۔ اِس حکمِ معزولی پر وہ بغاوت پر اُتر آئے تو سیدنا علی ؓ کو قرآن وسنت کی بالادستی کے لیے اُن کے خلاف جہاد کرنا پڑا، جس سے قیامت تک کے لیے سیدنا علی ؓ کی حقانیت اور باغی کی بغاوت عیاں ہوگئی۔ پھر ایک موقع پر تحکیم کا معاملہ سامنے آیا تو اُسے بھی مجبوراً قبول کرنا پڑا، پھر فریقِ مخالف نے تحکیم میں تحریر کردہ شرائط کی خلاف ورزی کی تو سیدنا علی ؓ ﴿فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتّٰى تَفِيءَ إِلٰى أَمْرِ اللّٰهِ﴾ کو مدنظر رکھتے ہوئے پھر اُن کے خلاف جہادی تیاریوں میں مشغول ہوگئے مگر درمیانی مدت میں خوارج کے ساتھ جنگ ناگزیر ہوگئی، اُدھر سے فارغ ہوئے اور شام کی طرف جانے کے لیے تیاریوں میں مشغول تھے کہ اچانک اُنہیں شہید کر دیا گیا۔

پھر اُسی لشکر کو لے کر سیدنا امام حسن مجتبیٰ ؓ نے شام کا رخ کیا تو اُنہیں صلح کی پیش کر دی گئی، جس کو قبول کرنا بوجوہ اُن کی مجبوری تھی۔ اُنہیں اقتدار عزیز نہیں تھا بلکہ وہ چیز محبوب تھی جو اُنہیں بطور گھٹی ورثہ میں ملی تھی، جس کو قرآن یوں بیان فرماتا ہے: ﴿إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ

الْعَالَمِينَ﴾ اسی لیے معاہدۂ صلح میں اُنہوں نے کتاب وسنت اور خلفاء راشدینؓ کی سیرت پر چلنے کی شرائط پر زیادہ زور دیا تھا اور اپنے مخالف کو دنیا و آخرت میں جوابدہ بنایا تھا۔ معاہدۂ صلح میں یہ شرائط لکھوا کر امام پاک علیہ السلام تو بری الذمہ ہو گئے لیکن دوسری جانب سے وہی کچھ ہوا جس کا اُنہیں اور اُن کے بابا کریم علیہما السلام کو خدشہ تھا کہ خلافت کی جگہ ملوکیت آ گئی، انتخاب کی جگہ موروثی سلطنت نے لے لی، عدل کی جگہ ظلم آ گیا، اخلاص کی جگہ خود غرضی آ گئی، سنت کے مقابلہ میں بدعت آ گئی اور مشورہ کی جگہ جبر و استبداد آ گیا۔

سو ہمارا مقصدِ تالیف حق و باطل کی اِس معرکہ آرائی میں سیرتِ اہل بیت کو واضح کرنا ہے، تاکہ معلوم ہو سکے کہ اِس کشمکش میں اہل بیت کا ہدف کیا تھا اور اُن کے مخالف کی غرض کیا تھی۔ یہ توضیح اس لیے ضروری ہے کہ اہل اسلام کی فوز و فلاح کے لیے قرآن مجید کے ساتھ جو دوسری چیز چھوڑی گئی وہ اہل بیت ہیں، اور اُنہیں اُمت میں محض محبت یا دعاؤں میں وسیلہ پیش کرنے کے لیے نہیں چھوڑا گیا بلکہ اِس لیے چھوڑا گیا ہے کہ اُن کی اتباع کی جائے۔

انعام یافتہ اور انعام پذیر

قرآن مجید میں انعام یافتہ ہستیوں کی راہ اور اُن کے اُسوہ کو اپنانے کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ انعام یافتہ لوگوں میں کچھ ہستیاں ازلی منتخب ہوتی ہیں اور کچھ کسبی۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ کچھ انعام یافتہ ہوتی ہیں اور کچھ انعام پذیر۔ اسی حقیقت کو یوں بھی ادا کیا جا سکتا ہے کہ کچھ ہستیاں دنیا میں علم حاصل کرنے اور ریاضت و عبادت سے قبل ہی انعام یافتہ ہوتی ہیں۔ چنانچہ انبیاء کرام علیہم السلام سب کے سب اسی شان کے حامل ہوتے ہیں، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ.

''اللہ تعالیٰ منتخب فرما لیتا ہے فرشتوں اور لوگوں میں سے رسولوں کو''۔

(الحج: ۷۵)

سو چونکہ وہ ازلاً منتخب ہوتے ہیں اسی لیے اِرشاد فرمایا گیا:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا إِبْرَاهِيمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ.

''اور یقیناً ہم نے عطا فرمایا تھا ابراہیم کو رُشد پہلے سے''۔

(الأنبياء: ۵۱)

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے فرزند ارجمند کے بارے میں بھی اسی طرح آیات آئی ہیں۔ چنانچہ اُنہوں نے جب بیٹے کی دعا مانگی تو اُنہیں یوں خوشخبری دی گئی:

فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ.

''پس ہم نے مژدہ سنایا اُنہیں ایک حلیم فرزند کا''۔

(الصافّات: ۱۰۱)

دوسرے مقام پر علیم بیٹے کی بشارت دی گئی۔ ارشادِ الٰہی ہے:

وَبَشَّرُوهُ بِغُلَامٍ عَلِيمٍ.

''اور اُنہوں نے بشارت دی اُنہیں ایک صاحبِ علم فرزند کی''۔

(الذاريات: ۲۸)

اُن کے ازلی علیم ہونے کی عملی شہادت یہ ہے کہ جب اُنہیں اُن کے بابا کریم علیہ السلام نے فرمایا کہ بیٹا میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں ﴿فَانظُرْ مَاذَا تَرَىٰ﴾ (غور کیجئے آپ کی کیا رائے ہے؟) بچے نے جواباً یہ نہیں کہا کہ یہ خواب ہے، لہٰذا اس کی کوئی تعبیر ہوگی بلکہ عرض کیا:

يَاأَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ.

''ابا جی! کر ڈالیے جو آپ کو حکم دیا گیا ہے''۔

خواب کو حکمِ الٰہی سمجھنا ازلی علیم ہونے کی دلیل ہے، جبکہ اُن کے ازلی حلیم ہونے کا عالم یہ ہے کہ اُنہیں رضائے الٰہی کی خاطر ذبح کیا جانا تھا، لہٰذا فطری بات یہ ہے کہ اُن کے بابا اُنہیں تسلی دیتے لیکن حیران کن بات ہے کہ یہاں ذبح ہونے والا بچہ اُلٹا اپنے بابا کریم علیہ السلام کو یوں عرض کر رہا تھا:

يَاأَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ. سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ.

''ابا جی! کر ڈالیے جو آپ کو حکم دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ نے چاہا تو آپ مجھ کو صبر کرنے

والوں میں سے پائیں گے"۔

(الصافات:١٠٢)

یہ علم وحلم اُنہیں دنیا کے کس مکتب ومدرسہ سے حاصل ہوا تھا؟ کسی سے بھی نہیں بلکہ وہ ازلی منتخب ہستیوں میں سے تھے۔ اسی لیے علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے اربابِ فکرودانش کو اِس علم وحلم میں غوروفکر کی دعوت دیتے ہوئے دریافت کیا ہے۔

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے، اسماعیل کو آدابِ فرزندی؟

الغرض جس طرح انبیاء کرام علیہم السلام ازلاً منتخب ہوتے ہیں اسی طرح غیرانبیاء کرام میں بھی کچھ ہستیاں ازلاً منتخب ہوتی ہیں، جیسا کہ سیدہ ہاجرہ، سیدہ مریم، سیدین حسنین کریمین اور سیدینا مرتضٰی وزہرا علیہم السلام۔ راقم الحروف اوپرعرض کرچکا ہے کہ ازلی منتخب ہستیاں کسی قسم کی عبادت وریاضت سے قبل ہی انعام یافتہ ہوتی ہیں۔ اِس حقیقت کوسمجھنے کے لیے اُس حدیث میں غورفرمایئے جس میں ہے کہ حسنین کریمین نوجوانانِ اہل جنت کے سردار ہیں، حالانکہ پانچ چھ برس کی عمر کے بچے مکلّف ہی نہیں ہوتے۔ اسی طرح ان دونوں کے والدین بھی ازلی منتخب ہستیوں میں سے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کا سیدنا علی رضی اللہ عنہ کواُن کے بچپن میں ہی اپنی تربیت میں لے لینادرحقیقت انتخابِ الٰہی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نے دعوتِ ذوالعشیرۃ میں فرمایا کہ کون ہے جوکارہائے نبوت میں میراہاتھ بٹائے اور میراوزیر(بوجھ اُٹھانے والا) بنے تو اُس وقت پوری قوم میں سے جس نے کھڑے ہوکرعرض کیا تھا کہ اِس کام کے لیے میں ہوں، وہ دس سال کا بچہ علی ہی تھا۔ حدیث پاک میں بھی اس کوانتخابِ خداوندی فرمایا گیا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ سیدۃ نساء العالمین علیہا السلام کی زبان پرسیدنا علی علیہ السلام کی مسکینی کاشکوہ آیاتو آقا علیہ السلام نے اُنہیں فرمایا:

أَمَا تَرْضِيْنَ يَا فَاطِمَةُ ! أَنَّ اللّٰهَ اخْتَارَ مِنْ أَهْلِ الْأَرْضِ رَجُلَيْنِ أَحَدُهُمَا أَبُوْكِ وَالآخَرُ زَوْجُكِ.

"اے فاطمہ! کیا آپ اس پربات راضی نہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اہل زمین سے دوشخصوں

کو منتخب فرمایا ہے: اُن میں سے ایک آپ کا بابا ہے اور دوسرا آپ کا شوہر ہے"۔

(المعجم الكبير ج ١١ ص ٩٣، ٩٤ حديث ١٠٩٩٠، ١٠٩٩١)

حافظ ہیثمی لکھتے ہیں:

"یہ حدیث امام طبرانی نے ابراہیم بن حجاج از عبدالرزاق روایت کی ہے۔
ذہبی کہتے ہیں: یہ ابراہیم غیر معروف ہے اور اس کے باقی راوی صحیح حدیث کے راوی ہیں، اور امام طبرانی نے اس کو ایک اور ضعیف سند سے بھی روایت کیا ہے"۔

(مجمع الزوائد ج ٩ ص ١١٢، وط: ج ٩ ص ١٤٣، ١٤٤ حديث ١٤٦٥٩)

امام سیوطی نے اس حدیث کو خطیب بغدادی سے روایت کر کے کہا ہے کہ اس کی سند حسن ہے۔

(تاريخ بغداد ج ٤ ص ٤١٨؛ مسند فاطمة الزهراء للسيوطي ص ٦٣ حديث ١٥١)

اسی لیے بعض صحیح احادیث میں سیدنا علی علیہ السلام کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "صَفِيِّیْ" (اپنا منتخب) فرمایا ہے۔

(كتاب السنة لابن أبي عاصم ج ٢ ص ٨٩١ حديث ١٣٦٥؛ مسند البزار ج ٣ ص ١٠٦ حديث ٨٩١؛ مجمع الزوائد ٩ ص ١٥٦ حديث ١٤٩٣٥)

ازلی منتخب ہستیوں سے بھی لڑائی؟

تمام ازلی منتخب ہستیاں بے ضرر ہوتی ہیں لیکن اس کے باوجود لوگ اُن سے بھی پنگا لینے سے باز نہیں آتے۔ کبھی یہ پنگے بازی کفر اور اقتدار کو بچانے کے لیے ہوتی ہے اور کبھی دولت و اقتدار کو بچانے کے لیے۔ خلیل اللہ اور کلیم اللہ علیہما السلام کے ساتھ نمرود و فرعون کی لڑائی کفر و اقتدار دونوں کو بچانے کے لیے تھی۔

سیدنا علی علیہ السلام کے ساتھ اہل جمل کی لڑائی تو غلطی کی وجہ سے ہوئی اور اُن حضرات رضوان اللہ علیہم پر اُن کا غلط ہونا واضح بھی ہو گیا تھا اور وہ نادم بھی ہوئے تھے، لیکن دوسرے لوگوں نے کیوں لڑائی کی تھی؟ کیا وہ مولیٰ علی علیہ السلام سے کتاب و سنت کو زیادہ سمجھنے اور دین پر زیادہ چلنے والے تھے اور کیا وہ مولیٰ علی کو دین کی طرف لانے کے لیے برسرپیکار ہوئے تھے؟ اگر واقعی یہی بات تھی تو اُن کی لڑائی کو دینی سمجھا جا سکتا ہے اور اگر یہ بات نہیں تھی تو پھر اُنہوں نے کیوں لڑائی کی؟ انعام یافتہ ہستیوں کے اُسوہ پر چلنا مطلوبِ الٰہی ہے یا

اُن سے لڑنا؟ اگر کہا جائے کہ وہ قصاصِ عثمان کی خاطر لڑ رہے تھے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں مسلح لشکر لے کر کیوں آئے تھے؟ کیا سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ کے سامنے قصاصِ عثمان رضی اللہ عنہ کا مطالبہ رکھا گیا تھا؟ نہیں، کیونکہ اُن کا ہدف قصاص تھا ہی نہیں بلکہ اُن کا ہدف اقتدار تھا اور نعرۂ قصاص حصولِ اقتدار کا بہانہ تھا، جیسا کہ آئندہ صفحات میں اس سلسلے میں واضح تصریحات آئیں گی۔

نشۂ خمار اور نشۂ اقتدار

اقتدار کی لذت اور چسکا انسان میں اس حد تک سرایت کر جاتا ہے کہ انسان اقتدار کا بھی نشہ کی حد تک عادی بن جاتا ہے، الا ماشاء اللہ، اور جس طرح نشہ کا عادی شخص جسمانی صلاحیتوں کے نقصانات کو سمجھنے کے باوجود عمداً نشہ کو ترک نہیں کرتا اسی طرح اقتدار کے نشہ کا عادی شخص بھی دین وایمان کے نقصانات کو سمجھنے کے باوجود عمداً اقتدار کو ترک نہیں کرتا۔ اِس کی ایک مثال اُس طویل حدیث میں موجود ہے جس میں ہرقل کا واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ اُس نے نبوتِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حقانیت پر مبنی اُن تمام دلائل کا احاطہ کر لیا تھا جو اُسے مطلوب تھے اور اُس نے کامل یقین کے ساتھ کہا تھا:

سَيَمْلِكُ مَوْضَعَ قَدَمَيَّ هَاتَيْنِ.

''عنقریب وہ نبی میری اس جگہ کا بھی مالک ہوگا''۔

حتیٰ کہ اُس نے یوں اظہارِ عقیدت بھی کیا تھا:

وَلَوْ كُنْتُ عِنْدَهُ لَغَسَلْتُ عَنْ قَدَمَيْهِ.

''اگر میں اُن کے قریب ہوتا تو ضرور اُن کے قدم مبارک دھوتا''۔

پھر اُس نے وہ خط طلب کیا جو اُس کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے آیا تھا، وہ اُس نے سنا، پھر اپنی کابینہ کے اراکین کو اپنے ایوان میں طلب کیا اور ایوان کے دروازوں کو بند کرنے کا حکم کیا، پھر کچھ دیر بعد اراکین کے سامنے آیا اور اُن سے یوں مخاطب ہوا:

يَا مَعْشَرَ الرُّوْمِ! هَلْ لَكُمْ فِي الْفَلَاحِ وَالرُّشْدِ، وَأَنْ يَثْبُتَ مُلْكُكُمْ، فَتُبَايِعُوْا هٰذَا النَّبِيَّ؟ فَحَاصُوْا حَيْصَةَ حُمُرِ الْوَحْشِ إِلَى الْأَبْوَابِ،

فَوَجَدُوْهَا قَدْ غُلِّقَتْ ، فَلَمَّارَأٰى هِرَقْلُ نَفْرَتَهُمْ وَأَيِسَ مِنَ الإِيْمَانِ ، قَالَ: رُدُّوْهُمْ عَلَيَّ، وَقَالَ: إِنِّيْ قُلْتُ مَقَالَتِيْ آنِفًا أَخْتَبِرُ بِهَا شِدَّتَكُمْ عَلٰى دِيْنِكُمْ ، فَقَدْ رَأَيْتُ . فَسَجَدُوْا لَهٗ وَرَضُوْا عَنْهُ.

''رومیو! دائمی کامیابی اور ہدایت کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے، وہ یہ کہ تمہارا ملک بھی باقی رہے اور تم اِس نبی کی پیروی بھی کرلو؟ یہ سنتے ہی اُن تمام اراکین نے جنگلی گدھوں کی طرح دروازوں کی طرف دوڑ لگادی تو اُنہیں بند پایا۔ پس جب ہرقل نے اُن کی یہ نفرت دیکھی اور ایمان سے مایوس ہوا تو کہا: ان اراکین کو میرے پاس لوٹا دو، اور کہا: میں نے ابھی ابھی جو کچھ کہا تھا اُس سے میں تمہاری دینی پختگی کو آزمار ہا تھا تو وہ میں نے دیکھ لی۔ یہ سنتے ہی وہ تمام لوگ اُس کے سامنے سربسجود ہو گئے اور اُس پر خوش ہو گئے''۔

(بخاري ص ٦، ٧ حديث ٧)

اکثر جزوی یا کلی منصب واقتدار ہی قبولِ حق کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے۔ کبھی غور فرمایئے کہ معروف مقرر، نامور مفتی، مشہور پیر اور منصب پر فائز انسان حق کی حمایت وتائید سے گریزاں کیوں ہوتا ہے؟ علیٰ ھٰذا القیاس بین الاقوامی تناظر میں مسلم ممالک کے باہمی اتحاد کی راہ میں بھی منصب وکرسی رکاوٹ ہے۔ فی الجملہ یہ کہ جس طرح سیدنا محمد ﷺ کو دل میں نبی برحق یقین کرنے کے باوجود کھلم کھلا آپ کی نبوت کے اعتراف میں اقتدار مانع ہو گیا تھا اسی طرح نفسِ رسول، صفیِ نبی اور ''عَلِيٌّ مِنِّيْ وَأَنَامِنْهُ'' کی شان والے خلیفۂ برحق کی خلافت وطاعت کو ماننے میں بھی جزوی اقتدار مانع ہوا تھا۔ کیوں اور کیسے؟ اس کو سمجھنے کے لیے آپ کو ذرا ماضی میں جھانکنا ہوگا: خلافتِ مرتضوی کا منکر مؤلفۃ القلوب سے تھا اور اُس کا شمار مؤلفۃ القلوب کی اُس فیملی سے تھا جسے ایک ہی جنگ میں یکجا تین سو اونٹ اور ڈھیروں سونا چاندی مل گیا تھا۔ ایک ''صُعْلُوْکٌ'' (نادار) شخص کا اپنے سامنے اس قدر مالی فراوانی کو دیکھنا معمولی بات نہیں تھی، لہٰذا خود سوچیے کہ اگر اُسی ''صُعْلُوْکٌ'' شخص کو اُسی دین کے جزوی یا کلی اقتدار تک پہنچنے میں کامیابی مل جائے اور وہ مسلسل کئی برس

تک اُس جزوی اقتدار کے مزے لوٹتا رہے، پھر اُسے کوئی خلیفۂ برحق معزولی کا حکم نامہ بھیجے تو کیا وہ اُس نشۂ اقتدار کو ترک کرنے پر تیار ہوگا؟ ہرگز نہیں، یہی وجہ ہے کہ مغیرہ بن شعبہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا تھا کہ اگر آپ معاویہ کو اُس کے منصب پر رہنے دیں گے تو آپ کا معاملہ مستحکم رہے گا، ورنہ وہ مزاحمت کرے گا۔ یہ بات باحوالہ آگے آئے گی۔

طلقاء کے متعلق الفاظ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پورا ہونا

دراصل ایسے طلقاء اور مؤلفۃ القلوب لوگوں کے بارے میں وہ الفاظ تقدیر بن گئے تھے جو اُس وقت زبانِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے صادر ہوئے تھے جب آپ نے اُنہیں مال دیا تھا۔ آپ نے قدیم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو فرمایا تھا کہ تمہیں میں نے تمہارے اسلام کے سپرد کیا ہے اور انہیں دنیا کے سپرد کیا ہے۔ عنقریب یہ الفاظ باحوالہ آرہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا اُن لوگوں کا اوڑھنا بچھونا بن گئی تھی۔ چنانچہ سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے میدانِ صفّین میں فرمایا تھا کہ قصاص عثمان رضی اللہ عنہ ان کا بہانہ ہے اور اصل بات اقتدار کو بچانا ہے۔

(البداية والنهاية (قطر) ج۷ ص ۴۵۵، وط: بتحقيق عبدالمحسن التركي ج۱۰ ص ۵۲۷)

اندر کی یہی بات خود معاویہ کی زبان سے بھی اُس وقت نکل گئی تھی جب عمرو بن العاص نے اُسے کہا تھا کہ علی تمہیں بلا رہا ہے کہ آؤ! میں اور تم ایک ایک ہاتھ کر لیتے ہیں تا کہ میرے اور تیرے درمیان اہل اسلام تو ہلاک نہ ہوں۔ اِس پر معاویہ نے کہا تھا:

وَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتَ أَنَّ عَلِيًّا لَمْ يُقْهَرْ قَطُّ ، وَإِنَّمَا أَرَدْتَ قَتْلِي لِتُصِيبَ الْخِلَافَةَ مِنْ بَعْدِي ، اِذْهَبْ إِلَيْهِ فَلَيْسَ مِثْلِي يُخْدَعُ.

"اللہ کی قسم تو خوب جانتا ہے کہ علی کبھی مغلوب نہیں ہوا، اور تو تو فقط میرا قتل چاہتا ہے تا کہ میرے بعد حکومت تجھے مل جائے، جا تو ہی اس کی طرف جا! مجھ ایسے شخص کو دھوکہ نہیں دیا جا سکتا"۔

(البداية والنهاية ج۷ ص ۴۵۱، وط: ج۵ ص ۳۶۳ وط: ج۱۰ ص ۵۱۸)

ایک اور مقام میں ہے کہ معاویہ نے عمرو بن العاص کو کہا:

إِنَّکَ لَتَعْلَمُ أَنَّهُ لَمْ يُبَارِزْهُ رَجُلٌ قَطُّ إِلَّا قَتَلَهُ ، وَلٰكِنَّكَ طَمِعْتَ فِيهَا بَعْدِيْ.

''تم خوب جانتے ہو کہ اُنہیں جس شخص نے بھی للکارا تو اُنہوں نے اُسے قتل کر دیا، لیکن تم میرے بعد حکومت کی امید رکھتے ہو''۔

(البداية والنهاية بتحقيق التركي ج١٠ ص٥٤١)

ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بھی اُن کے اقتدار کو دنیوی اقتدار قرار دیا تھا، بلکہ اِس سے بھی سخت ترین بات کر دی تھی۔

(سير أعلام النبلاء ج٣ ص١٤٣)

سیدنا فضیل بن عیاض ﷺ نے بھی معاویہ کو حب دنیا میں مبتلا قرار دیا تھا۔

(البداية والنهاية ج٨ ص٢٠٣)

یہی وجہ ہے کہ اُن کے دور میں دنیوی فتوحات، چمک دمک اور ظاہری تمکنت تو تھی لیکن باطنی اور دینی تمکنت مفقود تھی۔ چنانچہ مولانا محمد قاسم نانوتوی لکھتے ہیں:

''ہر چند کہ اُن کو بظاہر تمکین میسر آئی، لیکن حقیقت میں وہ تمکینِ دین نہ تھی، تمکینِ مُلک وسلطنت تھی''۔

(هدية الشيعة ص٦٦)

شاید بعض لوگ اِن حقائق کو غیر معتبر، تاریخی روایات یا عام اقوال کہہ کر مسترد کرنے کی کوشش کریں یا یہ کہنا شروع کر دیں کہ صحابہ کا دنیا سے کیا کام؟ ایسے لوگوں کو چاہیۓ کہ وہ قرآنی الفاظ ﴿مِنْكُمْ مَنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ﴾ کے ساتھ ساتھ درجِ ذیل نبوی پیش گوئی کو بھی ضرور مدنظر رکھیں۔

امام بخاری لکھتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے بیان فرمایا:

وَإِنِّيْ وَاللّٰهِ مَا أَخَافُ عَلَيْكُمْ أَنْ تُشْرِكُوْا بَعْدِيْ ، وَلٰكِنْ أَخَافُ عَلَيْكُمُ الدُّنْيَا أَنْ تَنَافَسُوْا فِيهَا.

''اللہ کی قسم! مجھے تم پر یہ خوف نہیں کہ تم میرے بعد شرک کروگے، لیکن میں تم پر دنیا کا خوف کرتا ہوں کہ تم اُس میں مبتلا ہو جاؤ گے''۔

(بخاري ص ١٨٠ حديث ١٣٤٤)

مسلم شریف میں یہ حدیث بایں الفاظ آئی ہے:

وَلٰكِنِّيْ أَخْشىٰ عَلَيْكُمُ الدُّنْيَا أَنْ تَتَنَافَسُوْا فِيْهَا وَتَقْتَتِلُوْا فَتَهْلِكُوْا، كَمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ.

''لیکن مجھے تم پر دنیا کا خدشہ ہے کہ تم اس کے لالچ میں مبتلا ہو کر ایک دوسرے سے لڑنے لگو تو ہلاک ہو جاؤ، جیسا کہ تم سے پہلے لوگ ہلاک ہوئے''۔

(صحيح مسلم: كتاب الفضائل، باب إثبات حوض نبيناﷺ وصفاته، ص١٠١٦ حديث ٢٢٩٦)

یہ حدیث بخاری شریف میں تقریباً چھ مقامات پر آئی ہے، اُن میں سے بعض مقامات کی تشریح میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے فرمایا ہے کہ اِس حدیث میں جن جن باتوں کے واقع ہونے کی نبی کریم ﷺ نے خبر دی وہ واقع ہو کر رہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

وَأَنَّ أَصْحَابَهُ لَايُشْرِكُوْنَ بَعْدَهُ فَكَانَ كَذٰلِكَ ، وَوَقَعَ مَا أَنْذَرَ بِهٖ مِنَ التَّنَافُسِ فِي الدُّنْيَا.

''اور آپ ﷺ (نے خبر دی کہ آپ) کے اصحاب آپ کے بعد شرک نہیں کریں گے تو ایسا ہی ہوا، اور دنیا میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے متعلق جو اُنہیں ڈرایا تھا وہ بھی واقع ہو کر رہا''۔

(فتح الباري: كتاب المناقب ج٨ص٢٧٧ حديث ٣٥٩٦؛ البحر المحيط الثاج شرح صحيح مسلم لابن الحجاج، ج٣٧ص٤٧)

علامہ ابو العباس قرطبی لکھتے ہیں:

هٰذَا الَّذِيْ تَوَقَّعَهُ النَّبِيُّ ﷺ هُوَ الَّذِيْ وَقَعَ بَعْدَهُ ، فَعَمَّتِ الْفِتَنُ ، وَعَظُمَتِ الْمِحَنُ ، وَلَمْ يَنْجُ مِنْهَا إِلَّا مَنْ عُصِمَ ، وَلَا يَزَالُ الْهَرْجُ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ.

''یہ خدشہ جس کی نبی کریم ﷺ نے توقع فرمائی تھی وہ آپ کے بعد ہو کر رہا، پس فتنے عام ہو گئے، تکالیف بڑھ گئیں اور اُن فتنوں اور تکلیفوں سے نجات اُس نے پائی جسے محفوظ رکھا گیا اور وہ فساد قیامت تک باقی رہے گا''۔

(المفهم لأبي العباس القرطبي ج٦ ص ٩٤)

جب اِس قتل وقتال کا سبب فقط مالِ دنیا کو قرار دیا گیا ہے تو ذرا غور کر کے بتلایئے کہ وہ کون سے صحابہ تھے جو دنیا کی خاطر لڑے؟ اگر مالِ دنیا اور اقتدار کی خاطر ازلی انعام یافتہ ہستیوں سے لڑنے والوں سے مراد وہ لوگ نہ ہوں جنہوں نے جنگوں کے ذریعے اقتدار حاصل کیا اور پھر جاتے جاتے وہی اقتدار اپنی اولاد و قوم کے سپرد کر گئے تو پھر تلاش کر کے بتایئے کہ دوسرے کون سے صحابہ مراد ہیں؟

بعد از وصالِ نبوی ﷺ دنیا کی خاطر لڑنے والوں کو اہلِ تحقیق محدثین نے صحابہ تو تسلیم کیا ہے لیکن اُن کا تعین نہیں کیا۔ آیئے! اس سلسلے میں احادیثِ صحیحہ اور حسنہ میں جو کچھ اشارات ملتے ہیں اُن میں غور وفکر کر لیتے ہیں۔ کتب احادیث وسیرت کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں میں طلقاء سرفہرست ہیں جن کی تعداد تقریباً دو ہزار کے لگ بھگ تھی، اُن میں سے کچھ لوگ زیادہ مضر اور جنگ جو تھے، اُن کے دلوں کو نرم کرنے کے لیے اُنہیں مال دیا گیا، اُنہیں طلقاء کے علاوہ مؤلفة القلوب بھی کہا جاتا ہے۔ ایسے لوگوں میں ابوسفیان اور اُن کی فیملی کے نام سرفہرست آتے ہیں۔ چنانچہ سیرت نگار حضرات غزوۂ حنین کے ذکر میں لکھتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ نے مؤلفة القلوب کو عطا کیا، وہ لوگوں میں سے سرغنہ قسم کے لوگ تھے، آپ نے اُنہیں اس لیے عطا کیا تا کہ اُن کے اور اُن کے رشتہ داروں کے دل مائل ہوں، پس آپ نے ابوسفیان بن حرب کو سو اونٹ دیے اور اُن کے بیٹے معاویہ

کو بھی سو اونٹ دیئے"۔

(السيرة النبوية لابن إسحاق ص ٥٨٤؛ السيرة النبوية لابن هشام ج ٤ ص ١٣٢؛ دلائل النبوة للبيهقي ج ٥ ص ١٨٢؛ الروض الأنف للسهيلي ج ٤ ص ٢٧٠؛ البداية والنهاية، دار المعارف ج ٤ ص ٣٥٩؛ سبل الهدى للصالحي ج ٤ ص ٤٠٠)

اِس سلسلے میں تفصیلی بحث تو ہم اپنی کتاب "**الصحابة و الطلقاء**" میں کریں گے، یہاں صریح الفاظِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اتنا جان لیجئے کہ اِن لوگوں کو اس قدر مال کیوں دیا گیا، اور یہ کہ جن سابقین کو اُس موقع پر مال نہ دیا گیا تو اُنہیں مال کی بجائے کیا دیا گیا؟ سو جاننا چاہیئے کہ انصار رضی اللہ عنہم کو اس موقع پر دنیوی مال میں سے کچھ بھی نہیں دیا گیا تھا تو اُن میں سے بعض حضرات کو رنج ہوا تھا۔ آقا علیہ السلام نے اُنہیں تسلی دیتے ہوئے فرمایا تھا:

إِنِّي لَأُعْطِي رِجَالًا حَدِيثٌ عَهْدُهُمْ بِكُفْرٍ، أَمَا تَرْضَوْنَ أَنْ يَّذْهَبَ النَّاسُ بِالْأَمْوَالِ وَتَرْجِعُوا إِلىٰ رِحَالِكُمْ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ ؟ فَوَاللّٰهِ مَا تَنْقَلِبُوْنَ بِهٖ خَيْرٌ مِمَّا يَنْقَلِبُوْنَ بِهٖ. قَالُوْا: بَلىٰ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَدْ رَضِيْنَا.

"میں نے کچھ ایسے لوگوں کو عطا کیا ہے جن کا زمانہ کفر کے قریب ہے، کیا تم اِس بات پر خوش نہیں ہو کہ لوگ مال لے جائیں اور تم اپنے گھروں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لے جاؤ؟ اللہ کی قسم! جو چیز تم لے کر جاؤ گے وہ اُس سے بہتر ہے جس کو وہ لے کر جائیں گے۔ اُنہوں نے عرض کیا: کیوں نہیں یا رسول اللہ! ہم یقیناً راضی ہیں"۔

(صحيح بخاري ص ٤٢٦ حديث ٣١٤٧؛ مسلم ص ٤٢٦ حديث ٢٤٣٦)

یہ حدیث متعدد الفاظ کے ساتھ آئی ہے۔ بعض مقامات پر الفاظ ہیں:

أَلَا تَرْضَوْنَ أَنْ يَّذْهَبَ النَّاسُ بِالدُّنْيَا وَتَذْهَبُوْنَ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ۔ تَحُوْزُوْنَهٗ إِلىٰ بُيُوْتِكُمْ.

"کیا تم اِس بات پر خوش نہیں ہو کہ لوگ دنیا لے جائیں اور تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کو اپنے گھروں کی طرف لے جاؤ، آپ کو ہمیشہ کے لیے اپنا لو؟''۔

(بخاري ص ٥٨٩ حديث ٤٣٣٧؛ مسلم ص ٤٢٧ حديث ٢٤٤١)

''حَازَ يَحُوْزُ حَوْزًا'' کا معنیٰ ہے اکٹھا کرنا جمع کرنا۔ اس سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ لوگ جس دنیا کو لے کر جا رہے ہیں اُسے کوئی بقا نہیں اور تم جس چیز کو اپنا رہے ہو وہ ہمیشہ رہے گی۔

اسی حقیقت کو بایں الفاظ بھی بیان فرمایا گیا ہے:

يَا مَعْشَرَ الْأَنْصَارِ! فِيْ لُعَاعَةٍ مِنَ الدُّنْيَا تَأَلَّفْتُ بِهَا قَوْمًا لِيُسْلِمُوْا وَوَكَلْتُكُمْ إِلٰى إِسْلَامِكُمْ، أَفَلَا تَرْضَوْنَ يَا مَعْشَرَ الْأَنْصَارِ أَنْ يَذْهَبَ النَّاسُ بِالشَّاةِ وَالْبَعِيْرِ وَتَرْجِعُوْنَ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فِيْ رِحَالِكُمْ.

''اے جماعتِ انصار! دنیا کی قلیل العمر چیز سے میں نے قوم کے دل لبھانے کی کوشش کی ہے اور تمہیں تمہارے اسلام کے سپرد کر دیا ہے، اے جماعتِ انصار! کیا تم اس بات راضی نہیں ہو کہ لوگ بکریاں اور اونٹ لے جائیں اور تم رسول اللہ ﷺ کو (سینوں میں) ساتھ لے کر اپنے گھروں کو لوٹو؟''۔

(مسند أحمد [بتحقيق أحمد شاكر] ج ١٠ ص ٢٤٠، ٢٤١ حديث ١١٦٧٠)

''لُعَاعَةٌ'' کا معنیٰ ہے وہ معمولی سا اُگنے والا سبزہ جو اُگ کر فوراً ختم ہو جاتا ہے، اسی سے ایک عربی مقولہ ہے:

''إِنَّمَا الدُّنْيَا لُعَاعَةٌ، یعنی دنیا ابتدائی روئیدگی کے مانند ہے جس کے لیے بقا نہیں''۔

(مصباح اللغات ص ٧٧٩)

حدیث پاک کے مذکور الصدر متعدد الفاظ میں غور فرمایئے کہ آقا علیہ السلام نے کس قدر واضح الفاظ میں فرما دیا ہے کہ کچھ لوگ مالِ دنیا، بکریاں اور اونٹ لے گئے اور کچھ اللہ جل جلالہ کے رسول ﷺ کو لے گئے، کچھ لوگوں کو مالِ دنیا کے سپرد کر دیا اور کچھ لوگوں کو اُن کے اسلام کے سپرد کر دیا۔ جن لوگوں کو دنیا کے سپرد کیا گیا اُنہوں نے بعد میں فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا تو اُس میں بھی اُن کا مطمحِ نظر مال و زر ہی تھا۔ عرب جنگ جو

اور بہادر تو وہ پہلے سے ہی تھے لیکن اب اُنہوں نے اُس بہادری کا رُخ فتوحاتِ اسلام کی طرف موڑ دیا تھا۔ یعنی شجاعت وطاقت کا مصرف بدل گیا تھا۔ شاید فاضل دیوبند مولانا سعید احمد اکبر آبادی باین الفاظ یہی حقیقت سمجھانا چاہتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''آپ (معاویہ) کو خلفاء اربعہ کی طرح آنحضرت ﷺ کی خدمتِ اقدس میں رہنے اور براہِ راست آفتابِ نبوت ورسالت سے کسبِ فیض کرنے کا زیادہ موقع نہیں ملا، اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش کے ایک معزز اور نامور خاندان سے تعلق رکھنے کے باعث آپ میں جو عمدہ صفات تھیں، مثلاً سیاسی تدبر، استقامت واستقلال اور شہامت وشجاعت اسلام قبول کرنے کے بعد اُن پر اور جلا ہوگئی اور اُن قوتوں کا مَصرف بدل گیا''۔

(مسلمانوں کا عروج وزوال: ص ۴۵)

خلاصہ یہ ہے کہ جن لوگوں کے نصیب میں رسول اللہ ﷺ آئے وہ آخر دم تک اسلام پر مرمٹتے رہے اور جن لوگوں کے نصیب میں دنیا آئی وہ دنیا پر مرمٹتے رہے اور اسلام اور اہل بیت کرام علیہم السلام کو مٹانے کی کوشش کرتے رہے۔ گویا اُن کے بارے میں صادر شدہ الفاظِ نبوی ﷺ اُن کا مقدر بن گئے اور وہ ایک لمحہ کے لیے بھی دنیا سے پیچھا نہ چھڑا سکے، حتیٰ کہ اُنہیں یہ سعادت بھی حاصل نہ ہوسکی کہ خلفاء راشدین ؓ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے بوقتِ وفات تو دنیا سے جان چھڑا لیتے۔ نہیں بلکہ وہ آخر تک دنیوی اقتدار سے نجات نہ پاسکے اور اُسے اپنی اولاد کو منتقل کر گئے۔ اِس سے آپ اندازہ لگائیں کہ انصار ؓ اور طلقاء کے بارے میں زبانِ نبوی ﷺ سے صادر شدہ الفاظ کس حد تک پورے ثابت ہوئے؟

حُبِّ اقتدار پھر اجتہاد؟

یہاں ضمناً ایک نکتہ ذہن میں آگیا ہے جسے پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں:

جب علمی، نقلی، اور مشاہداتی حقیقت یہ ہے کہ وہ سب کچھ حصولِ دنیا کے لیے کرتے رہے تو پھر دنیا کی خاطر ازلی انعام یافتہ ہستیوں کے خلاف اٹھنے والے قدم کو اجتہاد قرار دینا کہاں کی دانش مندی ہے؟ اگر اُن کی ساری تگ ودو دنیا کی خاطر نہیں تھی تو پھر علی وحسن کے خلاف اُٹھنے والے قدم کو دینی تو تب کہا جاسکتا ہے

جب کوئی شخص اُن سے زیادہ دین کا عالم اور دین پر عامل ہو۔ جن ہستیوں سے ہر طرح کے رجس کو دور رکھا گیا، جنہیں شیطان سے یکسر محفوظ فرمایا گیا اور جن سے تمسک کو قرآن مجید سے تمسک کے ساتھ بیان فرمایا گیا اور اُس تمسک میں ہدایت کی حتمی ضمانت دی گئی، انصاف سے بتلایئے! اگر کوئی طلیق، مؤلفۃ القلوب اور طالبِ دنیا اُن کے خلاف قدم اُٹھائے تو وہ کتاب وسنت سے انحراف ہوگا یا اجتہاد؟ شاید کسی کو میری یہ بات ناجائز جرأت اور گستاخی محسوس ہو رہی ہو تو میں اُس کے سامنے ایک آدھ عبارت پیش کر دیتا ہوں۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے معاویہ کی پوری تگ ودو کو دنیوی کہا ہے اور اُنہیں باغی، طاغی، محرّف، ظاہراً کچھ اور، باطناً کچھ اور، قبیح مؤوّل اور کتاب وسنت کا تارک کہا ہے۔ راقم الحروف نے اپنی کتاب ''الفئة الباغية'' کے لیے ملا علی کی وہ مکمل عبارت مع ترجمہ واعراب ایک مقام پر تیار رکھی ہوئی ہے، اُسی مقام سے یہاں بھی نقل کیے دیتا ہوں۔ یاد رکھئے کہ ملا علی قاری نے اپنی مختلف کتب میں اِس حدیث پر کلام کیا ہے لیکن اُنہوں نے مرقاۃ میں جو کلام کیا ہے وہ جامع بھی ہے اور مانع بھی۔ وہ لکھتے ہیں:

(تَقْتُلُکَ الْفِئَةُ الْبَاغِيَةُ) أَيِ الْجَمَاعَةُ الْخَارِجَةُ عَلٰى إِمَامِ الْوَقْتِ وَخَلِيْفَةِ الزَّمَانِ، قَالَ الطِّيْبِيُّ: تَرَحَّمَ عَلَيْهِ بِسَبَبِ الشِّدَّةِ الَّتِي يَقَعُ فِيْهَا عَمَّارٌ مِنْ قِبَلِ الْفِئَةِ الْبَاغِيَةِ يُرِيْدُ بِهٖ مُعَاوِيَةَ وَقَوْمَهٗ فَإِنَّهٗ قُتِلَ يَوْمَ صِفِّيْنَ ، وَقَالَ ابْنُ الْمَلِکِ: اِعْلَمْ أَنَّ عَمَّارًا قَتَلَهٗ مُعَاوِيَةُ وَفِئَتُهٗ فَكَانُوْا طَاغِيْنَ بَاغِيْنَ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ ،لِأَنَّ عَمَّارًا كَانَ فِيْ عَسْكَرِ عَلِيٍّ وَهُوَ الْمُسْتَحِقُّ لِلْإِمَامَةِ فَامْتَنَعُوْا عَنْ بَيْعَتِهٖ. وَحُكِيَ أَنَّ مُعَاوِيَةَ يُؤَوِّلُ مَعْنَى الْحَدِيْثِ وَيَقُوْلُ: ''نَحْنُ فِئَةٌ بَاغِيَةٌ طَالِبَةٌ لِدَمِ عُثْمَانَ'' وَهٰذَا كَمَا تَرٰى تَحْرِيْفٌ ،إِذْ مَعْنٰى طَلَبِ الدَّمِ غَيْرُ مُنَاسِبٍ هِنَا، لِأَنَّهٗ ﷺ ذَكَرَ الْحَدِيْثَ فِيْ إِظْهَارِ فَضِيْلَةِ عَمَّارٍ وَذَمِّ قَاتِلِهٖ ، لِأَنَّهٗ جَاءَ فِيْ طَرِيْقٍ وَيْحَ. قُلْتُ: ''وَيْحَ'' كَلِمَةٌ تُقَالُ لِمَنْ وَقَعَ فِيْ هَلَكَةٍ لَايَسْتَحِقُّهَا فَيُتَرَحَّمُ عَلَيْهِ وَيُرْثٰى لَهٗ بِخِلَافِ ''وَيْلَ'' فَإِنَّهَا كَلِمَةُ عُقُوْبَةٍ تُقَالُ لِلَّذِيْ يَسْتَحِقُّهَا وَلَايُتَرَحَّمُ عَلَيْهِ ، هٰذَا وَفِي الْجَامِعِ الصَّغِيْرِ بِرِوَايَةِ الْإِمَامِ

أحمد والبخاري عن أبي سعيد مرفوعًا "ويح عمار تقتله الفئة الباغية يدعوهم إلى الجنة ويدعونه إلى النار" وهذا كالنص الصريح في معنى الصحيح المتبادر من البغي المطلق في الكتاب، كما في قوله تعالىٰ: ﴿وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْيِ﴾ [النحل: ٩٠] وقوله سبحانه ﴿فَإِن بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ﴾ [الحجرات: ٩] فإطلاق اللفظ الشرعي علىٰ إرادة المعنى اللغوي عدول عن العدل وميل إلى الظلم الذي هو وضع الشيء في غير موضعه. والحاصل أن البغي بحسب المعنى الشرعي والإطلاق العرفي خص من عموم معنى الطلب اللغوي إلىٰ طلب الشر الخاص بالخروج المنهي، فلا يصح أن يراد به طلب دم خليفة الزمان وهو عثمان رضي الله عنه.

وقد حكي عن معاوية تأويل أقبح من هذا حيث قال: إنما قتله علي وفئته حيث حمله على القتال وصار سببًا لقتله في المآل، فقيل له في الجواب: فإذن قاتل حمزة هو النبي ﷺ حيث كان باعثًا له علىٰ ذلك والله سبحانه وتعالىٰ حيث أمر المؤمنين بقتال المشركين. والحاصل أن هذا الحديث فيه معجزات ثلاث، إحداها أنه سيقتل، وثانيها أنه مظلوم، وثالثها أن قاتله باغ من البغاة والكل صدق وحق. ثم رأيت الشيخ أكمل الدين قال: الظاهر أن هذا أي التأويل السابق عن معاوية. وما حكي عنه أيضًا من أنه قتله من أخرجه للقتل وحرضه عليه كل منهما افتراء عليه، أما الأول فتحريف للحديث، وأما الثاني فلأنه ما أخرجه أحد بل هو خرج بنفسه وماله مجاهدًا في سبيل الله قاصدًا لإقامة الفرض، وإنما كان كل منهما افتراء علىٰ معاوية، لأنه رضي الله عنه أعقل من أن يقع في شيء ظاهر الفساد

عَلَى الْخَاصِ وَالْعَامِ . قُلْتُ : فَإِذَا كَانَ الْوَاجِبُ عَلَيْهِ أَنْ يَّرْجِعَ عَنْ بَغْيِهٖ بِإِطَاعَتِهِ الْخَلِيْفَةِ وَيَتْرُكُ الْمُخَالَفَةَ وَطَلَبَ الْخِلَافَةِ الْمُنِيْفَةِ ، فَتَبَيَّنَ بِهٰذَا أَنَّهُ كَانَ فِي الْبَاطِنِ بَاغِيًا ، وَفِي الظَّاهِرِ مُتَسْتِرًا بِدَمِ عُثْمَانَ مُرَاعِيًا مُرَائِيًا ، فَجَاءَ هٰذَا الْحَدِيْثُ عَلَيْهِ نَاعِيًا ، وَعَنْ عَمَلِهٖ نَاهِيًا ، لٰكِنْ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتَابِ مَسْطُوْرًا ، فَصَارَ عِنْدَهُ كُلُّ مَنْ فِي الْقُرْآنِ وَالْحَدِيْثِ مَهْجُوْرًا . فَرَحِمَ اللّٰهُ مَنْ أَنْصَفَ وَلَمْ يَتَعَصَّبْ وَلَمْ يَتَعَسَّفْ ، وَتَوَلَّى الْاِقْتِصَادَ فِي الْاِعْتِقَادِ ، لِئَلَّا يَقَعَ فِيْ جَانِبَيْ سَبِيْلِ الرَّشَادِ مِنَ الرِّفْضِ وَالنَّصَبِ بِأَنْ يُّحِبَّ جَمِيْعَ الْآلِ وَالصَّحَبِ.

"تَقْتُلُكَ الْفِئَةُ الْبَاغِيَةُ" (تجھے باغی گروہ قتل کرے گا) اس سے وہ خارجی جماعت مراد ہے جس نے امام وقت اور خلیفۂ زمان کے خلاف خروج کیا تھا۔ امام طیبی فرماتے ہیں: نبی کریم ﷺ نے سیدنا عمارؓ کے حق میں کلمۂ رحم اس لیے ارشاد فرمایا کہ وہ باغی گروہ کی جانب سے سختی میں مبتلا ہونے والے تھے، اس سے آپ ﷺ نے معاویہ اور اُن کی جماعت مراد لی ہے، کیونکہ وہ صفین کی جنگ میں قتل کیے گئے تھے۔ محدث ابن الملک فرماتے ہیں: جان لیجئے کہ عمار بن یاسرؓ کو معاویہ اور اُن کے گروہ نے قتل کیا تھا، لہٰذا اس حدیث کی رو سے وہ باغی اور طاغی قرار پائے، کیونکہ عمارؓ لشکر مرتضوی میں تھے اور سیدنا علی علیہ السلام ہی خلافت کے حق دار تھے جبکہ اُن لوگوں نے اُن کی بیعت سے روگردانی کی تھی۔

منقول ہے کہ معاویہ نے اس حدیث کے معنیٰ میں تاویل کی تھی اور کہا تھا: "ہم فئۃ باغیۃ قصاصِ عثمان کے طالبین کے معنیٰ میں ہیں" اور یہ جیسا کہ تم جانتے ہو تحریف ہے، کیونکہ اس مقام پر "بَغي" بمعنیٰ "طلب کرنا" کوئی مناسبت نہیں رکھتا، اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ حدیث سیدنا عمارؓ کی فضیلت اور اُن کے قاتل کی مذمت میں ذکر فرمائی

ہے۔اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ حدیث لفظ ”ویح“ سے آئی ہے۔میں (ملا علی قاری) کہتا ہوں: لفظ ”ویح“ اُس شخص کے بارے میں استعمال کیا جاتا ہے جو کسی مصیبت کا شکار ہونے والا ہو لیکن بے گناہ ہو تو اس پر رحم کھاتے اور افسوس کرتے ہوئے یہ لفظ بولا جاتا ہے، بخلاف لفظ ”ویل“ کے، کہ وہ اظہارِ سختی کے لیے اُس شخص کے بارے میں بولا جاتا ہے جو سختی کا سزاوار ہو اور قابلِ رحم نہ ہو۔اس لغوی تائید کے علاوہ اس سلسلے میں ”الجامع الصغیر“ میں بروایت امام احمد و بخاری سیدنا ابوسعید خدریؓ سے مرفوعاً ایک حدیث میں آیا ہے: ”عمار پر رحمت ہو اُسے ایک باغی گروہ قتل کرے گا، یہ اُنہیں جنت کی طرف بلائے گا اور وہ اُسے جہنم کی طرف بلائیں گے“۔اور یہ حدیث معنیٰ کی صحت میں نص صریح کی مانند ہے، ایسا صریح معنی جو بغاوتِ مطلق کے لیے بلا تکلف ذہنوں میں آتا ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وہ بے حیائی، برائی اور بغاوت سے منع کرتا ہے﴾ اور ارشاد الٰہی: ﴿پس اگر اُن میں سے ایک گروہ دوسرے پر بغاوت کرے﴾ پس لفظِ شرعی کا اطلاق اپنے مطلب کے معنی کی طرف پھیرنا عدل سے روگردانی اور ظلم کی طرف میلان ہے۔ظلم یہ ہے کہ کسی چیز کو اُس کے مقام پر نہ رکھنا۔حاصل کلام یہ ہے کہ لفظ بَغی اپنے شرعی معنی اور عرفی اطلاق کے لحاظ سے اُس لغوی معنی سے عام ہے جو طلب کے معنیٰ میں خصوصاً اُس شر کے حصول کے لیے کیا گیا جو ممنوع ہے۔لہٰذا اس کو خلیفۂ زمان سیدنا عثمانؓ کے قصاص کے مطالبہ کا معنیٰ پہنانا درست نہیں۔

معاویہ سے اس سے زیادہ قبیح تاویل بھی منقول ہے، وہ یہ کہ اُنہوں نے کہا: عمار کو علی اور اُن کے گروہ نے قتل کیا، اس لحاظ سے کہ اُنہوں نے اُسے جنگ پر اُبھارا تو انجام کار وہ جنگ اُن کے قتل کا سبب ثابت ہوئی۔اُنہیں جواباً کہا گیا: تب تو سیدنا حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہما کے قاتل نبی کریم ﷺ قرار پاتے ہیں کیونکہ آپ ہی نے اُنہیں اس جنگ پر آمادہ کیا تھا اور اللہ تعالیٰ بھی قاتل قرار پاتا ہے، کیونکہ اُسی نے مومنین کو مشرکین کے ساتھ

جنگ کرنے کا حکم فرمایا ہے۔

فی الجملہ یہ کہ اس حدیث میں تین معجزات ہیں:

۱۔ ایک یہ کہ عمار عنقریب قتل کیے جائیں گے

۲۔ دوسرا یہ کہ وہ مظلوم ہوں گے

۳۔ تیسرا یہ کہ اُن کا قاتل باغیوں میں سے ایک باغی ہوگا۔

اور یہ تمام باتیں سچ اور حق ثابت ہوئیں۔

پھر میں نے شیخ اکمل الدین کے کلام کو دیکھا، اُنہوں نے کہا: ظاہر یہ ہے کہ معاویہ کی طرف سے یہ تاویل اور اُن کی طرف سے جو نقل کیا گیا وہ یہ ہے کہ اُنہوں نے کہا کہ عمار کا قاتل وہ شخص ہے جو اُنہیں میدان میں لایا اور جنگ پر اُبھارا، یہ دونوں باتیں اُن پر بہتان ہیں۔ پہلی بات تحریفِ حدیث کے معنیٰ میں آتی ہے، اور دوسری بات اس لیے غلط ہے کہ عمار رضی اللہ عنہ کو کسی شخص نے نہیں نکالا تھا بلکہ وہ ازخود اپنی جان و مال کے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ اور اقامتِ فرض کے جذبہ سے نکلے تھے۔ یہ دونوں باتیں معاویہ پر بہتانِ محض ہیں، اس لیے کہ وہ رضی اللہ عنہ ایسی تاویل میں پڑنے سے زیادہ عقل مند تھے جو ہر خاص و عام پر ظاہر الفساد ہو۔ میں (علی قاری) کہتا ہوں: تب تو اُن پر واجب تھا کہ وہ بغاوت کو چھوڑ کر خلیفۂ برحق کی اطاعت کی طرف رجوع کرتے، مخالفت ترک کر دیتے اور خلافتِ عظمیٰ کی طلب سے باز آجاتے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ وہ باطن میں باغی تھے اور ظاہراً قصاصِ عثمان (رضی اللہ عنہ) کی آڑ لے کر دِکھاوا کرنے والے تھے۔ پس یہ حدیث ان پر طعن کرنے والی ہے اور ان کی اتباع سے روکنے والی ہے، لیکن وہی ہو کر رہا جو تقدیر میں لکھا تھا تو ان کے نزدیک جو کچھ قرآن و حدیث میں مرقوم تھا سب متروک ہو گیا۔ پس اللہ تعالیٰ کی اُس شخص پر رحمت ہو جس نے انصاف کیا اور تعصب و بے راہ روی سے کنارہ کیا اور اعتقاد میں اعتدال کو محبوب رکھا تا کہ وہ رُشد کے راستے سے ہٹ کر رافضیت و ناصبیت میں مبتلا نہ ہو اور جمیع آل و اصحاب سے

محبت کرے''۔

(مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح ج١٠ ص٢٠٠، ٢٠١، وط: ج١١ ص١٧، ١٨)

اِس تشریح کو صحیحین کی مذکورہ بالا متعدد احادیث سے ملا کر دیکھا جائے تو یہ حقیقت روزِ روشن سے بھی زیادہ واضح ہوجاتی ہے کہ موصوف کی تمامتر کوشش فقط دنیا کے لیے تھی۔ اگر دین کے لیے ہوتی تو پھر اُنہیں باغی، طاغی، محرّف اور تارکِ قرآن وسنت کہنا گمراہی اور گناہ ہوتا۔ سو جب وہ باغی طاغی اور تارکِ کتاب وسنت فقط دنیا کی وجہ سے قرار پائے تو اِس سے یہ بات متحقق ہوگئی کہ غزوۂ حنین کے مال کی تقسیم کے وقت آقا ﷺ کی زبانِ اقدس سے صادر شدہ الفاظ ''کہ یہ دنیا لے جائیں'' کمان سے نکلا ہوا تیر ثابت ہوئے۔

زاویۂ نگاہ اپنا اپنا

بنظر انصاف دیکھا جائے اور صحابیت کے ٹائٹل کو عصمت نہ سمجھا جائے تو اہل ایمان پر یہ حقیقت روشن ہوجاتی ہے کہ اسلام کے زوال کا آغاز ملوکیتِ اولین کے آغاز سے ہی ہو چکا تھا، تاہم زاویۂ نگاہ اپنا اپنا ہوتا ہے، بعض اہل تحقیق اہل بیت کرام علیہم السلام کے ساتھ اسلام کے اولین بادشاہ کی ٹکر کو بنو ہاشم اور بنو امیہ کی سابقہ کشمکش کے تناظر میں دیکھتے ہیں، بعض اس کو خلافت وملوکیت یعنی دین ودنیا کی کشمکش سمجھتے ہیں۔ یہاں سے آگے پھر زاویۂ نگاہ بدل جاتا ہے، کچھ لوگوں کی نگاہ اہل بیت کرام علیہم السلام کے مقابل آنے والی شخصیت کی صحابیت پر جا کر مرکوز ہوجاتی ہے تو وہ اُن کے تمام اقدامات کے دفاع اور اُن کی تاویلات میں کھو جاتے ہیں اور اِس سلسلے میں اس قدر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ اُن کے دُنیوی اقدامات کو انبیاء کرام علیہم السلام کی سنت کے مطابق باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں اور اُنہیں حلم وسیاست میں سیدنا ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما سے بھی بڑھا کر پیش کرتے ہیں، جبکہ ان کے برعکس کچھ لوگوں کی نگاہیں شخصیات پر نہیں ٹھہرتیں بلکہ اُن کی سوچ کا مرکز ومحور اسلام ہوتا ہے، اِس لیے وہ منہاجِ نبوت کے مطابق خلافت کی بات کرتے ہیں، خلافت وملوکیت کے فرق کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں اور اسلام کے عروج وزوال کے اسباب کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یہ لوگ صحابیت کی آڑ میں ملوکیت کے تمام اقداماتِ باطلہ کا دفاع نہیں کرتے، ملوکیت کی سیاست کو نہ تو سنتِ انبیاء بنانے کی ناکام کوشش کرتے ہیں اور نہ ہی اسلام کے اولین باشاہ کے حلم وسیاست

کو شیخین کریمین رضی اللہ عنہما کے حلم و سیاست سے بہتر سمجھتے ہیں بلکہ یہ لوگ زوالِ اسلام کے اسباب میں اولین سبب اسلام کے اولین بادشاہ کو قرار دیتے ہیں۔

راقم الحروف نے آئندہ سطور میں مختلف مکاتب فکر کی کتب سے دونوں زاویۂ نگاہ پیش کیے ہیں تا کہ اعتدال پسند عقلیں اصل حقیقت تک پہنچ سکیں۔کوئی کسی کی سوچ وفکر پر تو پہرہ نہیں دے سکتا لیکن یہ عاجز اتنی التجا کرتا ہے کہ ایسی کسی بھی تحریر کو تفضیلی، غیر تفضیلی، سنی اور شیعہ کی عینک لگا کر نہیں بلکہ مکاتبِ فکر کی قیود سے بالاتر ہو کر فقط اسلامی نگاہ سے پڑھیے گا۔

اعتذار

دین اسلام کی محبت میں راقم الحروف نے اپنی فکر کے مطابق جس بات کو حق سمجھا اُسے حق کہنے اور جس کو باطل یا غلط سمجھا تو اُسے باطل یا غلط کہنے میں کوئی تأمل نہیں کیا۔اِس سلسلے میں متعدد مقامات پر قابل تعظیم اور نامور علماء اسلام سے بھی اختلاف کرنا پڑا ہے تو دائرۂ ادب میں رہتے ہوئے اختلاف کیا گیا ہے، اس لیے کہ کسی بھی غیر معصوم شخصیت سے اختلاف کرنا بے ادبی میں شمار نہیں ہوتا اور یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ شخصیات پر حق بہر حال مقدم ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں اہلِ تحقیق اور حق پسند مسلمان تصریحاتِ کتاب وسنت اور دلائل و براہین کی روشنی میں حق کو شخصیات پر ترجیح دیتے آئے ہیں۔سو کتابِ ھٰذا کے قارئین کرام سے امید ہے کہ وہ بھی دلائل کی روشنی میں حق کو ہی ترجیح دیں گے اور اُنہیں کتابِ ھٰذا میں جو بات حقائق کے منافی اور باطل نظر آئے گی تو وہ ضرور مکمل سیاق وسباق کے ساتھ نقل کر کے دلائل و براہین کے ساتھ مصنف پر اُس کا بطلان واضح فرمائیں گے۔بخدا اگر مکمل دیانت، امانت اور متانت کے ساتھ مصنف پر اُس کے موقف کا بطلان واضح کر دیا گیا تو وہ ضرور باطل کو چھوڑ کر حق کی طرف رجوع کر لے گا۔

ضروری وضاحت

اہلِ علم اِس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ کوئی مصنف اپنے سابقہ نظریہ کے برعکس کچھ لکھ جائے تو وہ اُس کا سابقہ نظریہ سے رجوع سمجھا جاتا ہے تاہم راقم الحروف مزید عرض کناں ہے کہ میری کتب میں کسی اہم مسئلہ

کے بارے میں میرا موقف بعد میں ترمیم شدہ ملے یا سابق موقف کے بالکل برعکس ملے تو اُس کو میرا تضاد نہ سمجھا جائے بلکہ سابق تحریر سے میرا رجوع سمجھا جائے۔ میری بعض کتب متعدد بار شائع ہو چکی ہیں لیکن بعض لوگ طبع اول ہی کے حوالے دیے جا رہے ہیں، حالانکہ میں حسب موقع بعد والے ایڈیشن میں اغلاط درست کرتا، ترمیم کرتا اور سابق موقف میں سختی یا نرمی کرتا رہتا ہوں، لہٰذا میری زندگی میں میری کسی بھی کتاب کے آخری ایڈیشن کے مندرجات کو ہی میرا موقف سمجھا جائے، کیونکہ آئے روز مطالعہ میں وسعت اور مزید تحقیق کی وجہ سے بعض مسائل میں میرا سابق موقف جوں کا توں باقی نہیں رہتا۔ بعض اسلاف کرام کا ارشاد ہے کہ آج کے فیصلہ کے بارے میں کل تم پر عیاں ہو جائے کہ وہ غلط تھا تو تم اُس سے رجوع کرنے میں تاخیر نہ کیا کرو، کیونکہ باطل پر ڈٹے رہنے سے حق کی طرف رجوع کر لینا بہتر ہے۔

اَللّٰهُمَّ أَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَارْزُقْنَا اِتِّبَاعَهٗ
وَأَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَارْزُقْنَا اِجْتِنَابَهٗ.

تذکرۂ صلح از کتبِ حدیث وتاریخ

سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی معاویہ کے ساتھ صلح کا تذکرہ کتبِ حدیث وتاریخ دونوں میں آیا ہے۔ کتبِ حدیث میں اختصار اور کتبِ تاریخ میں تفصیل آئی ہے۔ پھر تاریخ کی بعض کتب میں اختصار ہے اور بعض میں تفصیل۔ ہم نے مختلف کتب سے تلخیص پیش کی ہے اور شرائط وغیرہ کا تذکرہ کر کے اِس امر کو سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ یہ صلح کیوں کی گئی، کن شرائط پر کی گئی اور کیا وہ شرائط پوری کی گئیں یا نہیں؟ پھر اِس مسئلہ میں جو اوھام پیدا کیے جاتے ہیں، جو باطل استدلالات کیے جاتے ہیں، جو تاویلاتِ فاسدہ پیش کی جاتی ہیں اُن سب کا جائزہ لیا ہے اور مغالطہ آفرینیوں کا قلع قمع کیا ہے۔

صلح امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام از حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کو یہ کہتے ہوئے سنا: اللہ جل جلالہ کی قسم! جب سیدنا امام حسن بن علی علیہما السلام معاویہ کے مقابلہ میں پہاڑوں کی مثل لشکر کے ساتھ آئے تو عمرو بن العاص نے کہا: میں ایسا لشکر دیکھ رہا ہوں جو مخالفین کو مارے بغیر نہیں لوٹے گا۔ اس پر معاویہ نے کہا: (اور اللہ کی قسم! وہ دو شخصوں میں بہتر تھے) اے عمرو! اگر اِن لوگوں نے اُنہیں اور اُنہوں نے اِن کو قتل کر دیا تو پھر لوگوں کے معاملات کی دیکھ بھال کے لیے کون ہوگا؟ اُن کی عورتوں کی حفاظت کے لیے کون ہوگا؟ اور اُن کی جائیداد کے لیے کون ہوگا؟ پھر انہوں نے قریش کے دو اشخاص جو بنی عبد شمس کی اولاد میں سے تھے، عبدالرحمٰن بن سمرہ اور عبداللہ بن عامر بن کریز کو امام حسن علیہ السلام کے پاس بھیجا اور کہا: ان کے پاس جاؤ اور اُنہیں صلح کی پیش کش کرو، وہ اپنی بات چیت میں جو مطالبہ کریں قبول کر لو۔ وہ دونوں ان کے پاس گئے، گفتگو کی اور صلح کی درخواست کی۔

امام حسن بن علی رضی اللہ عنہ نے اُنہیں فرمایا: ہم عبد المطلب کی اولاد ہیں اور ہم کو اس مال سے حصہ ملا ہے اور اُمت میں بہت خون ریزی ہوئی ہے۔ ان دونوں نے کہا: معاویہ نے آپ کو یہ اور یہ پیش کش کی ہے، وہ آپ سے صلح کی درخواست کرتا ہے اور آپ جو مطالبہ فرمائیں وہ قبول کرنے کو تیار ہے۔ امام حسن علیہ السلام نے فرمایا: اس بات کی ضمانت کون دے گا؟ انہوں نے کہا: ہم ذمہ دار ہیں۔ پھر امام حسن علیہ السلام نے جو شرط رکھی انہوں نے کہا: ہم ذمہ دار ہیں، تو اس پر امام پاک نے معاویہ سے صلح کر لی۔

حسن بصری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے حضرت ابوبکرہ کو بیان کرتے ہوئے سنا ہے، اُنہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو منبر پر دیکھا جبکہ سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہ آپ کے پہلو میں تھے، آپ کبھی لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے اور کبھی اُن کی طرف، اور آپ فرما رہے تھے: میرا یہ بیٹا سید ہے اور اُمید ہے اللہ عزوجل اس کے ذریعے مسلمانوں کے دو عظیم گروہوں کے درمیان صلح کرا دے گا"۔

(بخاري: كتاب الصلح، باب قول النبي صلى الله عليه وآله وسلم ابني هذا سيد لعل الله أن يصلح به بين فئتين عظيمتين ص ٣٦١ حديث ٢٧٠٤؛ المستدرك للحاكم ج٣ ص ١٩١ حديث ٤٨٠٨)

امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی خصوصیت

اس حدیث میں امام حسن رضی اللہ عنہ کی عظیم فضیلت ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خلافت کے تنازع میں فقط اُنہیں کی اصلاح کی تعریف فرمائی ہے، اور یہ مسلمانوں کے اتحاد کی عظیم اصل اور صلح پر اُبھارنے کی دلیل ہے۔ اس کے برخلاف جو شخص مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کرے، اُن میں تفریق پیدا کرے اور اچھے حکمرانوں کے خلاف خروج کرے تو ایسے شخص کو کہیں بھی قابل ستائش نہیں ٹھہرایا گیا۔ چنانچہ محدث ابو حفص ابن شاہین کہتے ہیں:

"اس فضیلت میں امام حسن علیہ السلام تنہا ہیں، اس میں اُن کا اور کوئی شریک نہیں، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے بجز امام حسن علیہ السلام کے کسی کی مطلق

سیادت کا ذکر نہیں فرمایا"۔

(شرح مذاهب أهل السنة لابن شاهين ص٢٦٣)

جہاں تک مقید سیادت کا تعلق ہے تو وہ متعدد احادیث میں آئی ہے، جیسا کہ صحیحین میں سیدنا سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے لیے آیا:

قُوْمُوْا إِلٰى سَيِّدِكُمْ.

"اپنے سردار (کی تعظیم) کے لیے کھڑے ہو جاؤ"۔

(بخاري: كتاب الجهاد والسير، باب إذا نزل العدوّ على حكم رجل، حديث٣٠٤٣؛
مسلم: كتاب الجهاد والسير، باب جواز قتال من نقض العهد، حديث١٧٦٨)

شیخ عبداللہ بن صالح اِس حدیث سے حاصل ہونے والے فوائد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس حدیث میں دلیل ہے کہ جب حق سے متعلق قربانی عظیم ہو تو اُس کی جزا بھی عظیم ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ جب امام حسن رضی اللہ عنہ دنیا میں اپنے حق سے دست بردار ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے اُنہیں دنیا میں سیادت عطا کی اور وہ آخرت میں جنتی جوانوں کے سردار ہوں گے اور جزا عمل کے مطابق ہوتی ہے"۔

(كتاب الأربعين في فضائل آل البيت الطاهرين ص٦٣)

دست برداریٔ امام میں صوفیانہ نکتہ

صلحاء وصوفیہ کرام رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں کہ سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی اِس قربانی کی بدولت اللہ جل جلالہ نے اہل بیت کرام علیہم السلام اور قیامت تک اُن کی اولاد کے اندر خلافت باطنیہ رکھ دی ہے، اور اب قیامت تک قطب الاقطاب فقط اسی ذریت طاہرہ سے ہوتا ہے، اور اہل اسلام کو روحانی فیض فقط اہل بیت کرام علیہم السلام سے ہی ملتا ہے، اِن کے واسطہ کے بغیر روحانی فیض کے حصول کا کوئی تصور نہیں۔ اگر آپ چاہیں تو اِس موضوع کی مکمل اور باحوالہ تفصیل کے لیے راقم الحروف کی کتاب "شرح أسنى المطالب في مناقب علي بن أبي طالب رضی اللہ عنہ" کا مطالعہ فرمائیں۔

یہاں سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ جب روحانیت کی یہ سرداری دنیوی اقتدار سے دست برداری کے عوض ملی تو پھر اِس روحانیت کا اُن لوگوں کے پاس ہونا بعید ہے جو اس اقتدار کے حصول کے لیے ان قدسی صفت ہستیوں کے خلاف مسلح ہو کر آئے تھے۔ یہ بات اُس بات سے مماثلت رکھتی ہے جو گذشتہ سطور میں غزوۂ حنین کے مالِ غنیمت کے حوالہ سے نقل ہو چکی ہے کہ طلقاء کو مال دیا گیا اور انصار رضی اللہ عنہم کے حصے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات مقدسہ آئی، یعنی بعض طلقاء بار بار دنیا پر لپکتے رہے اور محض دنیا ہی اُنہیں ہاتھ آتی رہی۔ ذرا سوچئے کہ غزوۂ حنین کے مال کی تقسیم کے موقع پر مؤلفۃ القلوب طلقاء کے بارے میں زبانِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جو الفاظ صادر ہوئے تھے وہ اس طرح اُن کا مقدر بن گئے کہ ہر اہم موڑ پر وہ دین پر دنیا ہی کو ترجیح دیتے رہے، لیکن تعجب ہے کہ اِس حقیقت کے باوجود عصر حاضر میں بعض لوگ اُنہی مؤلفۃ القلوب طلقاء سے فیض کے متلاشی ہیں، مگر ع:

ایں خیال است و محال ست و جنوں

امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ کی خصوصیت کا راز

اوپر آپ محدث ابن شاہین کا قول پڑھ چکے ہیں کہ اُنہوں نے فرمایا: اس حدیث میں جس فضیلت کا ذکر ہے اُس میں امام حسن رضی اللہ عنہ کا کوئی شریک نہیں۔ بلاشبہ یہی حقیقت ہے اور اس کا راز یہ ہے کہ حدیثِ ھٰذا میں جس صلح کا ذکر ہے وہ فقط امام حسن علیہ السلام کی جانب سے تھی، کیونکہ معاویہ نے تو اقتدار کے طمع میں اپنے سفیروں کو کہا تھا کہ تم فلاں فلاں پیش کش کر کے امام حسن کو صلح پر آمادہ کرو۔ ظاہر ہے کہ امام حسن علیہ السلام مذکورہ پیش کشوں کے باوجود اگر صلح پر آمادہ نہ ہوتے تو موصوف ضرور جنگ کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث شریف میں بھی اس صلح کی نسبت فقط امام حسن علیہ السلام کی طرف کی گئی اور ضمیر بھی واحد استعمال فرمائی گئی۔ نیز صلح کے وقت جانبین سے موجود لوگوں کے نزدیک بھی سببِ صلح سیدنا امام حسن علیہ السلام تھے، اور موردِ طعن بھی وہی ہوئے تھے، اُن پر خود اُن کے بعض ساتھیوں نے بھی طعن کیا تھا اور اُنہیں باعث عار سمجھا تھا، جس پر امام پاک نے فرمایا تھا: **العَارُ خَيْرٌ مِنَ النَّارِ** (عار نار (آگ) سے بہتر ہے)۔

امام حسن علیہ السلام کو سید فرمانے میں لطیف حکمت

یوں تو پنجتن پاک علیہم السلام کا ہر ہر فرد سید ہے، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سید الناس، سید الانام اور سید العالمین ہیں، مولا علی علیہ السلام سید العرب اور سید المسلمین ہیں، خاتونِ جنت فاطمۃ الزہراء سَیِّدَۃُ نِسَاءِ أَھْلِ الْجَنَّۃِ اور سَیِّدَۃُ نِسَاءِ الْعَالَمِیْنَ ہیں اور حسنین کریمین سَیِّدَا شَبَابِ أَھْلِ الْجَنَّۃِ ہیں مگر خاص اِس موقع پر امام حسن علیہ السلام کو کسی قسم کی اضافت کے بغیر مطلقاً سید فرمانے میں یہ حکمت ہے کہ مسلمانوں کو چاہیئے کہ اُن کا دھیان اِس صلح میں فقط امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام پر ہی رہے اور وہ سمجھ لیں کہ یہ صلح صرف اور صرف اُنہیں کی اعلیٰ ظرفی اور بلند ہمتی کی بدولت ہوئی۔ اِس میں امام پاک کے مدنظر کسی کی اہلیت وصلاحیت نہیں تھی، وہ جس کے ساتھ صلح کا معاملہ طے فرما رہے تھے اُس کی چالوں، خدع، دخن اور مکر وفریب سے خوب آگاہ تھے مگر اُن کی نگاہ جانبین کے لوگوں میں سے اُن خالص مسلمانوں پر تھی جن سے مستقبل میں اسلامی فوائد حاصل ہو سکتے تھے۔ اس لیے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ جو شخص اپنی اعلیٰ بصیرت کی بدولت مستقبل میں عظیم اسلامی فوائد کو مدنظر رکھتے ہوئے کسی نااہل شخص کے ساتھ بھی محدود مدت کے لیے کوئی سمجھوتہ کر لے تو حقیقی معنیٰ میں سید وہی ہے نہ کہ اُس کا مدمقابل۔

کیا صلح میں اہلیتِ معاویہ مدنظر تھی؟

کچھ لوگ اس صلح کو عمومی نگاہ سے دیکھتے ہیں، لیکن محققین ومدبّرین کے نزدیک یہ عظیم ترین قربانی اور دوررَس نتائج کی حامل صلح تھی، کیونکہ اس کی بدولت جانبین سے ہزاروں مسلمانوں کی جانیں اور اسلام کا مستقبل محفوظ ہوا تھا۔ اس صلح میں امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے مدنظر کیا چیز تھی؟ آیا کسی فرد کی اہلیت تھی یا اہل اسلام کا تحفظ تھا؟ بوجہ عدم تدبر بہت لوگ امام حسن علیہ السلام کی دست برداری کو اہلیتِ معاویہ کی دلیل سمجھتے ہیں۔ یہاں ہم بہت لوگوں کی عبارات وآراء کو نقل کرنے کی بجائے بطورِ نمونہ ایک آدھ اقتباس پیش کر رہے ہیں۔

بعض نامور متأخرینِ ہند لکھتے ہیں:

”امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اگر خلافت کے اہل نہ ہوتے (تو) امام مجتبیٰ ہرگز اُنہیں

تفویض نہ فرماتے"۔

(فتاوی رضویہ ج۲۹ص۳۳۷)

مدنظر اہلیت تھی یا دفعِ شر؟

اردو اور عربی وغیرہ زبانوں میں معاویہ کی اہلیت کے متعلق اِس قسم کے جملے بڑے بڑے لوگوں نے استعمال کیے ہیں۔ ہم نے مذکورہ بالا جملہ بطورِ نمونہ نقل کیا گیا ہے، اس کو نقل کرنے میں ہمارا مقصود یہ ہے کہ عربی اردو یا کسی بھی زبان میں ایسا مفہوم کسی بھی کتاب میں کسی بھی چھوٹی یا بڑی شخصیت سے منقول ہو تو اُس کا اعتبار نہ کیا جائے، کیونکہ یہ خیال کتاب وسنت اور سیدنا امام حسن علیہ السلام کی تصریحات کے منافی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے:

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا.

"بیشک اللہ تعالیٰ حکم فرماتا ہے تمہیں کہ سپرد کرو امانتوں کو جو اُن کے اہل ہیں"۔

(النساء:۵۳)

احادیث مبارکہ میں بھی غیر مبہم انداز میں فرمایا گیا ہے کہ یہ بات خیانت کے زمرہ میں آتی ہے کہ اہل شخص کو نظر انداز کرتے ہوئے نااہل کو منصب سونپ دیا جائے۔ چنانچہ اِسی آیت کے تحت مفتی محمد شفیع عثمانی لکھتے ہیں:

"بعض روایات میں ہے کہ جس شخص نے کوئی عہدہ کسی شخص کے سپرد کیا حالانکہ اُس کے علم میں تھا کہ دوسرا آدمی اُس عہدہ کے لیے اُس سے زیادہ قابل اور اہل ہے تو اس نے اللہ کی خیانت کی اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اور سب مسلمانوں کی"۔

(معارف القرآن للعثماني ج۲ص٤٤٦،٤٤٧)

معاویہ بن ابی سفیان طلقاء اور مؤلفۃ القلوب میں سے تھے اور طلقاء کسی منصب کے لائق نہیں تھے۔ وہ کیسے؟ اس کو سمجھنے کے لیے درجِ ذیل سطور میں غور فرمائیں۔

طلقاء اور مؤلفۃ القلوب میں فرق

فتح مکہ کے بعد جن لوگوں کو غلام بنانے کی بجائے آزاد کر دیا گیا تھا اُن سب کو طلقاء کہا جاتا ہے، پھر اُن میں سے جن سے سازشوں اور شرارتوں کا اندیشہ تھا اور اِسی وجہ سے اُنہیں دوسرے لوگوں کی بہ نسبت مال زیادہ دیا گیا، اُنہیں طلقاء کے ساتھ ساتھ مؤلفۃ القلوب بھی کہا جاتا ہے۔ یعنی لفظِ طلقاء کا اطلاق تو فتح مکہ کے بعد مجبوراً مسلمان ہونے والے تمام لوگوں پر ہوتا ہے مگر مؤلفۃ القلوب کا اطلاق سب طلقاء پر نہیں بلکہ فقط اُن طلقاء پر ہوتا ہے جن سے مستقبل میں کسی قسم کے ضرر کا اندیشہ تھا۔

کیا سب طلقاء مجبوراً مسلمان ہوئے تھے؟

یہاں یہ بات ملحوظِ خاطر رہے کہ فتح مکہ کے موقع پر اکثر لوگ تو مجبوراً اسلام لائے تھے مگر بعض خوش بختوں کی قسمت نے یاوری فرمائی تو اُنہیں دل سے ایمان لانا نصیب ہوا۔ اُنہی میں سے حضرت عتاب بن اسید اور اُن کے تین ساتھی ہیں۔ علماء حدیث وسیر نے اُن کے واقعہ کے بارے میں جو کچھ نقل کیا ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے:

> ''فتح مکہ کے روز جب نماز ظہر کا وقت ہوا تو نبی کریم ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اذان کہنے کا حکم دیا تو قریش کے چار لوگ جو ایک مخفی مقام پر بیٹھے تھے، کہنے لگے: شکر ہے کہ ہمارے فلاں فلاں بزرگ اِس ذلت کے دن سے محفوظ رہے اور کعبہ کی چھت پر کھڑے ہو کر اِس سیاہ کالے کی آواز سننے سے محفوظ رہے۔ نبی کریم ﷺ نے اُنہیں اُن کی اِس سرگوشی سے آگاہ فرما دیا تو اُنہوں نے کہا: ہمارے ساتھ کوئی ایسا آدمی ہرگز نہیں تھا جس کے بارے میں ہم کہہ سکیں کہ اُس نے آپ کو ہماری گفتگو سے آگاہ کیا ہے۔
>
> مَا أَخْبَرَکَ إِلَّا اللّٰهُ ، وَشَهِدُوا شَهَادَةَ الْحَقِّ.
>
> آپ کو اللہ تعالیٰ نے ہی خبر دی ہے، اور وہ صدق دل سے مسلمان ہو گئے۔

پھر آپ ﷺ نے حضرت عتاب بن اسید کو مکۃ المکرمہ کا گورنر مقرر فرما دیا"۔

(الإصابة (ط: علمية) ج ٤ ص ٣٥٦)

اسی طرح حضرت عثمان بن طلحہ ﷺ بھی اگرچہ فتح مکہ کے دن اسلام لائے تھے مگر مجبوراً نہیں بلکہ دل سے اسلام قبول کیا تھا۔ چنانچہ وہ خود بیان فرماتے ہیں:

"ہجرت سے پہلے مکۃ المکرمہ میں حضور ﷺ کے ساتھ میری ملاقات ہوئی تو آپ نے مجھے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ میں نے کہا اے محمد ! تعجب ہے کہ آپ مجھ ایسے شخص میں طمع رکھتے ہیں کہ میں آپ کی پیروی کروں گا حالانکہ آپ قوم کے دین کی مخالفت کرتے ہیں اور ایک نیا دین نکال لائے ہیں۔ حضرت عثمان کہتے ہیں زمانہ جاہلیت میں ہم ہر پیر اور جمعرات کو کعبہ معظّمہ کا دروازہ کھولتے تھے۔ ایک دن ہم نے کعبہ معظّمہ کا دروازہ کھول رکھا تھا کہ دیگر لوگوں کے ساتھ نبی کریم ﷺ بھی اُس میں داخل ہونے لگے تو میں نے آپ پر غصہ کیا اور خوب دِل کی بھڑاس نکالی ،لیکن آپ نے حلم و بردباری کا مظاہرہ کیا، پھر فرمایا:

يَا عُثْمَان! لَعَلَّكَ سَتَرٰى هٰذَا الْمِفْتَاحَ بِيَدِيْ أَضَعُهٗ حَيْثُ شِئْتُ.

اے عثمان! عنقریب تم دیکھو گے کہ یہ چابی میرے ہاتھ میں ہوگی، میں اسے جہاں چاہوں گا رکھوں گا۔

میں نے کہا: اس دن قریش تباہ اور ذلیل ہو جائیں گے۔ آپ نے فرمایا: نہیں بلکہ آباد ہوں گے اور عزت حاصل کریں گے۔ پھر آپ کعبہ میں داخل ہو گئے۔ پس آپ کا یہ جملہ میرے دل میں پیوست ہو گیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ یہ معاملہ عنقریب ضرور ہوگا۔ پھر میں نے اسلام قبول کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو میری قوم نے مجھے بہت سختی سے منع کر دیا۔ پھر فتح مکہ کے دن حضور ﷺ نے حکم فرمایا: عثمان کو بلاؤ! میں حاضر ہوا تو فرمایا: چابی لاؤ! میں چابی لے آیا تو آپ نے مجھ سے لے لی، پھر مجھے

واپس کرتے ہوئے فرمایا: یہ پکڑو! ہمیشہ یہ تمہارے پاس رہے گی اور تم سے کوئی چھین نہیں سکے گا مگر ظالم۔ پھر جب میں چابی لے کر چل دیا تو آپ نے مجھے پکارا۔ میں پلٹ کر آیا تو ارشاد فرمایا:

أَلَمْ تَكُنِ الَّذِيْ قُلْتُ لَكَ ؟ فَذَكَرْتُ قَوْلَهُ لِيْ بِمَكَّةَ قَبْلَ الْهِجْرَةِ لَعَلَّكَ سَتَرٰى هٰذَا الْمِفْتَاحَ بِيَدِيْ أَضَعُهُ حَيْثُ شِئْتُ.

کیا ہم نے تمہیں کہا نہیں تھا؟ تو مجھے آپ کا وہ ارشاد یاد آ گیا جو آپ نے ہجرت سے قبل فرمایا تھا: ''عنقریب تم دیکھو گے کہ یہ چابی میرے ہاتھ میں ہوگی، میں اسے جہاں چاہوں گا رکھوں گا'' میں نے عرض کیا: میں گواہی دیتا ہوں: بیشک آپ اللہ کے رسول ہیں''۔

(سبل الهدىٰ ج١٠ ص٦٥، ٦٦؛ تاريخ مكة للأزرقي ج١ ص٢٧٨، ٢٧٩؛ شفاء الغرام للفاسي ج٢ ص٢٤١، ٢٤٢؛ عيون الأثر ج٢ ص٢٤٠، ٢٤١)

خلاصہ یہ ہے کہ سب طلقاء مجبوراً مسلمان ہوئے تھے اور نہ ہی سب طلقاء یکساں تھے بلکہ اُن میں کچھ اچھے تھے اور کچھ خراب، اور جو زیادہ خراب تھے وہی مؤلفۃ القلوب تھے۔

کیا طلقاء منصب کے اہل تھے؟

معاویہ طلقاء میں سے بھی تھے اور مؤلفۃ القلوب میں سے بھی اور ایسے لوگ کسی منصب کے اہل نہیں تھے۔ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے جو بامرِ مجبوری معاویہ کو ملک سونپا تھا اُسے معاویہ کی اہلیت کی دلیل سمجھنا حقائق سے غفلت کی علامت ہے۔ تعجب ہے کہ بعض نامور اکابر اِس بات کو اہلیت معاویہ قرار دینے کی غلطی کے مرتکب ہو گئے اور یہاں تک لکھ دیا:

> ''امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اگر خلافت کے اہل نہ ہوتے (تو) امام مجتبیٰ ہرگز اُنہیں تفویض نہ فرماتے''۔

(فتاوی رضویه ج٢٩ ص٣٣٧)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا موقف

امام ابن سعد نے خلافت پر مبنی روایات کے ضمن میں اپنی سند کے ساتھ لکھا ہے کہ عبدالرحمان بن ابزی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: خلیفہ ثانی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

هٰذَا الْأَمْرُ فِيْ أَهْلِ بَدْرٍ مَا بَقِيَ مِنْهُمْ أَحَدٌ ، ثُمَّ فِيْ أَهْلِ أُحُدٍ مَا بَقِيَ مِنْهُمْ أَحَدٌ ، وَ فِيْ كَذَا وَ كَذَا ، وَلَيْسَ فِيْهَا لِطَلِيْقٍ وَلَا لِوَلَدِ طَلِيْقٍ وَلَا لِمُسْلِمَةِ الْفَتْحِ شَيْءٌ.

''یہ امر اہل بدر میں رہے گا جب تک کہ اُن میں سے کوئی ایک باقی رہا، پھر یہ اہل احد میں رہے گا جب تک کہ اُن میں سے کوئی ایک باقی رہا، پھر درجہ بدرجہ چلتا رہے گا، اور اس میں طلقاء، طلقاء کی اولاد اور فتح مکہ کے مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں''۔

(الطبقات الكبرىٰ لابن سعد ج۳ ص۳۱۷؛ وط: علمية ج۳ ص ۳۶۰؛ أسد الغابة ج۵ ص ۲۰۴؛ تاريخ دمشق ج۵۹ ص ۱۴۵؛ مختصر تاريخ دمشق ج۲۵ ص ۴۲؛ فتح الباري ج۱۷ ص ۶۰ حديث ۷۲۲۱؛ جمع الجوامع للسيوطي ج۱۵ ص ۶۵۲ حديث ۱۸۶۲؛ كنز العمال ج۱۲ ص ۶۸۱ حديث ۳۶۰۴۶)

اِس اثر کی سند میں چار راوی ہیں، اُن کی ثقاہت وغیرہ کے بارے میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے بطورِ خلاصہ یوں حکم لگایا ہے:

۱۔ عفان بن مسلم: ثقہ اور ثبت ہے۔

(تقريب التهذيب ۶۸۱)

۲۔ ابوعوانہ وضاح بن عبداللہ الیشکری: ثقہ اور ثبت ہیں۔

(تقريب التهذيب ص۱۰۳۶)

۳۔ حسین بن عمران: سچا ہے، شک میں پڑتا ہے۔

(تقريب التهذيب ص۲۴۹)

۴۔ عبدالرحمان بن ابزی: کم عمر صحابی ہیں اور سیدنا عمرؓ کے دور میں "رَجُل" (مرد) تھے۔

(تقریب التهذیب ص ٥٦٩)

اس سند میں حضرت عبدالرحمان بن ابزیؓ سے جس شیخ نے سنا ہے، اُن کے حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ تاہم حافظ ابن حجر عسقلانی کے نزدیک یہ حدیث قابل حجت ہے، کیونکہ اُنہوں نے اِس سے سیدنا عمرؓ کے اِس ارشاد سے صحابہ کرامؓ کی طبقاتی فضیلت کی دلیل اخذ کی ہے۔ نیز اِس اثر کی صحت کی اہم دلیل یہ بھی ہے کہ اِس کے پہلے راوی عفان بن مسلم کے بارے میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے محدث ابن المدینی کا قول نقل کیا ہے کہ اُنہوں نے فرمایا:

كَانَ إِذَاشَكَّ فِي حَرْفٍ مِنَ الْحَدِيْثِ تَرَكَهُ.

''جب اُنہیں حدیث کے کسی ایک حرف میں بھی شک پڑ جاتا تو وہ اُسے چھوڑ دیتے''۔

(تقريب التهذيب ص ٦٨١)

سیدنا عمر بن الخطابؓ سے ایک اور قول بھی اسی طرح منقول ہے۔ چنانچہ حافظؒ ہی لکھتے ہیں:

إِنَّ عُمَرَ قَالَ لِأَهْلِ الشُّوْرىٰ: لَا تَخْتَلِفُوْا ، فَإِنَّكُمْ إِنِ اخْتَلَفْتُمْ جَاءَ كُمْ مُعَاوِيَةُ مِنَ الشَّامِ ، وَعَبْدُ اللّٰهِ بْنِ رَبِيْعَةَ مِنَ الْيَمَنِ ، فَلَا يَرِيَانِ لَكُمْ فَضْلًا لِسَابِقَتِكُمْ ، وَإِنَّ هٰذَا الْأَمْرَ لَا يَصْلُحُ لِلطُّلَقَاءِ وَلَا لِأَبْنَاءِ الطُّلَقَاءِ ، فَهٰذَا يَقْتَضِيْ أَنْ يَّكُوْنَ عَبْدُ اللّٰهِ مِنْ مُسْلِمَةِ الْفَتْحِ.

''سیدنا عمرؓ نے مجلس شوریٰ سے فرمایا: اختلاف میں نہ پڑنا، اگر تم اختلاف میں پڑ گئے تو معاویہ شام سے اور عبداللہ بن ربیعہ یمن سے آجائے گا، پھر وہ دونوں تمہارے سابقین ہونے کی فضیلت کو نہیں دیکھیں گے، اور یہ معاملۂ خلافت طلقاء اور اولادِ طلقاء کے لیے درست نہیں ہے۔ حافظ فرماتے ہیں: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ بن ربیعہ فتح مکہ کے مسلمانوں (طلقاء) میں سے تھا''۔

(الإصابة ج٤ ص ٧٠ في ترجمة عبد الله بن ربيعة ذوالرمحين)

ہر چند کہ اِس روایت کی سند معلوم نہیں تاہم اِس کا متن سورۃ الانفال کی آیت[۷۲]اور ایک صحیح حدیث سے مؤیَّد ہے، اور وہ یہ ہے:

الْـمُهَـاجِرُوْنَ وَالْأَنْصَارُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ فِي الدُّنْيَا وَالآخِرَةِ ، وَالـطُّلَـقَـاءُ مِـنْ قُـرَيْـشٍ ، وَالْعُتَقَاءُ مِنْ ثَقِيفٍ ، بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ فِي الدُّنْيَا وَالآخِرَةِ.

''مہاجرین وانصار دنیا اور آخرت میں ایک دوسرے کے دوست ہیں، اور قریش کے طلقاء اور ثقیف کے عتقاء دنیا اور آخرت میں ایک دوسرے کے دوست ہیں''۔

(مسند أحمد ج٤ ص ٣٦٤ وط: ج٦ ص ٥١٣ حديث ١٩٤٢٧)

ظاہر ہے کہ جب معاویہ اور عبداللہ بن ربیعہ طلقاء میں سے تھے تو وہ خلافت کے معاملہ میں طلقاء اور عتقاء کو چھوڑ کر سابقین کی فضیلت کو مدنظر رکھتے تو یہ حدیث نبوی غلط ہو جاتی۔ معلوم ہوا کہ قولِ عمر رضی اللہ عنہ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطابق ہے۔ یہاں یہ بھی یاد رہے کہ معاویہ سابقین پر طلقاء وغیرہ کو ترجیح دیتے تھے۔

نیز طلقاء کے بارے میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا موقف درجِ ذیل الفاظ سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ علامہ ابن عبدربہ اندلسی لکھتے ہیں کہ معاویہ نے تحکیم کے بعد سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو ایک خط لکھا جس میں اُنہوں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ وہ ایک مجلس شوریٰ میں خلافت کا معاملہ رکھنا چاہتے ہیں، لہٰذا اُس میں سعد بن ابی وقاص بھی شریک ہوں۔ اُنہوں نے جواباً لکھ بھیجا:

أَمَّـا بَـعْـدُ ، فَإِنَّ عُمَرَ رضی اللہ عنہ لَـمْ يَـدْخُـلْ فِـي الشُّوْرىٰ إِلَّا مَنْ تَحِلُّ لَهُ الْـخِلَافَةُ ، فَـلَـمْ يَكُنْ أَحَدٌ أَوْلىٰ بِهَا مِنْ صَاحِبِهِ إِلَّا بِاِجْتِمَاعِنَا عَلَيْهِ ، غَيْرَ أَنَّ عَلِيًّا كَانَ فِيْهِ مَا فِيْنَا ، وَلَمْ يَكُنْ فِيْنَا مَافِيْهِ.

''امابعد، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے تو مجلسِ شوریٰ میں نہیں داخل کیا تھا مگر اُنہیں جن کے لیے خلافت جائز تھی، پس کوئی شخص خلافت کے لیے اپنے دوسرے ساتھی سے زیادہ بہتر نہیں تھا، الا یہ کہ ہم سب اُس کے حق میں جمع ہو جاتے ماسوا علی رضی اللہ عنہ کے، اُن میں وہ

تمام صفات جمع تھیں جو ہم سب میں نہیں تھیں اور ہم سب میں وہ خوبیاں نہیں تھیں جو تنہا اُن میں تھیں''۔

(العقدالفرید ج ٥ ص ٨٦)

اِس میں سیدنا سعد بن ابی وقاص ﷺ نے دو باتیں سمجھائی ہیں:

۱۔ ایک یہ کہ تم اور خلافت کے لیے مجلس شوریٰ کا کوئی جوڑ نہیں

۲۔ دوسری یہ کہ تم اُس علی کی حیات میں خلافت اور مجلس شوریٰ کے متمنی ہو جن کی خوبیوں کا یہ عالم ہے کہ ہم سب کی خوبیوں کو ملا کر بھی اُن کی خوبیوں کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔

یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے، وہ یہ کہ ایک طرف تو سیدنا عمر ﷺ طلقاء کو مجلس شوریٰ میں لینا جائز نہیں سمجھتے تھے اور اپنی زندگی کے آخری دو چار دنوں میں بھی صحابہ کرام ﷺ کو طلقاء سے خبردار کر رہے تھے اور دوٹوک انداز میں فرما رہے تھے کہ طلقاء خلافت کے لیے موزوں نہیں ہیں، جبکہ دوسری طرف بعض طلقاء کو اُنہوں نے یہ منصب سونپا بھی تھا، یہ تضاد کیسا؟ اِس اشکال کا حل عنقریب آ رہا ہے۔

سیدنا ابن عباس ﷺ کا موقف

ایک مرتبہ معاویہ نے سیدنا ابن عباس ﷺ کی طرف خلافت کے معاملات میں خط ارسال کیا اور اُس میں لکھا کہ اگر لوگ آپ کی بیعت کرتے تو ہم علی کی بجائے تمہاری بیعت کے لیے جلدی کرتے۔ اس کے جواب میں سیدنا ابن عباس ﷺ نے لکھ بھیجا:

وَإِنَّ الْخِلَافَةَ لَا تَصْلُحُ إِلَّا لِمَنْ كَانَ فِي الشُّورىٰ مِمَّنْ سَمَّاهُ عُمَرُ، فَمَا أَنْتَ وَالْخِلَافَةُ يَا مُعَاوِيَةُ! وَأَنْتَ طَلِيقُ الإِسْلَامِ، وَابْنُ رَأْسِ الْأَحْزَابِ، وَابْنُ آكِلَةِ الْأَكْبَادِ.

''خلافت صرف اُن لوگوں کے لیے مناسب ہے جن کا نام سیدنا عمر ﷺ نے مجلسِ شوریٰ میں لیا تھا، لہٰذا اے معاویہ تمہارا اور خلافت کا کیا جوڑ؟ تم اسلام کے طلیق (آزاد شدہ) ہو، غزوہ احزاب میں کفر کے سرغنہ کے بیٹے ہو اور کچا کلیجہ چبانے والی

کے بچے ہو"۔

(أنساب الأشراف للبلاذري ج٥ ص١١٥)

ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا موقف

ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بھی طلقاء کی امارت کو پسند نہیں فرماتی تھیں اور اُن کی مملکت کو انتہائی سخت الفاظ سے تعبیر فرماتی تھیں۔ اِس سلسلے میں راقم الحروف مزید کچھ کہنے سے قاصر ہے، آپ اُن ہی کے الفاظ میں غور فرمالیجئے۔ علامہ ذہبی، ابن عساکر اور ابن کثیر حالاتِ معاویہ میں سند کے ساتھ لکھتے ہیں:

أَيُّوبُ بْنُ جَابِرٍ، عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ، عَنِ الْأَسْوَدِ، قُلْتُ لِعَائِشَةَ: أَلَا تَعْجَبِينَ لِرَجُلٍ مِنَ الطُّلَقَاءِ يُنَازِعُ أَصْحَابَ مُحَمَّدٍ فِي الْخِلَافَةِ؟ قَالَتْ: وَمَا تَعْجَبُ مِنْ ذَلِكَ؟ هُوَ سُلْطَانُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ الْبَرَّ وَالْفَاجِرَ، وَقَدْ مَلَكَ فِرْعَوْنُ مِصْرَ أَرْبَعَ مِئَةِ سَنَةٍ.

"حضرت اسود بن یزید کہتے ہیں: میں نے سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے عرض کیا: کیا آپ کو تعجب نہیں ہوتا کہ خلافت کے معاملہ میں حضور ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ ایسا شخص تنازع کر رہا ہے جو طلقاء میں سے ہے؟ اُنہوں نے فرمایا: تم اس معاملہ میں حیرت زدہ کیوں ہو؟ یہ خدا کا ملک ہے وہ نیک و فاجر ہر ایک کو دے دیتا ہے، فرعون نے بھی تو مصر پر چار سو سال حکومت کی تھی"۔

(سير أعلام النبلاء ج٣ ص١٤٣؛ تاريخ دمشق ج٥٩ ص١٤٥؛ مختصر تاريخ دمشق ج٢٥ ص٤٢؛ البداية والنهاية ج١١ ص٤٣٠، وط: ج٨ ص١٩٠؛ الدر المنثور ج١٣ ص٢١٥، ٢١٦، سورة الزخرف، آية: ٥١)

اس سند میں ایک راوی ایوب بن جابر ہے، اس کے متعلق جرح و تعدیل کے مختلف اقوال مذکور ہیں، لیکن کسی نے اِس کو کذاب یا وضاع نہیں کہا۔ اسی لیے حافظ ابن حجر عسقلانی نے سب اقوال کو مدنظر رکھ کر نتیجہ اخذ کرتے ہوئے لکھا ہے:

ضَعِيفٌ مِنَ الثَّامِنَةِ.

''آٹھویں طبقہ سے ہے، ضعیف ہے''۔

(تقریب التھذیب ص ۱۵۸)

لہٰذا کوئی اور سنگین وجہ نہ ہوتو اِس حدیث کو موضوع یا متروک نہیں کہا جاسکتا، بلکہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے امام بخاری سے نقل کیا ہے کہ اُنہوں نے فرمایا:

هُوَ أَوْثَقُ مِنْ أَخِيهِ مُحَمَّدٍ.

''وہ اپنے بھائی محمد سے زیادہ ثقہ ہیں''۔

(تھذیب التھذیب ج۱ ص ۳۷۶)

اِس قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ اِس کی تضعیف وتوثیق میں اختلاف ہے، اور جب کسی سند میں ایسا مختلف فیہ راوی ہوتو اُس سند سے مروی حدیث کو محدثین حسن کہتے ہیں۔ چنانچہ علامہ ظفر احمد عثمانی تھانوی لکھتے ہیں:

إِذَا كَانَ الرَّاوِيُ مُخْتَلَفًا فِيهِ :وَثَّقَهُ بَعْضُهُمْ ،وَضَعَّفَهُ بَعْضُهُمْ فَهُوَ حَسَنُ الْحَدِيثِ.

''جب راوی مختلف فیہ ہو: بعض نے اُس کی توثیق کی ہو اور بعض نے اُس کو ضعیف کہا ہوتو وہ حسن الحدیث ہے''۔

(قواعد في علوم الحديث ص ۷۲)

اس سند کے دوسرے راوی ابواسحاق کے بارے میں حافظ رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

ثِقَةٌ مُكْثِرٌ عَابِدٌ ، مِنَ الثَّالِثَةِ ، اِخْتَلَطَ بِآخِرِهِ.

''طبقۂ ثالثہ کے ثقہ، بکثرت روایت کرنے والے اور عبادت گزار تھے، آخر میں اختلاط کا شکار ہو گئے تھے''۔

(تقریب التھذیب ص ۷۳۹)

یہ تابعی ہیں، سیدنا مولیٰ علی علیہ السلام اور دوسرے کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ صحاح ستہ کے رواۃ میں سے ہیں، حافظ رحمۃ اللہ علیہ کا اِن کے بارے میں دوٹوک انداز میں ''اِخْتَلَطَ بِآخِرِہٖ'' لکھنا غیر مناسب ہے، کیونکہ یہ اُن کے بارے میں بعض کا قول ہے اس پر اتفاق نہیں ہے، چنانچہ محدث ذہبی لکھتے ہیں:

أَبُوْإِسْحَاقِ السَّبِيْعِيُّ، مِنْ أَئِمَّةِ التَّابِعِيْنَ بِالْكُوْفَةِ وَأَثْبَاتِهِمْ ، إِلَّا أَنَّهُ شَاخَ وَنَسِيَ وَلَمْ يَخْتَلِطْ.

''ابواسحاق سبیعی کوفہ کے ائمہ تابعین اور مثبت حضرات میں سے تھے، الا یہ کہ وہ بوڑھے ہو چکے تھے، بھول چکے تھے اور خلط ملط کا شکار نہیں ہوئے تھے''۔

(میزان الاعتدال ج٥ ص٣٢٦)

اسی لیے دورِ حاضر کے بعض لوگوں نے بھی حافظ رحمہ اللہ کے اِس قول کو غیر مناسب قرار دیا ہے۔ چنانچہ دکتور بشار عواد معروف اور شیخ شعیب الارنؤوط لکھتے ہیں:

قَوْلُهُ: ''اِخْتَلَطَ بِآخِرَةٍ'' لَيْسَ بِجَيِّدٍ.

''حافظ کا قول ''اِخْتَلَطَ بِآخِرَةٍ'' غیر مناسب ہے''۔

(تحریر تقریب التهذیب ج٣ ص٩٩)

اِس سند کے تیسرے راوی اسود بن یزید کے بارے میں حافظ رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

مُخَضْرَمٌ ، ثِقَةٌ مُكْثِرٌ فَقِيْهٌ.

''دورِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مومن، ثقہ، بکثرت روایت کرنے والے فقیہ ہیں''۔

(تقریب التهذیب ص١٤٦)

لہٰذا اِس روایت کو مسترد نہیں کیا جا سکتا، اگر کوئی شخص اس قسم کے راویوں کی روایت کو مسترد کرنے کی کوشش کرے تو اُسے متعدد ایسی احادیث سے ہاتھ دھونا پڑیں گے جو اُمت میں مقبول اور قابل عمل ہیں۔ اُم المؤمنین کے اِس قول کی تائید اُن احادیث صحیحہ سے بھی ہوتی ہے جن میں ارشاد فرمایا گیا کہ ''مجھے خدشہ

ہے کہ تم دنیا کی خاطر لڑو گے"۔ نیز سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی وہ پیش گوئی بھی اس فرمان کی مؤید ہے کہ "اے صحابہ! باہم اتحاد قائم رکھنا ورنہ معاویہ وغیرہ خلافت کے معاملہ میں تم پر غالب آجائیں گے اور تمہارے سابق ہونے کی پروا نہیں کریں گے"۔

عبدالرحمان بن غنم الاشعری رضی اللہ عنہ کا موقف

انہیں اکثر علماء نے صحابی مانا ہے لیکن امام ابن عبدالبر کے مطابق یہ حیاتِ نبوی ﷺ میں اسلام تو لا چکے تھے مگر آپ ﷺ سے ملاقات نہیں کر سکے تھے۔ سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی صحبت میں رہتے تھے اور اہل شام میں بڑے فقیہ مانے جاتے تھے۔ اُنہوں نے دورانِ گفتگو حضرت ابوالدرداء اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو فرمایا تھا:

وَأَيُّ مَدْخَلٍ لِمُعَاوِيَةَ فِي الشُّوْرٰى ؟ وَهُوَ مِنَ الطُّلَقَاءِ الَّذِيْنَ لَا تَجُوْزُ لَهُمُ الْخِلَا فَةُ ، وَهُوَ وَأَبُوْهُ عَنْ رُؤُوْسِ الْأَحْزَابِ.

معاویہ کا شوریٰ سے کیا واسطہ؟ وہ اُن طلقاء میں سے ہے جن کے لیے خلافت جائز نہیں، وہ اور اُس کا باپ غزوۂ احزاب کے سرغنہ لوگوں میں سے تھے"۔

(الاستیعاب ج۱ ص ۴۸۲؛ أسد الغابة ج۳ ص ۴۸۲؛ إزالة الخفاء ج۱ ص ۴۸، ۴۱۴)

سیدنا ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی وفات کے بارے میں کئی اقوال ہیں: ایک قول یہ ہے کہ وہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں وفات پا گئے تھے، جبکہ ایک جماعت کا قول یہ بھی ہے کہ اُن کی وفات جنگ صفین کے بعد ۳۸ یا ۳۹ھ میں ہوئی تھی۔

(الاستیعاب ج۲ ص ۱۲۳)

دوسرے قول کی رو سے سیدنا عبدالرحمان بن غنم اشعری رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

حضرت صعصعہ بن صوحان رضی اللہ عنہ کا موقف

یہ انتہائی عقل مند، بلیغ، فصیح، اعلیٰ درجہ کے خطیب اور عالم قرآن تھے۔ نبی کریم ﷺ کی ظاہری

حیات میں ایمان لا چکے تھے مگر شرفِ ملاقات و دیدار سے بہرہ ور نہیں ہو سکے تھے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی قرآن فہمی اور حاضر جوابی کی وجہ سے اُن کو فرمایا تھا:

أَنْتَ مِنِّيْ وَأَنَا مِنْكَ.

''آپ مجھ سے ہیں اور میں آپ سے ہوں''۔

(الاستيعاب في معرفة الأصحاب ج١ ص ٤٣١؛ أسد الغابة ج٣ ص ٢١)

ایک مرتبہ اُن کو اور اُن کے ساتھیوں کو معاویہ نے محبوس کر لیا اور پھر ایک دن ان سب کے پاس جا کر ایک ایک کے ساتھ بات چیت کی، اور پوچھا:

أَيُّ الْخُلَفَاءِ رَأَيْتُمُوْنِي.

''تم مجھے کیسا خلیفہ سمجھتے ہو؟''۔

ہر ایک نے اپنے مافی الضمیر کا اظہار کیا اور آخر میں سیدنا صعصعہ بن صوحان رضی اللہ عنہ گویا ہوئے تو اُنھوں نے فرمایا:

تَكَلَّمْتَ يَا مُعَاوِيَةُ فَأَبْلَغْتَ ، وَلَمْ تَقْصُرْ عَمَّا أَرَدْتَ ، وَلَيْسَ الْأَمْرُ عَلٰى مَا ذَكَرْتَ ، أَنّٰى يَكُوْنُ الْخَلِيْفَةُ مَنْ مَلَكَ النَّاسَ قَهْرًا ، وَدَانَهُمْ كِبْرًا ، وَاسْتَوْلٰى بِأَسْبَابِ الْبَاطِلِ كِذْبًا وَّمَكْرًا ؟ وَإِنَّمَا أَنْتَ طَلِيْقُ ابْنِ طَلِيْقٍ ، أَطْلَقَكُمَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَأَنّٰى تَصْلُحُ الْخِلَافَةُ لِطَلِيْقٍ.

''معاویہ! تم نے کلام کیا تو پورا کیا، تمہارا جو ارادہ تھا اُس میں کمی نہیں کی اور معاملہ ایسا نہیں جیسا کہ تم نے ذکر کیا۔ بھلا وہ شخص خلیفہ کیسے ہو سکتا ہے جو جبراً لوگوں پر غالب ہو جائے اور اسبابِ باطلہ کے ذریعے مکر و کذب کے ساتھ قابض ہو بیٹھے؟ تم محض طلیق ابن طلیق ہو، رسول اللہ ﷺ نے تمھیں آزاد کیا تھا، سو خلافت کسی طلیق کے لیے کیسے جائز ہو سکتی ہے؟''۔

(مروج الذهب ج٣ ص٣٩)

مروج الذھب کی سند کے بعض راویوں کے حالات نہیں مل سکے، تاہم حضرت صعصعہ بن صوحان ﷛ کے اِس قول کی تائید سیدنا عمر ﷛ کے اُس قول سے ہو جاتی ہے جو گذشتہ سطور میں لکھا جا چکا ہے۔

خلیفہ اور بادشاہ ایک واضح فرق

حضرت صعصعہ ﷛ کے قول سے خلیفہ اور بادشاہ کا فرق بھی معلوم ہو گیا کہ خلیفہ وہ ہوتا ہے جس کو لوگ اپنی رضا و رغبت کے ساتھ لوگوں میں سے منتخب کریں، اور جو شخص خود کوشش کر کے اور لڑ جھگڑ کر اقتدار تک پہنچے تو وہ خلیفہ نہیں بلکہ بادشاہ ہوتا ہے۔ اِس پر مزید گفتگو کتاب کے آخر میں آئے گی۔

مولا علی علیہ السلام کا موقف

سیدنا مولیٰ علی ﷛ بھی طلقاء کو خلافت کا اہل نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ اُنہوں نے معاویہ کو جو خط لکھا تھا اُس میں فرمایا تھا کہ وہ بھی اہل حجاز کی طرح خلیفہ برحق کی بیعت و اطاعت کرے تو اُس میں ایک جملہ یہ بھی مرقوم تھا:

وَاعْلَمْ بِأَنَّکَ مِنَ الطُّلَقَاءِ الَّذِیْنَ لَا یَحِلُّ لَهُمُ الْخِلَافَةُ.

''اور جان لو کہ تم اُن طلقاء میں سے ہو جن کے لیے خلافت جائز نہیں ہے''۔

(إكمالُ إكمال المعلم شرح صحيح مسلم للوشتاني الأبي ج٦ ص ٤٤٥؛ شرح صحيح مسلم للسعيدي ج٥ ص ٨٠٥؛ تاريخ الطبري ج٥ ص٨)

فاروقِ اعظم ﷛ کی ندامت

سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام بھی معاویہ کو خلافت کے قابل نہیں سمجھتے تھے۔ اُن کے الفاظ عنقریب پیش کیے جائیں گے۔ اِس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا معاویہ کو خلافت کا اہل قرار دینا عدم تدبر پر مبنی ہونے کی وجہ سے لائق التفات نہیں۔ خود انصاف فرمائیے! جو بات سیدنا عمر، سیدنا ابن عباس، ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ، سیدنا عبدالرحمان بن غنم، سیدنا صعصعہ بن صوحان، مولیٰ علی اور سیدنا امام حسن مجتبیٰ ﷛ ایسے اکابر کی تصریحات کے خلاف ہو، وہ کیونکر قابل قبول ہو سکتی ہے؟

یہاں کوئی شخص سوال کرسکتا ہے کہ پھر سیدنا عمر﷛ نے معاویہ کو مصر کا گورنر کیوں مقرر کیا تھا؟اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اپنے اس فعل پر اپنی زندگی کے آخری ایام میں نادم ہوگئے تھے۔ چنانچہ مولانا شبیر احمد عثمانی اور دوسرے محدثین لکھتے ہیں:

وَتَطَاوَلَ عَمْرُو بْنُ الْعَاصِ لِلشُّوْرىٰ ، فَقَالَ لَه عُمَرُ: اِطْمَئِنَّ كَمَا وَضَعَکَ اللّٰهُ ، وَاللّٰهِ لَا جَعَلْتُ فِيْهَا حَمَلَ السَّلَاحَ عَلىٰ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ، وَقَالَ مَرَّةً: إِنَّ هٰذَا الْأَمْرَ لَا يَصْلَحُ لِلطُّلَقَاءِ وَلَا لِأَبْنَاءِ الطُّلَقَاءِ ، وَلَوْ اِسْتَقْبَلْتُ مِنْ أَمْرِيْ مَا اسْتَدْبَرْتُ مَا جَمَعْتُ لِيَزِيْدَ بْنِ أَبِيْ سُفْيَانَ وَمُعَاوِيَةَ بْنِ أَبِيْ سُفْيَانَ وِلَايَةَ الشَّامِ.

''عمرو بن العاص نے شوریٰ (میں شمولیت) کی آرزو کی تو سیدنا عمر﷛ نے اُنہیں فرمایا: وہیں رہو، جہاں اللہ تعالیٰ نے تمہیں رکھا ہے۔ بخدا! میں اس معاملہ میں کسی ایسے شخص کو شامل نہیں کروں گا جس نے رسول اللہ ﷺ کے مقابلہ میں ہتھیار اُٹھائے تھے، نیز فرمایا: طلقاء اور طلقاء کی اولاد کارِ حکومت کے لائق نہیں، اور اگر مجھے موجودہ صورتِ حال پہلے سمجھ آجاتی تو میں یزید بن ابوسفیان اور معاویہ بن ابوسفیان کے لیے شام کی حکومت جمع نہ کرتا''۔

(فتح الملهم ج٤ ص١١٨؛ إكمال إكمال المعلم ج٢ ص٤٧٤؛ مكمل إكمال الإكمال ج ٢ ص٤٧٤؛ الكوكب الوهاج ج٨ ص٢٠٧)

یزید بن ابی سفیان کو گورنر کیوں بنایا؟

پھر کوئی شخص سوال کرسکتا ہے کہ معاویہ کے بھائی یزید بن ابی سفیان بھی تو طلقاء میں سے تھے اور اُنہیں سیدنا ابوبکر﷛ نے مصر کا گورنر بنایا تھا۔ اگر طلقاء کو کوئی منصب سونپنا جائز نہ ہوتا تو سیدنا ابوبکر﷛ یزید بن ابی سفیان کو کیوں گورنر بناتے؟ چونکہ یہ انتہائی حساس مقام ہے، لہٰذا اِس سوال کا جواب ایک آدھ جملہ میں دینا مشکل ہے، اِس کی تفصیل درجِ ذیل عنوان کے تحت ملاحظہ فرمائیے۔

بوجہ فہم کی عدم رسائی غیر مناسب فیصلہ

یوں محسوس ہوتا ہے کہ جب سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یزید بن ابی سفیان کو مصر کا گورنر مقرر کرنے کا فیصلہ کیا تو اُن کی فہم اُس خطرہ کو نہ بھانپ سکی جس کو بصیرتِ مرتضوی نے شروع سے ہی بھانپ لیا تھا۔اسی طرح سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی فہم بھی شروع شروع میں اِس خطرہ کو نہیں بھانپ سکی تھی، جیسا کہ آپ ابھی ابھی پڑھ چکے ہیں کہ اُنہوں نے پہلے معاویہ کو گورنر مقرر کیا مگر اپنی زندگی کے آخری ایام میں اُس تقرر پر نادم ہوئے۔

فہمِ صحابہ اور فہمِ مرتضوی رضی اللہ عنہ

دراصل ذہانت وفطانت، حکمت وبصیرت اور فہم وذکاوت کی جو فراوانی بنو ہاشم کو عطا ہوئی تھی وہ قریش کو حاصل نہیں تھی، پھر بطفیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بنو ہاشم میں سے سیدنا علی علیہ السلام کے حصے میں جو حکمت آئی تھی وہ کسی بھی ہاشمی اور غیر ہاشمی کو نصیب نہیں ہوئی تھی، حتیٰ کہ پوری امت کو حکمت کے دس حصوں میں سے ایک حصہ عطا ہوا اور باقی نو حصے تنہا مولیٰ رضی اللہ عنہ کے حصے میں آئے، یہی وجہ ہے کہ کسی بھی معاملہ اور فیصلہ کی تہہ تک جس سرعت سے بصیرتِ مرتضوی پہنچتی تھی دوسری کوئی بصیرت نہیں پہنچتی تھی۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اُن کی ایسی غیر معمولی فہم وبصیرت پر حیرت زدہ رہتے تھے، حتیٰ کہ وہ پوچھنے پر مجبور ہوگئے تھے کہ کیا آپ کو قرآن کے علاوہ کوئی اور چیز بھی دی گئی ہے جو دوسروں کو نہ دی گئی ہو، جیسا کہ بخاری شریف وغیرہ میں ہے۔اِسی حقیقت کو بعض سلفی علماء نے یوں بیان کیا ہے:

هٰذَا أَمِيرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ـ عليه السلام ـ أُخْتُصَّ مِنْ بَيْنِ الصَّحَابَةِ وَالْقَرَابَةِ بِالْعِلْمِ الَّذِيْ لَمْ يُمَاثَلْ فِيْهِ ، وَلَمْ يُشَارَكْ وَلَمْ يُشَابَهْ فِيْهِ ، وَلَمْ يُقَارَبْ ، بِحَيْثُ إِنَّهُ لَمْ يُعْلَمْ ـ بَعْدَ الْأَنْبِيَاءِ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ ـ نَظِيْرٌ لَهُ فِيْ عِلْمِهِ ، الَّذِيْ حَيَّرَ الْعُقُوْلَ ، وَأَسْكَتَ الْوَاصِفِيْنَ ، إِلٰى أَنْ قَالَ... إِنَّمَا هِيَ مِنَحٌ رَبَّانِيَّةٌ ، وَمَوَاهِبُ لَدُنِّيَّةٌ ، وَلِكَثْرَةِ عِلْمِهِ عليه السلام أُتُّهِمَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلى الله عليه وآله وسلم أَخْبَرَهُ مِنَ الشَّرِيْعَةِ بِمَا أَخْفَاهُ عَنِ النَّاسِ ، فَسَأَلَهُ رَجُلٌ : مَا الَّذِيْ

أَسَرَّ إِلَيْكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ؟ فَغَضِبَ ، وَقَالَ : وَاللّٰهِ مَا أَسَرَّ إِلَيَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ شَيْئًا كَتَمَهُ عَنِ النَّاسِ ، وَإِنَّمَا عِنْدَنَا كِتَابُ اللّٰهِ ، وَشَيْءٌ مِّنَ السُّنَّةِ ذَكَرَهُ علیہ السلام ، أَوْفَهْمٌ أُوْتِيَهُ رَجُلٌ.

''یہ امیر المومنین (سیدنا علی) علیہ السلام ہیں جو صحابہ واہل بیت کے مابین علم میں اس قدر مخصوص تھے کہ اُس میں اُن کا کوئی مدمقابل، کوئی شریک، کوئی مشابہ اور کوئی قریب بھی نہیں تھا، علم میں جو اُن کی حیثیت تھی انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد اُس کی نظیر نہیں جانی گئی، اُن کے علمی مقام نے عقلوں کو حیران اور بیان کرنے والوں کو ششدر کر رکھا تھا۔ یہ محض ربانی عطائیں اور فیوضات الٰہیہ ہیں۔ علمی فراوانی کی وجہ سے اُن پر شک کیا جانے لگا کہ شاید رسول اللہ ﷺ نے اُنہیں شریعت کے کچھ ایسے امور بتلائے ہیں جو دوسروں سے مخفی رکھے گئے۔ چنانچہ بعض لوگوں نے اُن سے سوال کیا: آپ کو رسول اللہ ﷺ نے مخفی طور پر کیا کیا بتایا؟ اس پر اُنہوں نے غضب ناک ہو کر فرمایا: اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ نے مجھے ایسا کچھ نہیں بتایا جسے دوسرے لوگوں سے چھپایا ہو، ہمارے پاس فقط اللہ عزوجل کی کتاب، رسول اللہ ﷺ کی بیان فرمودہ احادیث یا وہ فہم ہے جو کسی شخص کو عطا کی جاتی ہے''۔

(العواصم والقواصم فی الذب عن سنة أبی القاسم، لابن الوزیر الیمانی ج۱ ص ۲۴۱)

علامہ موصوف ایک اور مقام میں لکھتے ہیں:

أَلَا تَرٰى أَنَّ أَبَابَكْرٍ وَعُمَرَ وَعُثْمَانَ وَكَثِيْرًا مِنَ الصَّحَابَةِ كَانُوْا مُجْتَهِدِيْنَ، وَلَمْ يَكُوْنُوْا فِي الرُّسُوْخِ فِي الْعِلْمِ كَأَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ.

''کیا آپ نے غور نہیں کیا کہ حضرت ابوبکر، عمر، عثمان اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کافی حضرات مجتہدین تھے، لیکن اُنہیں امیر المومنین کی طرح علم میں رسوخ حاصل نہیں تھا''۔

(العواصم والقواصم فی الذب عن سنة أبی القاسم ج۸ ص ۲۶۵)

انبیاء کرام علیہم السلام میں تفاوتِ فہم

ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو ذہن میں یہ اشکال پیدا ہو کہ سیدنا مولیٰ علی علیہ السلام فہم، قوتِ فیصلہ اور علمی رسوخ میں جمیع صحابہ خصوصاً بزرگ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کیونکر فائق و برتر ہو سکتے ہیں۔ اِس سلسلے میں گزارش ہے کہ یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے، کیونکہ اِن باتوں میں تو انبیاء کرام علیہم السلام میں بھی تفاوت ہوتا ہے، حتیٰ کہ قرآن مجید میں ایسے دو نبیوں کا ذکر کیا گیا ہے جو باپ بیٹا تھے لیکن بیٹا قوتِ فیصلہ اور فہم میں اپنے والد سے بھی زیادہ تھا۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَدَاوُوْدَ وَسُلَيْمَانَ إِذْ يَحْكُمَانِ فِي الْحَرْثِ إِذْ نَفَشَتْ فِيهِ غَنَمُ الْقَوْمِ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شَاهِدِيْنَ. فَفَهَّمْنَاهَا سُلَيْمَانَ وَكُلًّا آتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا.

''اور یاد کرو داود و سلیمان (علیہما السلام) کو جب وہ فیصلہ کر رہے تھے ایک کھیتی کے جھگڑے کا جب رات کے وقت چھوٹ گئیں اس میں قوم کی بکریاں، اور ہم ان کے فیصلے کا مشاہدہ کر رہے تھے، سو ہم نے سمجھا دیا وہ معاملہ سلیمان کو، اور ان سب کو ہم نے بخشا تھا حکم اور علم''۔

(سورۃ الأنبیاء علیہم السلام: ۷۸، ۷۹)

پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''ایک شخص کی بکریاں رات کے وقت کسی کھیت میں گھس گئیں اور اسے اُجاڑ کر رکھ دیا۔ کھیت والا دادرسی کے لیے حضرت داود (علیہ السلام) کی خدمت میں حاضر ہوا، بکریوں کے مالک کو بھی بلایا گیا۔ دونوں کے بیان سن کر آپ نے فیصلہ کیا کہ بکریاں کھیت والے کو دے دی جائیں تا کہ اس کے نقصان کی تلافی ہو سکے۔ کیونکہ کھیت کا جو نقصان ہوا تھا بکریوں کی قیمت اندازاً اس کے لگ بھگ تھی۔ حضرت سلیمان (علیہ السلام جو ابھی کمسن تھے) نے جب یہ فیصلہ سنا تو کہا کہ اس سے بھی فیصلہ کی ایک بہتر صورت

ہو سکتی ہے، کہ بکریاں عارضی طور پر کھیت والے کو دے دی جائیں، وہ ان کا دودھ پیے اور دوسرے فوائد حاصل کرے اور بکریوں والے کو حکم دیا جائے کہ وہ اس اُجڑے ہوئے کھیت کی نگرانی اور حفاظت کرے۔ جب کھیت اپنی اصلی حالت پر آجائے تو کھیت والے کو اُس کا کھیت دے دیا جائے اور بکریوں کا مالک اپنی بکریاں لے لے۔ یہ فیصلہ سن کر حضرت داود (علیہ السلام) کی خوشی کی انتہا نہ رہی، چنانچہ اسی کے مطابق عمل کیا گیا"۔

(ضیاء القرآن ج۳ص۱۷۷)

کتبِ صحاح میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے اپنے والد سے زیادہ فہیم ہونے کا ایک اور واقعہ بھی آیا ہے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان فرمایا:

"دو عورتیں تھیں، اُن میں سے ہر ایک کے ساتھ اپنا اپنا بچہ تھا۔ بھیڑیا آیا اور ان میں سے ایک کے بچے کو کھا گیا۔ ایک نے دوسری سے کہا: بھیڑیے نے تمہارے بچے کو کھایا ہے، دوسری نے کہا: نہیں، بلکہ تمہارے بچے کو کھایا ہے۔۔۔۔ دونوں سیدنا سلیمان علیہ السلام کے پاس فیصلہ کے لیے گئیں تو انہوں نے فرمایا: چھری لاؤ، میں اس بچے کے دو ٹکڑے کر دیتا ہوں۔ اس پر چھوٹی عورت کہنے لگی: أَتَشُقُّهُ (آپ اس کے دو ٹکڑے کر دیں گے؟) فرمایا: ہاں، کہنے لگی: **لَا تَفْعَلْ حَظِّيْ مِنْهُ لَهَا ، قَالَ: هُوَ اِبْنُكَ، فَقَضىٰ بِهٖ لَهَا** (ایسا نہ کریں، میرا حصہ بھی اسی کا ہو گیا، اس پر سلیمان علیہ السلام نے فرمایا: یہ بچہ تمہارا ہی ہے، پھر اُسی کے حق میں فیصلہ دے دیا"۔

(بخاري: كتاب أحاديث الأنبياء، باب قول الله تعالىٰ: وَوَهَبْنَا لِدَاوُدَ سُلَيْمَانَ إلخ، ص٤٦٨ حديث٣٤٢٧؛ مسلم: كتاب الأقضية، باب بيان اختلاف المجتهدين، ص٨٢٢ حديث ١٧٢٠؛ سنن النسائي: كتاب آداب القضاة، باب حكم الحاكم بعلمه، ص٨١٢، ٨١٣ حديث٥٤٠٣، ٥٤٠٤)

غور فرمایئے! حضرت داود علیہ السلام صاحبِ کتاب تھے، اُنہیں زبور شریف دی گئی تھی اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے والد گرامی تھے مگر قوتِ فیصلہ اور کسی معاملہ کی کنہ (حقیقت) تک پہنچنے میں اُن کے لختِ جگر اُن سے زیادہ تھے۔ اسی طرح اگرچہ سیدنا مولیٰ علی علیہ السلام عمر میں سیدنا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے چھوٹے تھے مگر عقل، علم، قرآن فہمی، حکمت، ذکاوت، فراست، قوتِ قضاء و فیصلہ اور معاملہ کی تہہ تک پہنچنے میں اُن سے بہت بڑھ کر تھے۔

بعض طلقاء اقتدار پر کیسے پہنچے؟

جب قرآن وسنت کی روشنی میں معلوم ہوگیا کہ انسانوں کا فہم میں متفاوت ہونا ایک اٹل حقیقت ہے اور بسا اوقات کم عمر شخص فہم وفراست میں اکابر پر فائق ہوتا ہے۔ سو اگر کتاب وسنت کی اِس روشنی میں دیکھا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جب سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یزید بن ابی سفیان کو مصر کا گورنر مقرر کیا تو اُن کی فہم وہاں تک نہ پہنچ سکی جہاں تک سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی فہم مرحلۂ اول میں پہنچ گئی تھی۔ فرق یہ ہے کہ سیدنا داود علیہ السلام کے فیصلہ پر فوراً آیت نازل ہوگئی اور سیدنا سلیمان علیہ السلام کا فیصلہ نافذ ہوگیا۔ اگر سیدنا داود علیہ السلام کا فیصلہ برقرار رہتا تو مذکور الصدر حدیث میں جس بچے کا ذکر ہوا ہے وہ ہمیشہ کے لیے اُس عورت کے پاس رہتا جو کہ حق دار نہیں تھی۔ سو چونکہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے فیصلہ پر نہ کوئی وحی نازل ہونا تھی اور نہ ہی سیدنا سلیمان علیہ السلام کی طرح اُن کے فیصلہ کے سامنے کسی دوسرے فیصلہ کا آنا منقول ہے، اس لیے اُن کا فیصلہ برقرار رہا اور اُس کی بدولت یزید بن ابی سفیان تاحیات مصر کے گورنر رہے۔ امام ذہبی لکھتے ہیں:

وَلَمَّا احْتُضِرَ، اِسْتَعْمَلَ أَخَاهُ مُعَاوِيَةَ عَلٰى عَمَلِهِ، فَأَقَرَّهُ عُمَرُ عَلٰى ذٰلِكَ.

”جب اُن کی وفات کا وقت قریب آیا تو اُنہوں نے اپنے بھائی معاویہ کو اپنے کام پر مقرر کردیا، پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اُنہیں اس پر قائم رکھا“۔

(سیر أعلام النبلاء ج۱ ص ۳۳۰)

یزید بن ابی سفیان کا سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نافرمانی کرنا

نہیں معلوم کہ منکرینِ خلافتِ راشدہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اِس فیصلہ کو کس نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یزید بن ابی سفیان کو گورنر مقرر کرتے وقت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر یزید بن ابی سفیان کا غیر مستحق ہونا اُسی طرح مخفی رہا جس طرح سیدنا داود علیہ السلام پر مذکور الصدر دو عورتوں میں سے بڑی عورت کا غیر مستحق ہونا مخفی رہا۔

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا اتباعِ ہوا سے مبراء ہونا

ہر چند کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یزید بن ابوسفیان کو شام کا گورنر مقرر کیا تھا لیکن اس سلسلے میں وہ خواہشِ نفس کی پیروی سے منزہ و مبراء تھے۔ میرے اس دعویٰ کی دلیل یہ حدیث ہے۔ امام احمد لکھتے ہیں:

عَنْ يَزِيْدَ بْنِ أَبِي سُفْيَانَ قَالَ قَالَ أَبُوْبَكْرٍ رضی اللہ عنہ حِيْنَ بَعَثَنِي إِلَى الشَّامِ: يَا يَزِيْدُ! إِنَّ لَکَ قَرَابَةً عَسَيْتَ أَنْ تُؤْثِرَهُمْ بِالإِمَارَةِ، وَذٰلِکَ أَكْبَرُ مَا أَخَافُ عَلَيْکَ، فَإِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: مَنْ وَلِيَ مِنْ أَمْرِ الْمُسْلِمِيْنَ شَيْئًا فَأَمَّرَ عَلَيْهِمْ أَحَدًا مُحَابَاةً فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ، لَا يَقْبَلُ مِنْهُ صَرْفًا وَّلَا عَدْلًا حَتّٰى يُدْخِلَهُ جَهَنَّمَ.

"یزید بن ابوسفیان بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جب مجھے شام بھیجا تو فرمایا: اے یزید! یقیناً تمہارے رشتہ دار ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم امارت میں اُنہیں ترجیح دے دو، مجھے تمہارے بارے میں سب سے بڑا خدشہ یہی ہے۔ بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے مسلمانوں کے کسی معاملہ میں کسی کو باہمی محبت کی وجہ سے سربراہ مقرر کیا تو اُس پر اللہ کی لعنت ہو، اللہ تعالیٰ اُس کے نفل و فرض قبول نہیں فرمائے گا، یہاں تک کہ اُسے جہنم میں داخل فرما دے گا"۔

(مسند أحمد: من مسند أبي بكر رضی اللہ عنہ ج ١ ص ٢٠٢ حديث ٢١)

ہر چند کہ اس حدیث کی سند پر بعض لوگوں کو تحفظات ہیں، لیکن سیدنا ابوبکر صدیق ؓ کے ورع وتقویٰ کے پیش نظر قرین قیاس یہی ہے کہ اُنہوں نے یہ ارشاد ضرور فرمایا ہوگا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود اُن کا یزید بن ابوسفیان کو مقرر کرنا قرابت داری یا یاری کی وجہ سے نہیں تھا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ طلقاء تو کسی منصب کے لائق ہی نہیں تھے تو پھر اُنہوں نے یزید بن ابوسفیان کو گورنر کیوں بنایا؟ اِس کا جواب وہی ہے جو ہم ابھی ابھی بیان کر چکے ہیں کہ اُس وقت اُن کی فہم طلقاء کے غیر مستحق ہونے کی طرف اُسی طرح نہیں جا سکی تھی جس طرح سیدنا عمر ؓ کی فہم نہیں پہنچ سکی تھی مگر بعد میں وہ نادم ہوئے تھے۔

علامہ نبہانی کے کلام سے یہ تأثر ملتا ہے کہ چونکہ نبی کریم ﷺ اپنے آخری ایام میں طلقاء کو دوسروں سے زیادہ عطا فرماتے رہے تا کہ وہ مائل بہ اسلام ہوں، اس لیے سیدنا ابوبکر ؓ اُس سیرت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس خاندان کو مناصب پر فائز کر بیٹھے۔ وَكَانَ أَبُوبَكْرٍ ؓ يُجِلُّهُمْ أَيضاً وَيُدَارِيهِمْ اقْتِدَاءً بِالنَّبِيِّ ﷺ وَيُؤَمِّرُ مِنهُمُ الأُمَرَاءَ ، وَهُوَ الَّذِي أَمَّرَ يَزِيدَ بْنَ أَبِي سُفْيَانَ...

(الأساليب البديعة مع شواهد الحق ص ٣٩٤)

بہر حال یزید بن ابی سفیان کے تقرر میں سیدنا ابوبکر صدیق ؓ کی فہم بروقت اُسی طرح نہیں پہنچ سکی تھی جس طرح سیدنا داود علیہ السلام کی فہم بروقت نہیں پہنچ سکی تھی مگر اُن کے فرزند کی فہم بروقت پہنچ گئی تھی اور کارگر بھی ثابت ہوئی تھی۔

معاویہ کی معزولی اور بغاوت

سیدنا علی المرتضیٰ ؓ طلقاء کو کسی منصب کے لیے اہل نہیں سمجھتے اسی لیے خلیفہ منتخب ہونے کے فوراً بعد اُنہوں نے طلقاء کی معزولی کا حکم جاری کر دیا۔ چونکہ معاویہ بھی طلقاء میں سے تھے، لہٰذا اُنہیں بھی معزولی کا آرڈر لکھ بھیجا اور اُس میں صاف صاف لکھا کہ تم طلقاء میں سے ہو اور طلقاء کے لیے خلافت جائز نہیں ہے مگر چونکہ وہ گزشتہ پندرہ سال سے مسلسل ایک ہی مقام پر گورنر کے عہدے پر براجمان تھے اور طاقت حاصل کر چکے تھے اِس لیے اُنہوں نے معزولی کے حکم کو مسترد کر دیا اور بہانہ یہ بنایا کہ اُن کے رشتہ دار (حضرت عثمان بن عفان ؓ) کو ناحق شہید کر دیا گیا ہے، لہٰذا اُن کے قاتلین کو اُن کے سپرد کیا جائے وہ اُن قاتلین

کوقصاص میں قتل کریں گے پھر خلیفۂ وقت کی بیعت کریں گے۔ اُن کی یہ بہانہ بازی درحقیقت ہٹ دھرمی تھی اور ہٹ دھرمی کا سبب اُن کی وہ طاقت تھی جو پچھلے پندرہ سولہ سالوں میں اُنہیں مسلسل ایک ہی مقام پر گورنر رہنے کی وجہ سے حاصل ہوئی تھی۔ اگر اُنہیں وہ قوت حاصل نہ ہوتی تو وہ قطعاً معزولی سے انکار نہ کرتے۔ بے طاقت شخص ہٹ دھرمی نہیں کرسکتا، اسی لیے حدیث میں اُن کے گروہ کو باغی کہا گیا ہے اور باغی گروہ ہوتا ہی وہی ہے جو لڑنے کی طاقت رکھتا ہو۔ چنانچہ امام عبداللہ بن محمود موصلی حنفی، امام ابن عابدین شامی حنفی اور امام عینی حنفی لکھتے ہیں:

وَأَهْلُ الْبَغْيِ: كُلُّ فِئَةٍ لَّهُمْ مَنَعَةٌ ، يَتَغَلَّبُوْنَ وَيَجْتَمِعُوْنَ وَيُقَاتِلُوْنَ أَهْلَ الْعَدْلِ بِتَأْوِيْلٍ ، يَقُوْلُوْنَ : الْحَقُّ مَعَنَا.

''اہل بغاوت ہر وہ گروہ ہے جو غلبہ پانے، اکٹھ کرنے اور اہل عدل کے ساتھ تاویلاً جنگ کرنے کی طاقت رکھتا ہو اور کہتا ہو کہ حق ہمارے ساتھ ہے''۔

(الاختيار لتعليل المختار ج٤ ص ١٠٠ ؛ ردالمحتار ج٦ ص ٤١٢ ؛ البناية للعيني ج٧ ص ٢٩٨)

شیخ محمد زکریا انصاری شافعی لکھتے ہیں:

الْبُغَاةُ : هُمْ مُخَالِفُوْا إِمَامٍ بِتَأْوِيْلٍ بَاطِلٍ ظَنًّا وَشَوْكَةً لَّهُمْ.

''وہ طاقت ور لوگ جو گمان کی پیروی میں باطل تاویل کے ساتھ امام کی مخالفت کریں باغی ہیں''۔

(منهج الطلاب للزكريا الشافعي ص ١٥٧ ؛ كفاية الأخيار للحصني الشافعي ص ٦٣٦)

یہاں باغیوں کی تاویل کا حقیقۃً باطل ہونا مراد ہے، ورنہ ظاہراً تو باغیوں کی تاویل خوش گوار ہوتی ہے، اگر ظاہراً اُن کی تاویل خوبصورت نہ ہو تو لوگ اُن کی حمایت میں کیوں جمع ہوں؟ ان شاء اللہ اِس کی مکمل تحقیق یہ عاجز اپنی کتاب ''الفئة الباغية'' میں سپردِ قلم کرے گا۔

فی الجملہ یہ کہ معاویہ کی تمام تر بغاوت کا سبب وہ طاقت وشوکت تھی جو وہ شام پر مسلسل گورنری کی وجہ سے حاصل کر چکے تھے، اور اب اُنہیں اُس طاقت کے استعمال کے لیے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے

قصاص کا بہانہ بھی مل گیا تھا، اُن کا اصل ہدف حصولِ اقتدار تھا اور بہانہ قصاصِ عثمان رضی اللہ عنہ تھا، جیسا کہ سیدنا علی، سیدنا عمار بن یاسر اور دوسرے کئی اکابر رضی اللہ عنہم نے تصریح فرمائی ہے، بلکہ یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ لوگ خود چاہتے تھے کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ قتل کر دیے جائیں، جیسا کہ عنقریب باحوالہ گھر کی گواہی آ رہی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ طلقاء لوگ کسی بھی منصب کے لیے اہل نہیں تھے، اسی لیے سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے خلافت سنبھالتے ہی اُن کی معزولی کا حکم کر دیا تھا۔ بعض متأخرینِ ہند کا اُنہیں خلافت کا اہل لکھنا سیدنا عمر، سیدنا علی، ام المومنین سیدہ عائشہ، سیدنا ابن عباس، سیدنا عبدالرحمان بن غنم اشعری اور سیدنا صعصعہ بن صوحان رضی اللہ عنہم کی تصریحات کے خلاف ہونے کی وجہ سے لائقِ التفات نہیں۔

اُمتِ مسلمہ کی تقسیم کا سببِ اوّل

یہی وجہ ہے کہ جن علماء حق نے شخصیات کے تصور سے بالاتر ہو کر مسلمانوں کے عروج و زوال پر تحقیق کی ہے تو اُنہوں نے اُمتِ مسلمہ کی وحدت کے پارہ پارہ ہونے کا واحد سبب ہی اسی نااہلی کو قرار دیا ہے۔ کاش! سیدنا عمر رضی اللہ عنہ پر جو حقیقت اُن کی زندگی کے آخری ایام میں عیاں ہوئی تھی وہ اُن پر پہلے عیاں ہو جاتی تو وہ طلقاء کو منصب دیتے اور نہ ہی اُنہیں منصب پر قائم رکھتے۔ کاش! سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی فہم، فہمِ داودی کی بجائے بروقت فہمِ سلیمانی کی طرح کام کرتی اور اُن سے بعض طلقاء کی نااہلی اوجھل نہ رہتی تو وہ طلقاء کو منصب نہ سونپتے، لیکن اللہ عزوجل ﴿فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ﴾ ہے، وہی ہوتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ ہائے افسوس! فہمِ صدیقی فہمِ داودی کی طرح بروقت حقیقت کو نہ پا سکی اور نہ ہی اُس وقت کوئی فہمِ سلیمانی آڑے آئی تو وہ کچھ ہو گیا جس کا ہونا مقدر تھا۔ خلاصہ یہ ہے کہ سہواً ہی سہی مگر جب کوئی نااہل منصب پر پہنچ جائے تو کبھی نہ کبھی اُس کی نااہلی ضرور رنگ لاتی ہے اور کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی کو اُس کا خمیازہ ضرور بھگتنا پڑتا ہے۔ سو چونکہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ زود فہمی اور قرآن دانی میں سب پر فائق تھے اور اُنہوں نے اپنی باری میں بعض نااہل طلقاء کو اُس وقت معزول کیا جب وہ طاقت اختیار کر چکے تھے تو وہ بھر گئے اور قصاص کا بہانہ بنا کر بغاوت پر اتر آئے۔

نااہل کو منصب سونپنے کا نتیجہ

مملکت اسلامیہ پاکستان کے حالات میں ہی غور کر کے جائزہ لیجئے! بعض جرنیلوں نے بعض نااہلوں کے لیے اقتدار کی راہ ہموار کی اور اُسی ہمواریٔ راہ کی بدولت وقتاً فوقتاً وہ دوتین دہائیاں اقتدار پر براجمان رہے تو ملک کھوکھلا ہونا شروع ہوگیا، پھر وہ اقتدار وراثت میں تبدیل ہونے لگا تو بعض دانایانِ امت نے متنبہ کیا کہ ''سیاست نہیں، ریاست بچاؤ!'' اور فرمایا کہ اگر یہ نااہل لوگ رہ گئے تو ملک کا خدا ہی حافظ ہے۔ خود ہی سوچئے! پاکستان کے اُن نااہل لوگوں کے پنجے سے ملک چھڑانا کتنا مشکل ہوگیا؟ آخر نبی کریم ﷺ نے یونہی تو نہیں فرمایا تھا:

إِذَا وُسِّدَ الْأَمْرُ إِلَىٰ غَيْرِ أَهْلِهِ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ.

''جب معاملہ نالائق کو سونپ دیا جائے تو قیامت کا انتظار کرو''۔

(بخاري ص ١٦ حديث ٥٩)

بعض طلقاء کو اقتدار کیا ملا کہ اُمت قیامت تک کے لیے عذاب میں مبتلا ہوگئی۔ یزید بن ابی سفیان نے اپنے بھائی معاویہ کو اقتدار سونپ دیا، معاویہ کو اہل فہم حضرات نے ہٹانا چاہا تو وہ لڑنے مرنے پر تیار ہوگیا، پھر معاویہ نے وہ اقتدار اپنے بیٹے یزید کو سونپ دیا، اُس خبیث کو اہل حق نے ہٹانا چاہا تو وہ بھی لڑنے مرنے پر تیار ہوگیا، حتیٰ کہ خانوادۂ نبوی کو تہ تیغ کر دیا اور بیت اللہ شریف اور مسجد نبوی تک کو نہ بخشا۔ نتیجۃً امت کئی فرقوں میں تقسیم ہوگئی۔ تقریباً چودہ سو سال گذر چکے ہیں مگر امت اُس نااہلی کی نحوست سے نہیں نکل سکی، اور یقیناً سیدنا امام مھدی علیہ السلام کی تشریف آوری تک اِس نحوست و مصیبت سے نجات ملنا ممکن نہیں۔ یہاں پہنچ کر پھر یہ حقیقت عیاں ہوگئی کہ بعض متأخرین ہند کا طلقاء کو لائقِ خلافت سمجھنا قرآن وسنت اور تصریحاتِ اسلافِ امت کے خلاف ہے۔

کیا معاویہ کو اختیار (پسند) کیا گیا تھا؟

بعض متأخرینِ ہند نے کہیں تو یہ لکھا:

''امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اگر خلافت کے اہل نہ ہوتے (تو) امام مجتبیٰ ہرگز اُنہیں تفویض نہ فرماتے''۔

جیسا کہ پہلے بھی یہ جملہ نقل ہو چکا ہے، اور کہیں سوالیہ انداز میں یوں لکھا:

''اگر مدت خلافت ختم ہو چکی تھی اور آپ بادشاہت منظور نہیں فرماتے تو صحابہ حجاز میں کوئی اور قابلیتِ نظم و نسقِ دین نہ رکھتا تھا جو اُنہیں کو اختیار کیا؟''۔

(فتاوی رضویہ ج۲۹ ص۳۷۸)

اِن دو مقامات پر بعض متاخرین ہند کا لفظ ''تفویض'' اور لفظ ''اختیار'' استعمال کرنا درست نہیں ہے، امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے معاویہ کو اقتدار تفویض نہیں کیا تھا بلکہ مجبوراً دست بردار ہوئے تھے، اور اسی طرح اُنہوں نے معاویہ کو اختیار بھی نہیں کیا تھا۔ لفظ اختیار کا معنیٰ ہے:

''چن لینا اور انتخاب کرنا''۔

(مصباح اللغات للبلیاوي ص ۲۲۵)

کسی چیز کا چناؤ اور انتخاب مختلف چیزوں میں سے ہوتا ہے، امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے متعدد صحابہ اور تابعین کرام رضی اللہ عنہم میں سے معاویہ کو نہ تو چنا تھا اور نہ ہی اُسے منتخب کیا تھا لیکن تعجب ہے کہ اعلیٰ حضرت ایسے زیرک انسان بھی امام حسن رضی اللہ عنہ کی مجبوری کو چناؤ اور انتخاب تصور کر بیٹھے اور یہاں تک لکھ دیا:

''صحابہ حجاز میں کوئی اور قابلیتِ نظم و نسقِ دین نہ رکھتا تھا جو اُنہی کو اختیار کیا؟''۔

میں کہتا ہوں: یقیناً اُس وقت حجازِ مقدس وغیرہ مقامات پر جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حیات تھے، مثلاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ماموں سیدنا سعد بن ابی وقاص، سیدنا عمر کے چچازاد سیدنا سعید بن زید (دونوں سابقین اور عشرہ مبشرہ میں سے ہیں) ترجمان القرآن اور حبر الامہ سیدنا ابن عباس، پیکر زھد ورع ابن عمر، میزبانِ رسول سیدنا ابوایوب انصاری، خادم رسول سیدنا انس، بے باک اور حق گو صحابی عبدالرحمان بن ابی بکر، وِعَائَین (دو بھاری علموں) کے امین حضرت ابو ہریرہ وغیرھم رضی اللہ عنہم موجود تھے، لیکن ان میں سے کسی کو بھی بادشاہ بنانے سے فتنہ ختم نہ ہوتا، کیونکہ جو شخص امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں مسلح لشکر لے کر آیا تھا، اُس کا منشا یہ نہیں تھا

کہ امام حسن کی جگہ کسی دوسرے شخص کو منتخب کیا جائے بلکہ وہ خود ہی کو مکمل اقتدار پر دیکھنا چاہتا تھا، اِس لیے امام پاک نے تحفظِ مسلمین کی خاطر مجبوراً اقتدار اُس کو دے دیا۔

اقتدار کے لیے معاویہ کی تیاریاں اور کوششیں

معاویہ بن ابی سفیان مدتوں سے اقتدار کے لیے پر تول رہے تھے حتیٰ کہ ایسے آثار بھی ملتے ہیں کہ وہ شیخین کریمین رضی اللہ عنہما کے وقت سے اقتدار کی تیاریوں میں تھے۔ چنانچہ امام نعیم بن حماد لکھتے ہیں:

عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ سِيْرِيْنَ قَالَ: وَاللّٰهِ إِنِّيْ لَأُرَاهُ كَانَ يَتَصَنَّعُ لَهَا - يَعْنِيْ مُعَاوِيَةَ - عَلٰى عَهْدِ أَبِيْ بَكْرٍ وَّعُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا - يَعْنِيْ لِلْخِلَافَةِ.

''محمد بن سیرین ﷫ بیان کرتے ہیں: اللہ کی قسم! میں سمجھتا ہوں کہ معاویہ سیدنا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے دور میں خلافت کے لیے تیاری کرتے تھے''۔

(کتاب الفتن ص١٢٨)

اس بات کا خدشہ خلیفہ ثانی سیدنا عمر بن خطاب ﷜ کو بھی تھا، چنانچہ وہ فرماتے تھے:

يَا أَصْحَابَ رَسُوْلِ اللّٰهِ! تَنَاصَحُوْا، فَإِنَّكُمْ إِنْ لَا تَفْعَلُوْا غَلَبَكُمْ عَلَيْهَا يَعْنِي الْخِلَافَةَ، مِثْلُ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ وَمُعَاوِيَةَ بْنِ أَبِيْ سُفْيَانَ.

''رسول اللہ ﷺ کے صحابیو! باہم اتحاد رکھو، اگر تم نے ایسا نہ کیا تو خلافت کے معاملہ میں عمرو بن العاص اور معاویہ بن ابوسفیان تم پر غالب آجائیں گے''۔

(کتاب الفتن ص١٢٨)

اگر کسی شخص کو امام نعیم بن حماد کی روایت میں تردد ہو تو ہم اُسے درج ذیل عبارت میں غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ محدث ابو یوسف یعقوب بن سفیان فسوی حضرت عثمان بن عفان ﷜ کے رضاعی بھائی اور مصر کے گورنر عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کے حالات میں لکھتے ہیں:

حَدَّثَنِيْ حَرْمَلَةُ قَالَ: أَخْبَرَنَا ابْنُ وَهْبٍ عَنِ ابْنِ لَهِيْعَةَ عَنْ يَزِيْدَ بْنِ أَبِيْ حَبِيْبٍ قَالَ: أَقَامَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ سَعْدٍ بِعَسْقَلَانَ، بَعْدَ قَتْلِ عُثْمَانَ، وَكَرِهَ

أَنْ يَكُونَ مَعَ مُعَاوِيَةَ ، وَقَالَ : لَمْ أَكُنْ لِأُجَامِعَ رَجُلًا قَدْ عَرَفْتُهُ ، إِنَّهُ كَانَ يَهْوِي قَتْلَ عُثْمَانَ ، فَكَانَ بِهَا حَتّٰى مَاتَ.

''مجھے حرملہ نے بیان کیا، اُنہوں نے کہا: ہمیں ابن وھب نے از ابن لھیعہ از یزید بن ابی حبیب روایت کیا کہ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح، سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد عسقلان میں رہنے لگا اور معاویہ کے ساتھ رہنا پسند نہ کیا اور کہا: میں اُس شخص کے ساتھ نہیں رہوں گا جس کے بارے میں مجھے معلوم ہے کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کا خواہاں تھا، پھر وہ عسقلان میں ہی وفات پا گیا''۔

(المعرفة والتاريخ للفسوي ج١ ص١٠٢، وط: ج١ ص٢٥٤؛ تاريخ دمشق ج٢٩ ص٤٢؛ سير أعلام النبلاء ج٣ ص٣٥)

اِس سند میں پانچ راوی ہیں: اِن میں سے ہر ایک کے متعلق علماء جرح وتعدیل کے اقوال کا خلاصہ ذہن میں رکھئے تا کہ کوئی بددیانت شخص اِن میں سے کسی کے بارے میں فقط جرح نقل کر کے اس اثر (قولِ صحابی) پر ہاتھ صاف کرنے کی کوشش نہ کرے۔ تعجب کی بات ہے کہ آج کل بعض ایسے لوگ مجھ عاجز کی کتب میں درج شدہ احادیث پر جرح کے شوق میں ہیں جن کی اپنی دینی دکان داری کی چمک دمک ہی موضوع روایات اور جھوٹے خوابوں پر موقوف ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے:

سورج میں لگے دھبہ، فطرت کے کرشمے ہیں
بت ہم کو کہیں کافر، اللہ کی مرضی ہے

بہر حال درجِ بالا روایت کے پہلے راوی یہ ہیں:

١۔ حرملہ بن یحییٰ ابوحفص تجیبی مصری، حافظ نے اِن کے متعلق لکھا ہے: ''صدوق'' (سچا ہے)۔

(تقريب التهذيب ص٢٢٩)

٢۔ عبداللہ بن وھب بن مسلم القرشی المصری: حافظ ان کے متعلق لکھتے ہیں:

الْفَقِيهُ ، ثِقَةٌ حَافِظٌ عَابِدٌ.

''یہ فقیہ، ثقہ، حافظ اور عابد تھے''۔

(تقریب التہذیب ص ٥٥٦)

٣۔ عبداللہ بن لہیعہ: حافظ اِن کے متعلق لکھتے ہیں:

''عبداللہ بن لہیعہ بن عقبہ حضرمی ابوعبدالرحمان مصری، یہ قاضی اور صدوق ہیں۔ ساتویں طبقہ سے ہیں، یہ اپنی کتابوں کے جل جانے کے بعد خلط کا شکار ہو گئے تھے۔ ان سے ابن المبارک اور ابن وھب جو روایت کریں وہ دوسرے راویوں کی بنسبت زیادہ بہتر ہوتی ہے۔ ان کا وصال ۱۷۴ھ میں ہوا تھا''۔

(تقریب التہذیب ٥٣٨)

ذہن نشین رہے کہ مذکورہ قول اِن سے ابن وھب نے روایت کیا ہے۔
دکتور بشار عواد معروف اور شیخ شعیب الارنؤوط حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ سے قدرے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

بَلْ ضَعِيفٌ يُعْتَبَرُ بِهِ ، وَحَدِيثُهُ صَحِيحٌ إِذَا رَوىٰ عَنْهُ الْعَبَادِلَةُ: ابْنُ الْمُبَارَكِ ، وَابْنُ وَهْبٍ ، وَابْنُ يَزِيْدِ الْمُقْرِيءُ ، وَابْنُ مَسْلَمَةَ الْقَعْنَبِيُّ، فَإِنَّهُمْ كَانُوْا يَتَتَبَّعُوْنَ أُصُوْلَهُ فَيَكْتُبُوْنَ مِنْهَا.

''بلکہ ضعیف ہے تاہم اس پر اعتبار کیا جاتا ہے، اور جب اس سے عبادلہ (چار عبداللہ نامی حضرات) روایت کریں تو اس کی حدیث صحیح ہے: عبداللہ ابن المبارک، عبداللہ بن وھب، عبداللہ بن یزید مقری اور عبداللہ بن مسلمہ قعنبی۔ یہ حضرات اُن کی کتب کو کھنگالنے کے بعد اُن سے لکھا کرتے تھے''۔

(تحریر تقریب التہذیب ج٢ ص٢٥٨)

اور یاد رہے کہ درجِ بالا اثر عبداللہ بن وھب سے روایت کیا گیا ہے۔

٤۔ یزید بن ابی حبیب مصری: حافظ ان کے متعلق لکھتے ہیں:

ثِقَةٌ فَقِیهٌ وَ کَانَ یُرْسِلُ ، مِنَ الْخَامِسَةِ.

''ثقہ ہیں، فقیہ ہیں اور ارسال کرتے تھے، پانچویں طبقہ سے ہیں''۔

(تقریب التھذیب ص ۱۰۷۳)

۵۔ پانچویں راوی خود ''المعرفة والتاریخ'' کے مصنف ہیں، یعنی محدث یعقوب بن سفیان الفسوی۔ حافظ رحمۃ اللہ علیہ ان کے متعلق لکھتے ہیں:

ثِقَةٌ حَافِظٌ.

''ثقہ حافظ تھے''۔

(تقریب التھذیب ص ۱۰۸۸)

چونکہ اِس روایت کے تمام راوی ثقہ یا صدوق ہیں اسی لیے حافظ ذہبی جیسے نقاد محدث نے بھی ایسی حساس ترین روایت پر کوئی تنقید نہیں کی۔ ہاں اگر کوئی شخص یزید بن ابی حبیب مصری کے مرسِل ہونے کے حوالہ سے معترض ہو تو اُسے یاد رکھنا چاہیئے کہ ثقہ راوی کی مرسل روایت قبول کی جاتی ہے، خصوصاً احناف کے نزدیک اِس مسئلہ میں بہت وسعت پائی جاتی ہے۔

نزاکتِ حالات اور امام پاک کی دست برداری

امام محمد بن سیرین، فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن سعد کے اقوال کو ملا کر ذرا غور فرمایئے کہ ابن صخر کو اقتدار کتنا محبوب تھا اور وہ کب سے اس کے لیے کوششیں کر رہے تھے؟ کیا امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ ایسی مدبر ہستی پر اُن کی یہ ہوس مخفی رہ سکتی تھی؟ کیا اُنہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ جو شخص اِتنے عرصہ سے اقتدار کے لیے پاپڑ بیل رہا ہے وہ اپنے سوا کسی اور شخص کے منتخب کرنے پر راضی ہوگا؟ یقیناً امام پاک علیہ السلام ایسے امور سے بے خبر نہیں تھے اسی لیے اُنہوں نے حالات کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے محض جانبین کے اہل اسلام کے تحفظ کی خاطر مستقبل کی مملکت کو اُن پر چھوڑنا گوارا کر لیا۔ اِس کے باوجود بھی اگر کوئی شخص امام پاک کی مجبوری سے اہلیتِ معاویہ ثابت کرنے پر بضد ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ امام پاک کے نزدیک درج بالا تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم معاویہ کے مقابلہ میں نظم و نسقِ دین کے حوالہ سے نااہل تھے۔ سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام ایسے فہیم و مدبّر کے بارے

میں ایسا تصور کرنا بھی کتاب وسنت اور نبوی تربیت کے منافی ہے۔

بعض اکابر کی تضاد بیانی

مذکورہ بالاسطور میں تو بعض علماء ہند نے امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی اضطراری دست برداری کو تفویض واختیار سے تعبیر کیا لیکن اُن کے کلام کے بعض جملوں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ دست برداری مجبوری کی بنا پر تھی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''بیشک امام مجتبیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلافت سپرد فرمائی، اور اس سے صلح وبندشِ جنگ مقصود تھی''۔

(فتاوی رضویه ج۲۹ ص ۳۳۷)

حقیقت بھی یہی ہے اور حق بھی یہی ہے کہ امام پاک کے مدنظر معاویہ کی اہلیت نہیں تھی بلکہ اُن کے مدنظر فقط خونِ مسلمین کا تحفظ تھا۔ چنانچہ علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ بخاری کی حدیث کی تشریح سے حاصل شدہ فوائد کے بیان میں لکھتے ہیں:

وَمَنْقَبَةٌ لِلْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ لِأَنَّهُ تَرَكَ الْخِلَافَةَ لَا لِعِلَّةٍ وَلَا لِذِلَّةٍ وَلَا لِقِلَّةٍ بَلْ لِحَقْنِ دِمَاءِ الْمُسْلِمِيْنَ.

''اور اس میں سیدنا امام حسن بن علی علیہ السلام کی فضیلت ہے، اس لیے کہ اُنہوں نے خلافت کو کسی کمزوری، ذلت اور عددی قلت کے بغیر محض خونِ مسلمین کی خاطر چھوڑ دیا''۔

(عمدة القاري ج٢٤ ص ٣٠٩)

علامہ قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

فَقَدْ تَرَكَ الْحَسَنُ الْمُلْكَ وَرَعًا وَّرَغْبَةً فِيْمَا عِنْدَ اللّٰهِ ، وَلَمْ يَكُنْ ذٰلِكَ لِعِلَّةٍ وَلَا لِقِلَّةٍ وَلَا لِذِلَّةٍ بَلْ صَالَحَ مُعَاوِيَةَ رِعَايَةً لِلدِّيْنِ وَتَسْكِيْنًا لِلْفِتْنَةِ وَحَقْنِ دِمَاءِ الْمُسْلِمِيْنَ.

''پس امام حسن علیہ السلام نے ملک کو تقویٰ اور عند اللہ اجر کی امید میں ترک کر دیا، اُن

کا ترک کرنا کسی کمزوری، قلت اور ذلت کے بغیر تھا بلکہ اُنہوں نے معاویہ کے ساتھ صلح رعایتِ دین، فتنہ کو دبانے اور مسلمانوں کے خون کی حفاظت کے لیے کی تھی''۔

(إرشاد الساري ج ١٥ ص ٥٦)

چند محدثین کرام کا تکلف

متعدد شارحین نے اِس حدیث سے ایک اور فائدہ مستنبط کرنے کی بھی کوشش کی ہے، اور وہ یہ ہے:

وَفِي الْحَدِيْثِ أَيْضًا وَدَلَالَةٌ عَلٰى رَأْفَةِ مُعَاوِيَةَ بِالرَّعِيَّةِ وَشَفْقَتِهٖ عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ.

''نیز اِس حدیث میں رعایا پر معاویہ کی رافت اور مسلمانوں پر اُن کی شفقت کی بھی دلیل ہے''۔

(إرشاد الساري ج ١٥ ص ٥٦؛ فتح الباري ج ١٦ ص ٥٣٥؛ (الإذاعة لما كان وما يكون بين يدي الساعة للقنوجي ص ٧٤))

نواب سید صدیق حسن قنوجی نے بھی بلا سوچے سمجھے اسی طرح لکھ دیا ہے۔

شارحین کا یہ استنباط سراسر مردود و باطل ہے، اس لیے کہ معاویہ کو اگر اقتدار نہ ملتا تو اُنہوں نے آرام سے نہیں بیٹھنا تھا، اسی لیے تو سیدنا علی ؑ نے فرمایا تھا کہ اگر معاویہ کی امارت کو ناپسند کیا گیا تو اندرائن کی طرح گردنیں کٹ کٹ کر گریں گی۔ شارحین جس حدیث کی تشریح فرما رہے ہیں، خود اُس حدیث کے یہ الفاظ '' لَعَلَّ اللّٰهَ اَنْ يُّصْلِحَ بِهٖ'' بھی اُن کے مستنبط شدہ دلیل کے منافی ہیں۔ اِس حدیث میں اگر معاویہ کی بھی فضیلت ہوتی تو نبی کریم ﷺ ''لَعَلَّ اللّٰهَ أَنْ يُّصْلِحَ بِهِمَا'' فرماتے۔ اگر معاویہ بھی مسلمانوں پر مشفق و مہربان تھے اور سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام بھی رعایا پر مشفق و مہربان تھے تو پھر مسلمانوں کے خون کی پامالی کا خدشہ کس کی طرف سے تھا؟ اگر سیدنا امام حسن ؑ اقتدار سے دست بردار نہ ہوتے تو کیا معاویہ اپنے مسلح لشکر کو لے کر چپ چاپ واپس چلے جاتے؟ کیا وہ کسی ظالم کے چنگل سے امت کی جان چھڑانے آئے تھے کہ وہ رعایا کے حق میں مشفق و رؤوف ہو گئے؟ کیا اُنہیں امت کا غم کھائے جا رہا تھا کہ جگر گوشۂ

مصطفیٰ ﷺ کے مدمقابل لشکر لے کر آ گئے تھے؟ امام حسن رضی اللہ عنہ کے مطابق وہ محض اقتدار کی خاطر آئے تھے اور امام پاک نے اُنہیں اُن کا مطلوب دے کر امت پر شفقت فرمائی تھی۔ چنانچہ علامہ ابن بطال لکھتے ہیں:

وَقَالَ الْحَسَنُ: اتَّقِ اللّٰهَ يَا مُعَاوِيَة ! عَلٰى أُمَّةِ مُحَمَّدٍ ، لَا تَفْنِيهِمْ بِالسَّيْفِ عَلٰى طَلَبِ الدُّنْيَا وَغُرُوْرٍ فَانِيَةٍ زَائِلَةٍ، فَسَلَّمَ الْحَسَنُ الْأَمْرَ إِلٰى مُعَاوِيَةَ.

''امام حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا: معاویہ! اُمتِ محمد ﷺ کے معاملہ میں خدا کا خوف کر! اُنہیں دنیا طلبی اور فانی وزائل ہو جانے والے غرور کی خاطر فنا نہ کر، پھر امام حسن نے امر خلافت معاویہ کے سپرد کر دیا''۔

(شرح ابن بطال علي البخاري ج٨ ص٩٧)

دنیا طلبی، جگر گوشۂ مصطفیٰ ﷺ کے مقابلہ میں لشکر کشی اور پھر رعایا پر شفقت، بھلا اِن باتوں کا آپس میں کوئی تعلق بھی ہے؟

یہاں میں ایک مرتبہ پھر اُس حدیث میں غور وفکر کرنے کی دعوت دوں گا جس میں اُن دو خواتین کا ذکر ہے جن میں سے ایک کے بچے کو بھیڑیا کھا گیا تھا تو دوسرے بچے پر دونوں جھگڑنے لگی تھیں اور مقدمہ حضرت داود علیہ السلام کے پاس لے کر گئی تھیں، اُنہوں نے دونوں کے دلائل سننے کے بعد بڑی کے حق میں فیصلہ دے دیا تھا جبکہ درحقیقت بچہ چھوٹی عورت کا تھا۔ جب وہ دونوں حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے سے گذریں اور اُنہوں نے اُن سے فیصلہ کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہونے پر فرمایا کہ چھری لے آؤ تا کہ ہم اِس بچے کے دو ٹکڑے کر دیں، آدھا تیرا اور آدھا بڑی عورت کا۔ اِس پر بڑی عورت تو خاموش رہی لیکن چھوٹی چلا اُٹھی اور اُس نے عرض کیا: نہیں، اِس کے دو ٹکڑے مت فرمایئے، میں اپنا حصہ بھی اپنی مدمقابل عورت کو دیتی ہوں۔ (بخاری) بتایئے! بچے کے حق میں سراپا شفقت ورافت بڑی عورت ہوئی یا چھوٹی؟ ظاہر ہے کہ چھوٹی عورت سراپا شفقت ورافت تھی، اسی طرح صلح امام حسن علیہ السلام میں امت کے حق میں سراپا شفقت ورافت وہ شخص نہیں تھا جس کی عمر بڑی تھی بلکہ وہ اہل جنت کا سردار تھا جس کی عمر تو اپنے مخالف سے

چھوٹی تھی مگر اُس کی قربانی اور عزت بڑی تھی۔

افسوس ہے کہ ہمارے شارحین کرام بات بنے یا نہ بنے مستنبط شدہ فوائد کے نام پر کچھ نہ کچھ لکھ ہی دیتے ہیں۔

اقتدار چھوڑنے کی وجہ خود امام پاک کی زبانی

امام طبرانی، امام بیہقی اور حافظ ابن حجر عسقلانی سند کے ساتھ لکھتے ہیں کہ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے خلافت سے دست برداری کے بعد والی تقریر میں ارشاد فرمایا:

وَ إِنَّ هٰذَا الْأَمْرَ الَّذِيْ اِخْتَلَفْتُ فِيْهِ أَنَا وَمُعَاوِيَةُ إِمَّا كَانَ حَقًّا تَرَكْتُهُ لِمُعَاوِيَةَ إِرَادَةَ صَلَاحِ هٰذِهِ الْأُمَّةِ أَوْ يَكُوْنُ حَقًّا كَانَ لِإِمْرِءٍ أَحَقُّ بِهِ مِنِّيْ فَفَعَلْتُ ذٰلِکَ ﴿وَإِنْ أَدْرِيْ لَعَلَّهُ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ إِلٰى حِيْنٍ﴾ (فِيْ دَلَائِلِ النُّبُوَّةِ) ثُمَّ اسْتَغْفَرَ وَنَزَلَ.

”یہ معاملہ جس میں مَیں نے اور معاویہ نے اختلاف کیا ہے، یہ میرا حق ہے تو میں نے اصلاح امت کی خاطر معاویہ کے لیے چھوڑ دیا، یا یہ کسی اور شخص کا حق ہے جو مجھ سے زیادہ مستحق ہے تب بھی میں نے اُسے چھوڑ دیا۔ ﴿اور میں کیا جانوں شاید وہ تمہاری جانچ ہو اور ایک وقت تک سامانِ حیات﴾ پھر استغفار پڑھا اور نیچے اتر آئے“۔

(أخبار الحسن للطبراني ص ۳۹، ۴۰ حديث ۳۵؛ دلائل النبوة ج ٦ ص ٤٤٤؛ مرآة الزمان ج ٧ ص ١٠؛ فتح الباري ج ١٦ ص ٥٢٩؛ موسوعة الحافظ ابن حجر العسقلاني ج ٦ ص ٣٣٦)

سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے استغفار کیوں کیا؟ اس لیے کہ اُنہیں بعض طلقاء کو ملک سونپنا پڑا جو کہ جائز نہیں تھا مگر مجبوری کے عالم میں بعض ممنوعات بھی جائز ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ اسی مسئلہ میں گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اَلضَّرُوْرَاتُ تَبِيْحُ الْمَحْذُوْرَاتِ انعقادِ اجماع بر خلافت معاویہ برائے دفع فتنہ شدہ است۔

''ضرورتیں ممنوعات کو جائز بنادیتی ہیں، اور معاویہ کی خلافت پر اجماع کا انعقاد فتنے کو دفع کرنے کے لیے تھا''۔

(السیف المسلول ص ۲۰۷)

سو چونکہ یہ عمل اُن کے اعلیٰ وارفع مقام کے خلاف بھی تھا اور پھر اُنہیں کرنا بھی پڑ گیا تھا، اسی لیے اُنہوں نے اِس پر بارگاہِ الٰہی میں استغفار کیا۔ امام پاک کے اِس اضطراری عمل کو دلیل بنانا کہ بعض طلقاء اُن کے نزدیک پسندیدہ تھے محض عدم تدبر پر ہی مبنی نہیں بلکہ سراسر عقل کے خلاف ہے۔ آیئے! خود امام پاک علیہ السلام سے ہی پوچھ لیتے ہیں کہ اُن کے نزدیک مقام معاویہ کیا تھا؟ معاہدہ لکھے جانے کے بعد جب امام پاک دستبردار ہو کر عازمِ مدینہ ہوئے تو معاویہ بن ابی سفیان کو خیال آیا کہ اُنہیں خوارج کے خلاف جنگ کے لیے بھیجا جائے، لیکن امام پاک علیہ السلام نے اُنہیں فرمایا: میرے نزدیک خوارج کی بجائے تمہارے خلاف جنگ کرنا زیادہ بہتر ہے۔ چنانچہ امام ابوالعباس المبرّد لکھتے ہیں:

ثُمَّ خَرَجَ الْحَسَنُ يُرِيدُ الْمَدِينَةَ فَوَجَّهَ إِلَيْهِ مُعَاوِيَةُ وَقَدْ تَجَاوَزَ فِي طَرِيقِهِ يَسْأَلُهُ أَنْ يَكُونَ الْمُتَوَلِّيَ لِمُحَارَبَتِهِمْ ، فَقَالَ الْحَسَنُ: وَاللّٰهِ لَقَدْ كَفَفْتُ عَنْكَ لِحَقْنِ دِمَاءِ الْمُسْلِمِينَ ، وَمَا أَحْسِبُ ذٰلِكَ يَسَعُنِي ، أَفَأُقَاتِلُ عَنْكَ قَوْماً ، أَنْتَ وَاللّٰهِ أَوْلىٰ بِالْقِتَالِ مِنْهُمْ.

''پھر امام حسن علیہ السلام عازم مدینہ ہوئے تو معاویہ اُن کے پیچھے گئے جبکہ امام پاک کافی راستہ طے کر چکے تھے، انہوں نے امام پاک سے درخواست کی کہ وہ خوارج کے خلاف جنگ کے سپہ سالار بنیں تو امام حسن علیہ السلام نے فرمایا: خدا کی قسم! میں نے تو تجھ سے بھی فقط خونِ مسلمین کے تحفظ کی خاطر ہاتھ روکا ہے، میں اس کام کو مناسب نہیں سمجھتا، کیا میں تیرے دفاع میں ایک قوم کو قتل کروں؟ اللہ کی قسم! اُن کی بہ نسبت تجھ سے جنگ کرنا زیادہ بہتر ہے''۔

(الکامل فی اللغۃ والأدب ص ۵۷۷، وط: ج۳ ص ۷۰)

اِس عبارت میں بار بار غور فرمایئے کہ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے معاویہ کو کیا فرمایا اور کیوں فرمایا کہ خوارج کی بجائے تجھ سے جنگ کرنا بہتر ہے؟ اِس سے معلوم ہوا کہ کسی سے مجبوراً صلح کرنا اور بات ہوتی ہے اور اُس شخص کا پسندیدہ ہونا اور بات ہوتی ہے۔ اِس عبارت میں یہ لفظ انتہائی قابل توجہ ہے: "أَفَأُقَاتِلُ عَنْکَ قَوْماً" (کیا میں تیرے دفاع میں ایک قوم کو قتل کروں؟) معلوم ہوا کہ اُس وقت خوارج کے خلاف جنگ کرنا امام پاک علیہ السلام کے نزدیک اسلامی جہاد نہیں رہا تھا بلکہ وہ فقط دفاعِ معاویہ بن چکا تھا، حالانکہ صحیح احادیث کی رو سے جب خوارج مولا علی علیہ السلام کے مدمقابل تھے تو پھر اُنہیں تہ تیغ کرنا واجب تھا اور آقائے کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اگر میں اُنہیں پاتا تو قوم عاد کی طرح قتل کر دیتا۔ اِس سے واضح ہوتا ہے کہ معاویہ اور خوارج دونوں اہل قبلہ تھے مگر امام پاک کے نزدیک خوارج معاویہ سے اتنے زیادہ برے نہیں تھے کہ اُن سے معاویہ کی خاطر جنگ کی جاتی، البتہ اگر اسلامی دفاع اور مسلمانوں کا اجتماعی مفاد وابستہ ہوتا تو اور بات ہوتی۔

امام پاک کے سامنے دو مصیبتیں تھیں

مصیبت چھوٹی ہو یا بڑی، مصیبت ہی ہوتی ہے اور مصیبت بہر حال پسندیدہ نہیں ہوتی، لیکن قاعدہ یہ ہے کہ فرد یا قوم کے سامنے جب ایسی صورت آ جائے کہ اُن کا بیک وقت دونوں مصیبتوں سے بچنا مشکل ہو تو عقل و دانش کو کام میں لاتے ہوئے بڑی مصیبت سے جان چھڑائی جاتی ہے اور چھوٹی مصیبت کو بادلِ ناخواستہ برداشت کیا جاتا ہے۔ چنانچہ علامہ محمد بن ابراہیم ابن الوزیر یمانی لکھتے ہیں:

وَلَمْ یَزَلِ الْعُقَلَاءُ یَدْفَعُوْنَ الْمَضَرَّةَ الْعُظْمٰی بِمَا دُوْنَهَا.

"ہمیشہ سے اہل دانش بڑی مصیبت کو اُس سے چھوٹی سے ٹالتے آئے ہیں"۔

(العواصم والقواصم لابن الوزیر ج۸ ص۱۷۶)

گزشتہ سطور میں جو دو عورتوں کا واقعہ نقل کیا گیا ہے ذرا اُس میں غور فرمائیں کہ چھوٹی عورت جو بچے کی حقیقی ماں تھی وہ کیوں بڑی عورت کے حق میں اپنے بچے سے دست بردار ہونے کو تیار ہو گئی تھی؟ اِس لیے کہ سیدنا سلیمان علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ چھری لاؤ تا کہ میں اِس بچے کے دو حصے کر دوں۔ اب چھوٹی خاتون

کے سامنے دو مصیبتیں تھیں۔ایک یہ کہ وہ اپنا بچہ دوسری عورت کو دے دے۔دوسری یہ کہ وہ اپنے بچے کے کٹ جانے اور اُس کے دو ٹکڑے ہو جانے کے لیے تیار ہو جائے۔ظاہر ہے کہ اِن دونوں مصیبتوں میں سے جو مصیبت چھوٹی تھی اُس عورت نے اُسے قبول کر لیا اور اپنا لختِ جگر بڑی عورت کو تفویض کرنے پر آمادہ ہو گئی۔

سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے سامنے بھی دو مصیبتیں تھیں۔ایک یہ کہ وہ ایک طلیق اور نا اہل شخص کے حق میں دست بردار ہوں جو کہ جائز نہیں تھا۔دوسری یہ کہ دست بردار نہ ہوں اور جنگ کے لیے تیار ہوں، سو چونکہ پہلی مصیبت دوسری مصیبت کے مقابلہ میں چھوٹی تھی اِس لیے امام پاک نے پہلی مصیبت کو بادلِ نخواستہ برداشت کر لیا اور اپنے حق سے دست بردار ہو گئے۔

بعینہٖ یہی صورتِ حال مذکورہ بالا حدیث میں بیان فرمائی گئی ہے۔چھوٹی عورت جو بچے کی حقیقی ماں تھی اُس کے سامنے بھی دو مصیبتیں تھیں: ایک یہ کہ وہ اپنا لختِ جگر بڑی عورت کے سپرد کر دے، دوسری یہ کہ وہ اپنے لختِ جگر کے دو ٹکرے کر دینے پر تیار ہو جائے۔سو چونکہ اِن میں سے پہلی مصیبت دوسری مصیبت کے مقابلہ میں چھوٹی تھی اِسی لیے وہ اپنا لختِ جگر بڑی عورت کو دینے پر تیار ہو گئی تھی۔

یہاں اپنی عقلی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے بتایئے کہ اگر کوئی شخص اِس سے یہ نکتہ پیدا کرنے کی کوشش کرے کہ چھوٹی عورت اپنا لختِ جگر بڑی عورت کو تفویض کرنے پر اِس لیے تیار ہو گئی تھی کہ اُس کے نزدیک بڑی عورت اہل اور پسندیدہ تھی تو کیا ایسی نکتہ آفرینی کو عقل مندی کہا جا سکتا ہے؟

امام پاک کو صلح پسند تھی یا معاویہ؟

آپ جان چکے ہیں کہ سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے تحفظِ خونِ مسلمین کی خاطر معاویہ کو اقتدار سپرد کیا اور اُن کے ساتھ صلح کی لیکن اُن کے ساتھ جنگ کرنا خوارج کے ساتھ جنگ کرنے سے بھی زیادہ بہتر سمجھا۔ اِس سے معلوم ہوا کہ اُن کے نزدیک خونِ مسلمین کی حفاظت کی خاطر صلح تو پسند تھی مگر اُنہوں نے جس شخص کے ساتھ صلح کی تھی وہ اُن کے نزدیک پسندیدہ نہیں تھا۔بعض علماء نے اِس صلح کو معاویہ کی صلاحیت واہلیت کی دلیل سمجھ لیا ہے۔چنانچہ بعض متأخرین علماء ہند لکھتے ہیں:

''بیشک امام مجتبیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کوخلافت سپرد فرمائی، اور اس سے صلح و بندشِ جنگ مقصود تھی اور یہ صلح وتفویضِ خلافت اللہ ورسول کی پسند سے ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ (وآلہ) وسلم نے امام حسن کو گود میں لے کرفرمایا تھا: **ان ابنی ھذا سید ولعل اللّٰہ ان یصلح بہ بین فئتین عظیمتین من المسلمین** (میرا یہ بیٹا سید ہے میں امید کرتا ہوں کہ اللہ اس کے سبب سے مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرادے گا) امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اگر خلافت کے اہل نہ ہوتے (تو) امام مجتبیٰ ہرگز اُنہیں تفویض نہ فرماتے، نہ اللہ ورسول اسے جائز رکھتے۔ واللہ تعالیٰ اعلم''۔

(فتاوی رضویہ ج۲۹ ص۳۳۷)

اگر اِس اِقتباس کی پہلی ساڑھے پانچ سطور کو دیکھا جائے تو صلح کا پسند ہونا ظاہر ہوتا ہے، لیکن بعد والی دوسطروں کو ملا کر پڑھا جائے تو پھر معلوم ہوتا ہے کہ صاحبِ فتاوی رضویہ اِس صلح سے صلح کی فضیلت نہیں بلکہ معاویہ کی صلاحیت واہلیت مراد لے رہے ہیں، اور علامہ امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی سمجھا ہے۔ چنانچہ یہ دونوں حضرات حدیث ''إِنَّ ابْنِيْ هٰذَا سَيِّدٌ'' نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

وَبِهٖ ظَهَرَ أَنَّ الطَّعْنَ عَلَى الْأَمِيْرِ مُعَاوِيَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ طَعْنٌ عَلَى الْإِمَامِ الْمُجْتَبٰى، بَلْ عَلٰى جَدِّهِ الْكَرِيْمِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، بَلْ عَلٰى رَبِّهٖ عَزَّوَجَلَّ.

''امیر معاویہ پر طعن کرنے والا حقیقۃً حضرت امام حسن مجتبیٰ بلکہ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ (وآلہ) وسلم بلکہ حضرت عزت جل وعلا پر طعن کرتا ہے''۔

(المعتمد المستند شرح المعتقد المنتقد ص ۲۴۲ حاشیۃ نمبر ۳۱۹؛ ترجمۃ: بہار شریعت ج۱ (الف) ص۲۵۹)

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ اِن دونوں حضرات نے بھی اور علماء متقدمین ومتأخرین میں سے جس

نے بھی اِس صلح سے اہلیت وصلاحتِ معاویہ کی دلیل اخذ کی ہے، سب غلط فہمی کا شکار ہیں۔ اِس لیے کہ آپ پڑھ چکے ہیں کہ سیدنا عمر، سیدنا علی، ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ، سیدنا ابن عباس، سیدنا عمار بن یاسر، سیدنا عبدالرحمان بن غنم اشعری اور سیدنا صعصعہ بن صوحان ﷺ طلقاء کو خلافت کے لیے اہل نہیں سمجھتے تھے۔ خود سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام بھی معاویہ کو اہل نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ اُنہوں نے صلح کے بعد معاویہ کو واشگاف الفاظ میں فرمادیا تھا کہ تیرے خلاف جنگ کرنا خوارج کے خلاف جنگ کرنے سے بہتر ہے مگر میں خونِ مسلمین کی خاطر پیچھے ہٹ گیا ہوں، حتیٰ کہ امام پاک نے شرائط صلح طے کر لینے کے بعد جو خطاب فرمایا تھا اُس میں بھی اُنہوں نے جہاں صلح کی غرض وغایت بیان فرمائی تھی وہیں تعریضاً معاویہ کو فتنہ بھی قرار دیا تھا۔ چنانچہ عمرو بن العاص نے جب معاویہ کو مشورہ دیا کہ وہ اِس معاہدہ کے بعد امام حسن سے تقریر کرائیں، اور اِس مشورہ سے اُس کی غرض یہ تھی کہ امام پاک پبلک کے سامنے رُسوا ہو جائیں، کیونکہ اُس کا گمان تھا کہ امام پاک پبلک کے سامنے اظہارِ خیال کی قدرت نہیں رکھتے، لیکن اُس کی یہ چال اُلٹا اُس کے لیے ہی مصیبت بن گئی تھی۔ بہر حال جب امام پاک نے تقریر فرمائی تو اُن کے خطاب کے بعض جملوں سے ابن صخر آگ بگولا ہو گئے تھے اور امام پاک کی فصاحت وبلاغت سے بھرپور فی البدیہہ تقریر سے ابن العاص بھی رُسوا ہوئے تھے۔ چنانچہ ابن عساکر لکھتے ہیں کہ امام پاک نے خطاب کیا تو اُس میں حمد وثنا کے بعد فرمایا:

أَيُّهَا النَّاسُ فَإِنَّ اللّٰهَ ﷻ هَدَاكُمْ بِأَوَّلِنَا وَحَقَنَ دِمَاءَكُمْ بِآخِرِنَا، وَإِنَّ لِهٰذَا الْأَمْرِ مُدَّةٌ، وَإِنَّ الدُّنْيَا دُوَلٌ، وَإِنَّ اللّٰهَ قَالَ لِنَبِيِّهِ ﷺ: ﴿وَإِنْ أَدْرِي أَقَرِيبٌ أَمْ بَعِيدٌ مَا تُوعَدُونَ، إِنَّهُ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُونَ، وَإِنْ أَدْرِي لَعَلَّهُ فِتْنَةٌ لَكُمْ وَمَتَاعٌ إِلٰى حِينٍ﴾ فَلَمَّا قَالَهَا أَجْلَسَهُ مُعَاوِيَةُ، ثُمَّ خَطَبَ مُعَاوِيَةُ ثُمَّ النَّاسَ، فَلَمْ يَزَلْ صَرِماً عَلٰى عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ، وَقَالَ: هٰذَا مِنْ رَأْيِكَ!

”لوگو! اللہ ﷻ نے ہمارے اولین کے طفیل تمہیں ہدایت دی اور ہمارے آخرین کے طفیل تمہارے خون کو محفوظ کیا، یہ معاہدہ ایک مدت کے لیے ہے اور دنیا قرار پکڑنے

کی چیز نہیں، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو فرمایا ہے: (اور میں نہیں سمجھتا کہ قریب ہے یا بعید جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے، بیشک اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو بات تم بلند آواز سے کہتے ہو اور جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو، اور میں کیا جانوں (اس ڈھیل سے) شاید تمہارا امتحان لینا اور ایک وقت تک تمہیں لطف اندوز کرنا مطلوب ہو) جب امام حسن علیہ السلام نے یہ بات فرمائی تو معاویہ نے اُنہیں بٹھا دیا، پھر معاویہ نے لوگوں کو خطبہ دیا، پھر وہ مسلسل عمرو بن العاص کو کوستے رہے اور کہتے رہے: یہ ہے تمہاری رائے!''۔

(تاريخ دمشق ج۱۳ ص ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷)

دوسری روایت میں ہے:

''امام حسن علیہ السلام نے ﴿لَعَلَّهُ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ﴾ آیت پڑھتے ہوئے اپنے ہاتھ سے معاویہ کی طرف اشارہ کیا تو معاویہ غضب ناک ہوا، پھر معاویہ نے اُن کے بعد ایک خطبہ دیا جس میں اُس پر مرعوبیت نمایاں تھی، پھر منبر سے اتر کر امام حسن علیہ السلام سے کہنے لگا: ﴿فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ﴾ (تمہارے لیے فتنہ اور سامان) سے تم نے کیا ارادہ کیا تھا؟ امام پاک علیہ السلام نے فرمایا: اس سے میں نے وہی ارادہ کیا جو اللہ جل جلالہ کا ارادہ ہے''۔

(سير أعلام النبلاء للذهبي ج۳ ص ۲۷۱، ۲۷۲؛ أسد الغابة ج۲ ص ۲۱؛ تاريخ دمشق ج۱۳ ص ۲۷۵، ۲۷۷؛ البداية والنهاية ج۸ ص۴۸)

اس تقریر میں امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے آیات کی تلاوت فرما کر جو تعریض فرمائی، اُس میں غور فرمائیے اور خصوصاً اُس منظر کو سامنے لائیے جو اُنہوں نے ﴿لَعَلَّهُ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ﴾ کی تلاوت کے وقت اپنے ہاتھوں سے معاویہ کی طرف اشارہ فرمایا، حتیٰ کہ وہ غضب ناک ہو گیا اور مزید تقریر سے روکنے پر مجبور ہو گیا، اور عمرو بن العاص کو کوسنا شروع کر دیا۔ بتلائیے! کیا ایسے ماحول و منظر سے معاویہ کی صلاحیت و اہلیت عیاں ہو رہی ہے؟

دراصل فہمِ اکابر قاصر رہ گئی، ورنہ اہلیتِ معاویہ پر طعن سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام پر طعن نہیں بلکہ امام پاک کے اقدامِ صلح پر طعن امام پاک پر طعن ہے اور امام پر طعن رسول اللہ ﷺ پر طعن ہے اور رسول اللہ ﷺ پر طعن اللہ تعالیٰ پر طعن ہے۔ بتلایئے! صلح کے وقت جن اہلِ محبت نے امام پاک کو مومنین کے لیے عار کہا تھا، کیوں کہا تھا؟ فقط اس لیے کہ اُن کی توجہ معاویہ کی عدمِ اہلیت پر مرکوز تھی جبکہ امام پاک علیہ السلام کی توجہ خونِ مسلمین کے تحفظ پر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ امام پاک پر جس کسی نے بھی طعن کیا تھا کسی پر بھی امام پاک ناراض نہیں ہوئے تھے بلکہ اُسے سمجھایا تھا کہ ہم نے یہ صلح معاویہ کی خاطر نہیں کی بلکہ خونِ اہلِ اسلام کے تحفظ کی خاطر کی ہے۔ چنانچہ سفیان بن اللیل بیان کرتے ہیں: امام حسن بن علی رضی اللہ عنہما جب کوفہ سے مدینہ تشریف لائے تو میں نے اُنہیں کہا:

يَا مُذِلَّ الْمُؤْمِنِينَ! فَكَانَ مِمَّا احْتَجَّ عَلَيَّ أَنْ قَالَ: سَمِعْتُ عَلِيًّا رضی اللہ عنہ، يَقُولُ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ: لَا تَذْهَبُ اللَّيَالِي وَالْأَيَّامُ حَتّٰى يَجْتَمِعَ أَمْرُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ عَلٰى رَجُلٍ وَاسِعِ السُّرْمِ، ضَخْمِ الْبُلْعَمِ، يَأْكُلُ وَلَا يَشْبَعُ، وَهُوَ مُعَاوِيَةُ، فَعَلِمْتُ أَنَّ أَمْرَ اللّٰهِ تَعَالٰى وَاقِعٌ، وَخِفْتُ أَنْ تَجْرِيَ بَيْنِي وَبَيْنَهُ الدِّمَاءُ.

''اے مومنین کو ذلیل کرنے والے! اِس پر اُنہوں نے مجھے دلائل دینا شروع فرمائے، یہاں تک کہ فرمایا: میں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو فرماتے ہوئے سنا، اُنہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: یہ شب و روز ختم نہیں ہوں گے حتیٰ کہ اِس امت کا معاملہ ایک ایسے شخص پر جمع ہوگا جو کھلی ناک والا اور وسیع حلق والا ہوگا، جو کھائے گا اور اُس کا پیٹ نہیں بھرے گا، اور وہ معاویہ ہے۔ سو میں نے جان لیا کہ اللہ تعالیٰ کا امر پورا ہونے والا ہے اور میں نے خوف کیا کہ میرے اور اُس کے درمیان خون جاری ہو''۔

(كتاب الفتن لنعيم بن حماد ص ١٦٤ حديث ٤٢٢ ؛البداية والنهاية ج٩ ص ٢١١ وج ١١ ص

۴۳۰؛الإشاعة لأشراط الساعة للبرزنجي ص ۵۷)

امام نعیم بن حماد کی روایت میں وَاسِعَ الشُّرُمِ کے الفاظ ہیں الشُّرُم ناک کے معنیٰ میں بھی آتا ہے، اور حافظ ابن کثیر کے ہاں وَاسِعَ السُّرُمِ کے الفاظ ہیں اور اس کا معنیٰ ہے: چوڑی سرین [Hips] والا۔ یہی الفاظ زیادہ قرین قیاس ہیں، کیونکہ معاویہ کے حلیہ میں اُن کی ناک کا زیادہ بڑا اور بھدا ہونا نہیں ملتا، البتہ اُن کی سرین کا بڑا ہونا حتیٰ کہ اُن کا اپنی والدہ کے مشابہ ہونا بھی ملتا ہے، اور زیادہ کھانے اور سیر نہ ہونے کا ذکر بھی ملتا ہے، اور یہ بات بھی ملتی ہے کہ اُن کا جسم اِس قدر بھاری ہو گیا تھا کہ وہ کھڑے ہو کر خطبہ دینے سے قاصر ہو گئے تھے، لہٰذا ''وَاسِعَ السُّرُمِ'' کے الفاظ ہی زیادہ صحیح ہیں۔ علامہ محمد بن رسول برزنجی کی تحقیق بھی یہی ہے۔

(الإشاعة لأشراط الساعة ص ۵۷)

یہ تو تھی ایک لفظی توضیح، اصل مقصود اِس روایت سے یہ سمجھنا ہے کہ معترض نے اپنے اعتراض میں جس بات کو ہدفِ تنقید بنایا ہے وہ معاویہ کو اقتدار سپرد کرنا ہے، جیسا کہ امام پاک کے جواب سے عیاں ہے۔ غور کیجئے! امام پاک نے اپنے دلائل میں حدیث نبوی پیش فرما کر اسی بات کو واضح کرنے کی کوشش فرمائی ہے کہ ایک نہ ایک دن معاویہ کے بادشاہ ہونے کا ذکر احادیث میں آچکا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ معترض کو عملِ صلح پر نہیں بلکہ معاویہ کو ملک سونپنے پر اعتراض تھا۔ اسی لیے امام پاک نے اُس کے اعتراض کو مسترد نہیں کیا بلکہ اُس کے سامنے معاویہ کو ملک سونپنے کی وجوہ بیان کیں اور اُس کو مطمئن فرمایا۔ اِس سوال وجواب سے یہ حقیقت آشکارا ہو گئی کہ معاویہ پر طعن امام حسن علیہ السلام پر طعن نہیں ہے، البتہ صلح پر طعن امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام پر طعن ہے۔

کیا اقتدار ملنا پسندیدگی کی دلیل ہے؟

اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے جو یہ لکھا ہے:

''امیر معاویہ پر طعن کرنے والا حقیقۃً حضرت امام حسن مجتبیٰ بلکہ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ (وآلہ) وسلم بلکہ حضرت عزت جل وعلا پر طعن کرتا ہے''۔

اگر اِس سے اُن کی مراد معاویہ کو اقتدار ملنا ہے تو بلاشبہ اگر کسی شخص کو اقتدار ملے اور وہ کتاب وسنت کے مطابق عدل وانصاف کے ساتھ حکومت کرے تو یقیناً یہ بہت بڑی نعمت ہے، حتیٰ کہ بعض احادیث کے مطابق عدل وانصاف کے ساتھ ایک دن کی حکومت ستر سال کی عبادت سے بہتر ہے۔ لیکن یہ فضیلت اُس شخص کے لیے نہیں جو جبر وزور سے حکومت حاصل کرے بلکہ یہ فضیلت فقط اُس شخص کے لیے ہے جو اہل ہو اور اُس کو لوگ بلا جبر واکراہ اپنی مرضی سے منتخب کریں، ورنہ دنیا میں اقتدار تو ہر مسلم وغیر مسلم اور اہل ونااہل کو مل جاتا ہے، تاہم مجھے اِس پر زیادہ کلام کرنے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ اِس سلسلہ میں ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا وہ تبصرہ ہی کافی ہے جو ہم پہلے نقل کر چکے ہیں۔

"هُدْنَةٌ عَلٰى دَخَنٍ" نبوی پیش گوئی

بعض لوگوں نے جو صلحِ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کو معاویہ کی اہلیت وصلاحیت کی دلیل سمجھ لیا ہے، اُس کی وجہ شاید یہ ہے کہ اُن کی توجہ بعض احادیث نبویہ کی طرف نہیں گئی۔ صحیح احادیث مبارکہ میں آیا ہے کہ ایک صلح ہوگی مگر اس کے باوجود صلح کرنے والوں کے دلوں سے میل وکدورت نہیں جائے گی۔ چنانچہ صحیحین میں حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث میں ہے کہ اُنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں عرض کیا:

> **يَارَسُولَ اللّٰهِ إِنَّا كُنَّا فِيْ جَاهِلِيَّةٍ وَشَرٍّ فَجَاءَ نَا اللّٰهُ بِهٰذَا الْخَيْرِ، فَهَلْ بَعْدَ هٰذَا الْخَيْرِ مِنْ شَرٍّ ؟ قَالَ: نَعَمْ، قُلْتُ: وَهَلْ بَعْدَ ذٰلِكَ الشَّرِّ مِنْ خَيْرٍ؟ قَالَ: نَعَمْ وَفِيهِ دَخَنٌ، قُلْتُ: وَمَا دَخَنُهُ ؟ قَالَ: قَوْمٌ يَهْدُوْنَ بِغَيْرِ هَدْيِيْ، تَعْرِفُ مِنْهُمْ وَتُنْكِرُ.**

"یارسول اللہ! ہم جاہلیت اور شر میں تھے، پس اللہ تعالیٰ ہمارے پاس اِس خیر کو لے آیا۔ کیا اس خیر کے بعد بھی کوئی شر ہوگا؟ فرمایا ہاں۔ میں نے عرض کیا: کیا اُس شر کے بعد خیر ہوگی؟ فرمایا: ہاں اور اُس میں دھواں ہوگا۔ میں نے عرض کیا: وہ دھواں کیا ہوگا؟ فرمایا: وہ میری ہدایت کے بغیر چلیں گے، تمہیں اُن کے پسندیدہ اور ناپسندیدہ

دونوں امور کا سامنا کرنا ہوگا''۔

(بخاري: كتاب المناقب، باب علامات النبوة في الإسلام ص ٤٩٠ حديث ٣٦٠٦؛ صحيح مسلم: كتاب الإمارة، باب الأمر بلزوم الجماعة عند ظهور الفتن، وتحذير الدعاة إلى الكفر، ص ٨٩٦ حديث ١٨٤٧)

اِس حدیث میں دومرتبہ خیر کا اور دومرتبہ شر کا ذکر آیا ہے۔شارحین حضرات کے مطابق پہلی خیر سے مراد وہ خیر ہے جو نبی کریم ﷺ لائے اور دوسری خیر سے مراد امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی صلح ہے، اور یہی وہ صلح ہے جس کے بارے میں فرمایا گیا کہ اُس میں دَخَــنٌ (کدورت) ہوگی۔اس لفظ کی معنوی تشریح میں محدثین کرام لکھتے ہیں:

''اس کا معنیٰ ہے: دھواں، یعنی اُس صلح میں خالص خیر نہیں ہوگی بلکہ اُس میں کچھ کانٹے اور کدورتیں ہوگی جیسا کہ آگ میں دھواں۔ابن فارس نے کہا ہے: ''دَخَــنٌ'' سے ناپسندیدہ معاملات مراد ہیں۔صاحب العین فرماتے ہیں: ''دَخَــنٌ'' سے مراد کینہ ہے۔امام ابوعبید فرماتے ہیں: اس لفظ کا معنیٰ ایک اور حدیث میں آچکا ہے کہ: ''قوم کے دل اپنی شفافیت کے لحاظ سے پہلی حالت پر نہیں رہیں گے''۔جامع الأصول میں ہے: اس سے دل کا فساد یعنی کھوٹ مراد ہے۔نووی نے کہا: ''دَخَــنٌ'' سے مراد ہے: دل ایک دوسرے کے لیے صاف نہیں رہیں گے اور اُس شفافیت کی طرف نہیں پلٹیں گے جس پر وہ پہلے ہوں گے''۔

(عمدة القاري ج١٦ ص ١٩٤؛ فتح الباري ج١٦ ص ٤٨٥)

اِس اقتباس میں جس حدیث کی طرف امام ابوعبید نے اشارہ فرمایا ہے، وہ یہ ہے:

هُدْنَةٌ عَلٰى دَخَنٍ ، وَجَمَاعَةٌ عَلٰى أَقْذَاءٍ فِيهَا أَوْ فِيهِمْ ، قُلْتُ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ ! الْهُدْنَةُ عَلَى الدَّخَنِ مَا هِيَ ؟ قَالَ: لَا تَرْجِعُ قُلُوبُ أَقْوَامٍ عَلَى الَّذِي كَانَتْ عَلَيْهِ.

''ناگواری کے باوجود صلح ہوگی، اور ایسا اتحاد ہوگا جس میں کدورت باقی ہوگی۔

میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! اَلْهُدْنَةُ عَلَى الدَّخَنِ کیا ہے؟ فرمایا: قوم پہلے جس حالت پر تھی اُن کے دل اُس حالت کی طرف نہیں لوٹیں گے''۔

(سنن أبي داود: كتاب الفتن والملاحم، باب ذكر الفتن ودلائلها، ج٤ ص٢٨٨، ٢٨٩ حديث٤٢٤٦؛ مسند أحمد(شاكر) ج١٦ ص٥٧٨ حديث٢٣١٧٥)

دَخَنٌ کا معنیٰ آپ جان چکے ہیں، اب ذرا ''اَلْهُدْنَةُ'' کا معنیٰ بھی جان لیجئے۔ مولانا عبدالحفیظ بلیاوی لکھتے ہیں:

اَلْهُدْنَةُ: مصالحت، آرام سکون جمع هُدَنٌ اور اَلْهُدُوْنُ سکون، صلح''۔

(مصباح اللغات للبلياوي ص٩٨٣)

اس لغوی تشریح سے ''اَلْهُدْنَةُ عَلَى الدَّخَنِ'' کا مکمل مفہوم واضح ہوگیا کہ اِس سے ایسی صلح مراد ہے جو دِلوں میں ناگواری کے ساتھ ہوگی۔ چنانچہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اِن دونوں لفظوں کی لغوی توضیح کے بعد لکھتے ہیں:

وَحَاصِلُهُ أَنَّهُ يَكُوْنُ صُلْحٌ مَعَ خَدْعٍ وَخِيَانَةٍ وَنِفَاقٍ.

''خلاصہ یہ ہے کہ دھوکہ، خیانت اور نفاق کے ساتھ صلح ہوگی''۔

(لمعات التنقيح ج٨ ص٦٠٦)

صلح دو شخصوں یا دو پارٹیوں کے درمیان میں ہوتی ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اِس حدیث میں صلح کے باوجود جس کدورت اور کبیدگی کا ذکر ہے اُس سے کس کے دل کی کبیدگی مراد ہے، اور اِس میں جس خدع، خیانت اور نفاق کا ذکر ہے وہ کس کے دل میں تھا؟ یہ کوئی ایسا معمہ نہیں جس کو سمجھنا مشکل ہو، تاہم اِس کی وضاحت آئندہ سطور میں آرہی ہے۔

عام الجماعۃ کی حقیقت

ناصبی لوگ بغلیں بجاتے ہیں کہ اُن کے ممدوح کو جب امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے اقتدار سپرد کردیا تو وہ

سال عام الجماعۃ کہلایا، اُنہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اِس میں اُن کے ممدوح کی کوئی خوبی نہیں، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے پہلے ہی اِس اجتماع کو "جَمَاعَةً عَلٰى أَقْذَاءٍ" (کدرتوں پر جماعت) فرمایا تھا۔ یہ نبوی پیش گوئی اِس کدورتوں بھرے اجتماع پر کیسے صادق آئی؟ آیئے! اِس کی حقانیت تاریخ سے اور تاریخ کی حقانیت اِسی حدیث سے سمجھیے۔ امام ابن جریر طبری اور امام ابن اثیر جزری رحمۃ اللہ علیہما لکھتے ہیں کہ جب سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے بادلِ نخواستہ معاویہ کے ساتھ صلح کر لی تو سیدنا قیس بن سعد رضی اللہ عنہما کو فرمایا کہ وہ معاویہ کی طاعت میں داخل ہو جائیں۔ اُنہوں نے لوگوں میں کھڑے ہو کر فرمایا:

أَيُّهَا النَّاسُ اخْتَارُوْا الدُّخُوْلَ فِيْ طَاعَةِ إِمَامِ ضَلَالَةٍ، أَوِ الْقِتَالِ مَعَ غَيْرِ إِمَامٍ؟ فَقَالَ بَعْضُهُمْ: بَلْ نَخْتَارُ أَنْ نَّدْخُلَ فِيْ طَاعَةِ إِمَامِ ضَلَالَةٍ.

"لوگو! امامِ ضلالت کی طاعت میں داخل ہونا چاہتے ہو یا بغیر امام کے جنگ کرنا چاہتے ہو؟ بعض لوگوں نے کہا: بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ ہم امامِ ضلالت کی طاعت میں داخل ہو جائیں"۔

(تاریخ الطبري ج٥ ص ١٦٠؛ الکامل فی التاریخ ج٣ ص٧)

اِس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جیسی وہ ناگوار بیعت تھی ایسا ہی وہ سال عام الجماعۃ تھا۔ یہاں کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ کتبِ تاریخ کی بات ہے، اس لیے اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ اِس پر ہم عرض کرتے ہیں کہ جب اِس کی پیش گوئی حدیث پاک میں آ گئی تھی تو پھر اُس کا پورا ہو کر کتب تاریخ میں مذکور ہونا حدیث پاک کی صحت کی دلیل بن گئی اور ساتھ ہی اِس سے تاریخ کی بھی توثیق ہو گئی۔ یہاں یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ جب کوئی نبوی پیش گوئی مستقبل میں من وعن واقع ہو جائے تو اُس کا شمار دلائلِ نبوت میں ہوتا ہے۔

ضلالت و کدورت پر جماعت

یاد رکھنا چاہیئے کہ ۴۰ھ میں امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی صلح کے بعد جس آدمی کو صحابیٔ رسول سیدنا قیس بن سعد رضی اللہ عنہما اور اُن کے لشکر کے لوگ امام ضلالت کہہ رہے ہیں اُسی آدمی کی بیعت کو کم وبیش دو برس قبل سیدنا جابر بن عبد اللہ اور ام المومنین سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے بھی بیعتِ ضلالت قرار دیا تھا۔ چنانچہ متعدد علماء

کرام لکھتے ہیں:

''معاویہ نے [یکے از طلقاء] بسر بن ابی ارطاۃ کوشام سے ایک لشکر کے ساتھ روانہ کیا تو وہ لشکر کو لے کر چل پڑا حتی کہ مدینہ منورہ پہنچا، اُس وقت وہاں کے گورنر رسول اللہ ﷺ کے صحابی سیدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ تھے تو وہ وہاں سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی طرف کوفہ بھاگ گئے۔ پھر بسر بن ابی ارطاۃ منبر نبوی پر چڑھ گیا اور انصار کو للکار کر کہنے لگا: یا دینار، یا زُریق، یا نجار! میں نے اس مقام پر سخی شیخ یعنی عثمان (رضی اللہ عنہ) سے عہد کیا تھا۔ اے اہل مدینہ! اگر مجھ سے امیر المومنین نے عہد نہ لیا ہوتا تو میں تمہارے ہر بالغ شخص کو قتل کر دیتا۔ اہل مدینہ نے اُس کے ہاتھ پر معاویہ کی بیعت کی، اور اُس نے بنو سلمہ کی طرف پیغام بھیجا اور کہا: خدا کی قسم! میرے ہاں تمہارے لیے کوئی امان نہیں اور نہ ہی تمہاری بیعت قبول ہے جب تک کہ تم صحابی رسول جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کو بیعت کے لیے پیش نہ کر دو۔ پس سیدنا جابر رضی اللہ عنہ خفیہ طور پر ام المومنین سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا:

يَا اُمَّهُ اِنِّي خَشِيْتُ عَلىٰ دِيْنِي وَهٰذِهٖ بَيْعَةُ ضَلَا لَةٍ.

''امی! میں اپنے دین پر خدشہ محسوس کرتا ہوں، کیونکہ یہ گمراہی کی بیعت ہے''۔

اماں پاک نے فرمایا: میرا خیال ہے کہ آپ بیعت کر لیں، میں نے اپنے بیٹے عمر بن ابی سلمہ کو بھی کہا ہے کہ وہ بھی بیعت کر لے۔ پس سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نکلے اور بسر بن ابی ارطاۃ کے ہاتھ پر معاویہ کی بیعت کر لی۔ اس کے بعد بسر نے مدینہ منورہ کے بہت سے گھروں کو مسمار کر دیا۔ پھر اُس نے مکہ مکرمہ کا رُخ کیا وہاں ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ گورنر تھے تو وہ روپوش ہو گئے۔ بسر کو یہ بات پہنچی تو اُس نے کہا: میں ابوموسیٰ کو اذیت نہیں دے سکتا، میں اُن کا حق اور فضیلت جانتا ہوں۔ پھر اُس نے یمن کا رُخ کیا اور وہاں اُس وقت عبیداللہ بن عباس بن عبدالمطلب سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے گورنر تھے، اُنہیں جب

بسر بن ابی ارطاۃ کے آنے کی اطلاع ملی تو وہ سیدنا علی ﷺ کی طرف چلے گئے، اور اپنا نائب عبداللہ بن المدان مرادی کو مقرر کر گئے۔ عبیداللہ بن عباس کے عائشہ بنت عبد اللہ بن عبد المدان سے دو بچے تھے، جو تمام بچوں سے زیادہ خوبصورت، پسندیدہ اور انتہائی صاف اور چمک دار تھے۔ بسر نے اُن دونوں بچوں کو اُن کی ماں کے سامنے ذبح کر دیا تو وہ بی بی دیوانی ہوگئی"۔

(تاريخ دمشق ج١٠ ص١٥٢، ١٥٣؛ تهذيب الكمال ج٤ ص٦٥؛ تاريخ الرسل والملوك والأمم ج٥ ص١٣٩؛ الكامل فی التاريخ ج٢ ص٧٣٢؛ أسد الغابة ج١ ص٣٧٤، ٣٧٥؛ مرآة الزمان ج٦ ص٤٠٧؛ البداية والنهاية ج١٠ ص٦٨٢، ٦٨٣؛ تاريخ الإسلام للذهبي ج٥ ص٣٦٩؛ تهذيب التهذيب ملخصًا ج١ ص٤٠٩؛ الإصابة (إشارةً ومثبتاً) ج١ ص٤٢٢)

امام بخاری نے بیعتِ معاویہ کے بارے میں ام المومنین سیدہ ام سلمہ اور سیدنا جابر بن عبداللہ ﷺ کے مکالمہ میں ام المومنین رضی اللہ عنہا کا یہ جملہ نقل کیا ہے:

أَنَا أَعْلَمُ أَنَّهَا بَيْعَةُ ضَلَالَةٍ.

"میں بھی جانتی ہوں کہ یہ گمراہی کی بیعت ہے"۔

(التاريخ الصغير للبخاري ج١ ص١٤١)

اِس سے قبل ٣٦ھ میں اُس عظیم صحابی نے بھی گروہِ معاویہ کو ضلالت پر قرار دیا تھا جن کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے ضمانت دی تھی کہ وہ شیطان سے محفوظ ہیں، یعنی سیدنا عمار بن یاسر ﷺ۔ ایک طویل حدیث میں ہے کہ اُنہوں نے صفین کے میدان میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

أَنَّهُمْ عَلَى الضَّلَالَةِ.

"وہ لوگ گمراہی پر ہیں"۔

(مسند أحمد ج٤ ص٣١٩ وط: ج٦ ص٤٠٥ حديث ١٩٠٩٠؛ صحيح ابن حبان ج١٥ ص٥٥٥، ٥٥٦ حديث ٧٠٨٠)

شیخ احمد شاکر نے کہا ہے: اس حدیث کی سند صحیح ہے۔

مسند أحمد، بتحقيق أحمد شاكر ج١٤ ص ٢٩٣ حديث١٨٧٨٦)

''شیخ شعیب الارنؤوط نے لکھا ہے: اس کے رجال ثقہ ہیں اور شیخین کے رجال ہیں، ماسوا عبداللہ بن سلمہ کے، وہ سنن اربعہ کا راوی ہے۔ ابن عدی کہتے ہیں: امید ہے کہ اُس میں کوئی حرج نہیں۔ امام ابن حبان، محدث عجلی اور یعقوب بن شیبہ نے اُس کی توثیق فرمائی ہے''۔

(تعليقات: الإحسان في تقريب صحيح ابن حبان ج١٥ ص٥٥٦)

خلیفہ اور سلطان میں فرق، از فاضل بریلی

غور فرمایئے! جو آدمی خلیفۂ راشد کے معزول کرنے پر اُن کے مدمقابل آ گیا اور پھر اُسی خلیفۂ راشد کی حیات میں اور اُن کے ہی دورِ خلافت میں بزورِ تلوار اپنی بیعت لیتا رہا، حالانکہ وہ جس خلیفہ کی طاعت سے منحرف تھا اُس خلیفۂ راشد کے بارے میں زبانِ نبوی ﷺ سے ثابت ہے کہ حق ہر حال میں اُسی کے ساتھ ہوگا بلکہ اُن کے حق میں یوں انوکھی دعا بھی منقول ہے کہ ''یا اللہ جدھر وہ جائے حق کو اُدھر کر دے'' سو اگر اُس خلیفۂ راشد کے منکر کو سیدنا عمار بن یاسر، اُم المومنین سیدہ اُم سلمہ، سیدنا جابر بن عبداللہ، سیدنا قیس بن سعد اور اُن کے رفقاء رضی اللہ عنہم امامِ ضلالت نہ کہتے تو اور کیا کہتے؟ دراصل شرعی اصول یہ ہے کہ بیک وقت روئے زمین پر فقط ایک ہی خلیفہ ہو سکتا ہے، اور دوسرے لوگ اُسی کے تقرر سے اُس کے گورنر اور نائب وغیرہ ہوتے ہیں اور اُس کے عزل سے اُن کا معزول ہونا واجب ہوتا ہے۔ بخلاف خلیفہ کے کہ اُس کو بلا عذرِ شرعی معزول نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ فاضل بریلی لکھتے ہیں:

''کوئی سلطان اپنے انعقادِ سلطنت میں دوسرے سلطان کے اذن کا محتاج نہیں مگر ہر سلطان اذنِ خلیفہ کا محتاج ہے کہ بے اُس کے اُس کی حکومت شرعی و مرضی (پسندیدہ) شرع نہیں ہو سکتی''۔

موصوف اِس سے اگلے فقرہ میں لکھتے ہیں:

''خلیفہ بلاوجہ شرعی کسی بڑے سے بڑے سلطان کے معزول کیے معزول نہیں ہو سکتا، بخلاف سلطان کے کہ خلیفہ کا صرف زبان سے کہہ دینا: میں نے تجھے معزول کیا اس کے عزل کو بس ہے''۔

(فتاوی رضویہ ج١٤ ص١٨٦)

فاضل بریلی اِس سے ایک صفحہ قبل لکھتے ہیں:

''خلیفہ حکمرانی وجہانبانی میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ (وآلہ) وسلم کا نائب مطلق، تمام امت پر ولایتِ عامہ والا ہے، شرح عقائد نسفی میں ہے:

(خلافتهم) أي نيابتهم عن الرسول في إقامة الدين بحيث يجب على كافة الأمم الاتباع.

اُن کی خلافت، یعنی دین کی اقامت میں رسول اللہ ﷺ کی نیابت کا مقام یہ ہے کہ تمام امت پر اس کی اتباع واجب ہے۔

خودسر کفار کا اُسے نہ ماننا شرعاً اُس کے استحقاقِ ولایتِ عامہ میں مخل نہیں، جس طرح اُن کا خود نبی کو نہ ماننا، یونہی روئے زمین کے مسلمانوں میں جو اُسے نہ مانے گا اُس کی خلافت میں خلاف نہ آئے گا یہ خود ہی باغی قرار پائے گا''۔

(فتاوی رضویہ ج١٤ ص١٨٥)

فاضل بریلی کے پہلے دو پیراگراف سے واضح ہے کہ خلیفہ جس شخص کو معزول کردے تو اُس کا منصب پر براجمان رہنا شریعت کے خلاف ہے، اور شریعت کی خلاف ورزی یقیناً ضلالت ہے۔

تیسرے پیراگراف میں ہے کہ خلیفہ کی اطاعت پوری امت پر واجب ہے اور جو شخص اُس کو خلیفہ نہ مانے تو وہ باغی ہے، اور ظاہر ہے کہ بغاوت ہدایت نہیں ضلالت ہوتی ہے ﴿حَتّٰی تَفِيْٓءَ اِلٰٓی اَمْرِ اللّٰهِ﴾ (یہاں تک کہ باغی حکم الٰہی کی طرف پلٹ آئے)۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بعض طلقاء بنیادی طور پر بھی خلافت کے لیے موزوں نہیں تھے، لیکن چونکہ وہ سابقہ ادوار میں گورنر بنادیے گئے تھے اور تقریباً دو دہائیوں تک ایک ہی

مقام پر گورنر رہنے کی وجہ سے طاقت ور ہو گئے تھے، اِس لیے جب اُنہیں سیدنا علی ﷺ نے معزول کر دیا تو وہ اُسی طاقت کے زور پر بغاوت پر اُتر آئے، حالانکہ اُن پر خلیفۂ برحق کی اطاعت واجب تھی، اور اُنہیں خلیفہ کا صرف زبان سے کہہ دینا: ''میں نے تجھے معزول کیا'' اُن کے عزل کے لیے کافی تھا، لیکن چونکہ وہ معزول نہ ہوئے، لہٰذا باغی قرار پائے، اور بغاوت ایسا کبیرہ گناہ ہے کہ چاروں فقہی مذاہب کے علماء کے نزدیک اُس کے مرتکب کی فقط تکفیر جائز نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ خلافتِ مرتضوی سے قبل کے ادوار میں بعض طلقاء کا گورنر ہونا ناجائز تھا، سیدنا علی ﷺ کے معزول کرنے کے بعد اُن کا معزول ہونا واجب تھا اور بضد منصب پر باقی رہنا شوافع کی اصطلاح کے مطابق حرام اور احناف کے مطابق مکروہ تحریمی تھا، لیکن چونکہ وہ منصب پر براجمان رہے اِس لیے اُن کی یہ ضد شرع شریف میں ضلالت ٹھہری، لہٰذا خود بتلائیے کہ جب بنیاد ہی ضلالت پر ہو تو باقی ڈھانچہ ہدایت پر کیونکر ہوسکتا ہے؟ لہٰذا یہ جس نے بھی کہا ہے حق کہا ہے۔

خشت اول چون نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

''یعنی کاری گر جب پہلی اینٹ ٹیڑھی رکھے تو ثریا تک پوری دیوار ہی ٹیڑھی جاتی ہے''۔

''أَصْحَابِيْ كَالنُّجُوْمِ'' کے مؤیدین سے سوال

کیا ''أَصْحَابِيْ كَالنُّجُوْمِ'' کے مؤیدین کے نزدیک صحابیٔ رسول سیدنا عمار بن یاسر، صحابیٔ رسول سیدنا جابر بن عبداللہ، صحابیہ اور زوجۂ رسول اُم المومنین سیدہ اُم سلمہ اور صحابیٔ نبی سیدنا قیس بن سعد ﷺ کا قول بھی باعث ہدایت ہے یا نہیں، یا اُن کے نزدیک ''أَصْحَابِيْ كَالنُّجُوْمِ'' کے مصداق فقط طلقاء ہی ہیں؟ اِن سب صحابہ کرام ﷺ نے معاویہ کو ضلالت اور بطلان پر گامزن کہا ہے، لہٰذا ''أَصْحَابِيْ كَالنُّجُوْمِ'' کے مؤیدین کے نزدیک قابلِ اتباع یہ صحابہ کرام ﷺ ہیں یا معاویہ؟ یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ امام حسن ﷺ بھی معاویہ کو باغی اور خوارج سے زیادہ برا سمجھتے تھے اور وہ جانتے تھے کہ جس طاقت کے بل بوتے پر معاویہ نے اُن کے بابا سے بغاوت کی تھی اُسی طاقت کے بل بوتے پر وہ اُن کے مقابلہ میں آیا ہے، اسی

لیے اُنہوں نے بامرِ مجبوری صلح فرمائی تھی، لہٰذا اُن کے صلح کر لینے کے باوجود سیدنا قیس بن سعد رضی اللہ عنہ کا معاویہ کو امامِ ضلالت کہنا حق تھا، اور اُن کے اُس قول میں سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی مخالفت نہیں تھی۔ امام پاک دراصل مکمل طور پر اپنے بابا کے موقف پر تھے اور اُن کے بابا کریم علیہ السلام کا موقف یہ تھا کہ وہ معاویہ کو کسی قسم کی جنگ اور اُس کے انکارِ طاعت سے پہلے ہی اُس کو گمراہ کن اور کتاب وسنت سے روگرداں سمجھتے تھے، جیسا کہ چند سطور بعد اُن کی تصریح آرہی ہے۔

یہاں "أَصْحَابِيْ كَالنُّجُوْمِ" کے مؤیدین سے دوسرا سوال یہ ہے کہ جب وہ اِس موضوع روایت کا اطلاق طلقاء پر بھی کرتے ہیں تو پھر وہ خلافتِ راشدہ کے قیام کا مطالبہ کیوں کرتے ہیں، طلقاء کی ملوکیت کے طرزِ حکومت کا مطالبہ کیوں نہیں کرتے؟

لیکن یہاں یہ پہلو قابل لحاظ ہے کہ خلافتِ راشدہ کے قیام کا خوبصورت مطالبہ اکثر وہ مسلمان کرتے ہیں جن سے اقتدار دور ہو، ورنہ خلافتِ راشدہ کا قیام خالہ جی کا گھر نہیں، یہی وجہ ہے کہ دنیا میں کسی بھی مسلم ملک میں خلافت راشدہ کے طرز پر کوئی حکومت نہیں، حتیٰ کہ حجاز مقدس میں ملوکیت کا دور دورہ ہے۔ چنانچہ وہاں آزادئ اظہارِ رائے پر مکمل طور پر پابندی ہے، اگر وہاں کوئی حق گوئی کی کوشش کرے تو اُسے سیدنا حجر بن عدی رضی اللہ عنہ کی طرح تہ تیغ کر دیا جاتا ہے۔ وہاں عملاً خلافتِ راشدہ نہیں بلکہ طلقاء کی ملوکیت کا طوطی بولتا ہے اور اسی کو ہی وہ اسلامی حکومت سمجھتے اور باور کرانا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تین چار دہائیوں تک ہندو پاک وغیرہ میں مخصوص مکاتب فکر پر سرمایہ خرچ کرتے رہے اور اُن سے بظاہر محبتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا خوبصورت نعرہ لگوا کر بباطن بعض طلیق ملوک کو اسلام کا ہیرو ثابت کرانے کی کوشش کراتے رہے، تاکہ وہ دنیا کو باور کرسکیں کہ اُن کی یہ حکومت بھی دراصل "أَصْحَابِيْ كَالنُّجُوْمِ" پر ہی عمل ہے۔

اب شاید حجاز مقدس کے حکمران ہندو پاک کے اُن مکاتب فکر سے مایوس ہو گئے ہیں، کیونکہ اب اُنہوں نے اپنی فیاضی کا کچھ رُخ اُن مکاتبِ فکر کی طرف بھی کر دیا ہے جن کا شمار یارسول اللہ کہنے والوں میں ہوتا ہے۔ اگر عقل مند لوگ "بے خطا بے گناہ......" کے نعرے اور عمامہ باندھنے کی پابندی اور خاص رنگ کی پابندی اُٹھانے میں غور وفکر کریں تو اُن پر پس پردہ حقائق آشکار ہوتے چلے جائیں گے۔ افسوس کہ

یارسول اللہ کہنے والے لوگ اُن نجدیوں کے دامِ فریب میں آ گئے جن کے ہاں علی، غلام علی، حسن، غلام حسن، حسین، غلام حسین، غلام فاطمہ، کنیز فاطمہ اور عباس و غلام عباس وغیرہ نام رکھنا معیوب ہے اور معاویہ نام رکھنا پسندیدہ ہے۔ اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَجْعَلُکَ فِیْ نُحُوْرِھِمْ وَنَعُوْذُ بِکَ مِنْ شُرُوْرِھِمْ.

میں بعض مُضِلِّیْن کو معاون نہیں بنا سکتا، علیؓ

واضح رہے کہ معاویہ پر سود کے معاملہ میں سیدنا عبادہ بن الصامت اور سیدنا ابوالدرداء رضی اللہ عنہما کا برہم ہونا، اُس کے سامنے اُس کی حرمت پر حدیثِ نبوی پیش کرنا اور اُس کا حدیث پر اپنی رائے کو ترجیح دینا۔ پھر سیدنا عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ کا شراب فروشی کے معاملہ میں اُس کی مزاحمت کرنا وغیرہ امور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت سے پہلے کے معاملات ہیں، ایسے تمام امور کا ارتکاب سیدنا عمر بن الخطاب اور عثمان بن عفان رضی اللہ عنہما کے دور میں ہوا تھا۔ بعض احادیث صحیحہ سے اشارۃً اور کنایۃً معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اِس قسم کے معاملات سے کافی پریشان تھے اور وہ کوئی اہم قدم اٹھانا چاہتے تھے اور اپنے آخری حج میں مکۃ المکرمہ میں ہی اُس کے بارے میں کوئی اہم اعلان بھی کرنا چاہتے تھے مگر حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ نے اُنہیں مشورہ دیا تھا کہ وہ لوگوں کے اتنے بڑے ہجوم میں ایسا اعلان نہ کریں، کہیں ایسا نہ ہو کہ شور و شرابہ کی وجہ سے لوگ اُن کی بات کا غلط مطلب نکال لیں، مناسب ہے کہ ایسا اعلان مدینہ منورہ میں کیا جائے، لیکن افسوس کہ باقاعدہ اس قسم کے اہم اعلان سے قبل ہی مدینہ منورہ پہنچنے پر اُنہیں شہید کر دیا گیا تھا۔ اُنہیں جس شخص نے بلاوجہ قتل کیا تھا وہ مغیرہ بن شعبہ ثقفی کا غلام تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہلے ہی فرمادیا تھا:

اَلْمُھَاجِرُوْنَ وَالْاَنْصَارُ بَعْضُھُمْ اَوْلِیَاءُ بَعْضٍ فِی الدُّنْیَا وَالآخِرَۃِ ، وَالطُّلَقَاءُ مِنْ قُرَیْشٍ ، وَالْعُتَقَاءُ مِنْ ثَقِیْفٍ ، بَعْضُھُمْ اَوْلِیَاءُ بَعْضٍ فِی الدُّنْیَا وَالآخِرَۃِ.

''مہاجرین و انصار دنیا اور آخرت میں ایک دوسرے کے دوست ہیں، اور قریش کے طلقاء اور ثقیف کے عتقاء دنیا اور آخرت میں ایک دوسرے کے دوست ہیں''۔

(مسند أحمد ج٤ ص ٣٦٤ وط: ج٦ ص ٥١٣ حديث ١٩٤٢٧؛ صحيح ابن حبان ج١٦ ص

۲۵۰ حدیث ۶۰ ۷۲۲؛ المستدرك ج ٤ ص ۸۰؛ المعجم الكبير ج ۲ ص ۳۱۳، ۳۱٤ حديث ۲۳۱۰، ۲۳۱۱ و ص ۳٤۳ حديث ۲٤۳۸؛ مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۱۵)

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ مغیرہ بن شعبہ ثقفی کے غلام نے کس کی انگیخت پر یہ قدم اٹھایا ہوگا، البتہ یہ بات محتاجِ وضاحت نہیں کہ مغیرہ بن شعبہ ثقفی نے قریش کے طلیق معاویہ سے بعد میں فوائد حاصل کیے تھے اور اُس کی حکومت میں تادم حیات گورنر رہے تھے۔ خیر یہ اندازے اور قیاس ہیں، اِن کا کوئی نقلی ثبوت نہیں ہے، اگر نقلی ثبوت مانگا جائے تو اُسے پیش کرنے میں یوں ہی ناکامی رہے گی جس طرح شہید مرتضیٰ بھٹو اور شہید بے نظیر بھٹو کے قاتلین کے بارے میں ناکامی کا سامنا ہے۔

ہمارا حسنِ ظن یہ ہے کہ سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ بھی بعض طلقاء کے مذکورہ بالا اعمالِ سیۂ کی وجہ سے دل برداشتہ تھے اور وہ کوئی قدم اُٹھانا چاہتے تھے مگر اُنہیں بھی راستہ سے ہٹا دیا گیا۔ اگر پوچھا جائے کہ یہ کام کس نے کیا اور کیسے کیا؟ تو اِس کی واضح تفصیل کسی کے پاس نہیں ہے، البتہ اِس سلسلے میں معاویہ بن ابی سفیان کے بعض معاصرین (عبداللہ بن سعد بن ابی سرح) کا مافی الضمیر نقل ہو کر ہم تک پہنچا ہے، اُس میں اگر کوئی غور کرنا چاہے تو وہ گذشتہ صفحات میں لکھا جا چکا ہے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے بارے میں تو فقط قتل کی خواہش کا ذکر ملتا ہے، خود سوچیے کہ جس خلیفہ نے خود معاویہ بن ابی سفیان کی معزولی کا حکم سنا دیا تھا وہ اُس کے نزدیک کتنا مبغوض ہوگا؟ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اُسے معزول کر دیا تھا اور اِس لیے معزول کیا تھا کہ وہ اُسے "ضَالٌّ" (گمراہ) ہی نہیں بلکہ "مُضِلٌّ" (گمراہ کن) بھی سمجھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جو گورنر ہونے کی حیثیت سے سود اور شراب فروشی کو جائز سمجھے تو وہ محض گمراہ نہیں ہوتا بلکہ گمراہ کن بھی ہوتا ہے۔ شاید بعض لوگوں کو یہ الفاظ اوپرے محسوس ہو رہے ہوں تو آیئے خود مولیٰ علی علیہ السلام سے ہی سن لیجیے۔ امام ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید کر دیے گئے اور لوگوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی تو مغیرہ بن شعبہ نے اُن کے پاس آ کر عرض کیا: امیر المومنین! آپ کے لیے میرے پاس ایک نصیحت (خیر خواہی) ہے۔ اُنہوں نے فرمایا: وہ کیا ہے؟ کہا: اگر آپ

چاہتے ہیں کہ آپ کا معاملہ مضبوط ہو جائے تو پھر آپ طلحہ بن عبید اللہ (رضی اللہ عنہ) کو کوفہ کا اور زبیر بن العوام (رضی اللہ عنہ) کو بصرہ کا گورنر مقرر کر دیں اور معاویہ کو اُس کے منصب پر شام میں برقرار رہنے دیں حتیٰ کہ اُس پر آپ کی اطاعت لازم ہو جائے، پھر جب آپ کی خلافت مضبوط ہو جائے تو آپ جو چاہیۓ گا کیجئے گا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: طلحہ اور زبیر کے بارے میں تو میں عنقریب سوچوں گا، باقی رہا معاویہ تو اللہ تعالیٰ کی قسم! اللہ تعالیٰ مجھے نہ تو اُس کو گورنر بنانے کی راہ دِکھا رہا ہے اور نہ ہی معاون بنانے کی جب تک کہ وہ اپنی موجودہ حالت پر قائم رہے، لیکن میں اُس کو اُس امر میں شمولیت کی دعوت دوں گا جس میں دوسرے مسلمان شامل ہوئے ہیں، پھر اگر اُس نے انکار کیا تو اُس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ (کتابِ الٰہی) کے سپرد کروں گا۔ مغیرہ کی نصیحت جب قبول نہ کی گئی تو وہ غضبناک حالت میں نکل کر چلا گیا۔ پھر دوسرے دن آکر کہنے لگا: امیر المومنین! میں نے جو کل آپ سے گذارش کی تھی، بعد میں میں نے اُس میں غور وفکر کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ آپ کو خیر کی توفیق دی گئی ہے، لہٰذا آپ حق کو طلب فرمائیں، یہ کہہ کر باہر چلا گیا۔ جب وہ باہر نکل رہا تھا تو سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ سے اُس کا آمنا سامنا ہوا۔ اُنہوں نے اپنے بابا سے دریافت کیا: آپ کو اِس بھینگے نے کیا کہا ہے؟ فرمایا: کل اِس نے میرے پاس آکر یوں کہا تھا اور آج یہ کہا ہے۔ اُنہوں نے عرض کیا: بخدا! کل اُس نے آپ کے ساتھ خیر خواہی کی اور آج اُس نے مکر کیا ہے۔ اِس پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے امام حسن رضی اللہ عنہ کو فرمایا:

إِنْ أَقْرَرْتُ مُعَاوِيَةَ عَلٰى مَا فِيْ يَدِهٖ كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا.

''اگر میں معاویہ کو اُس کی موجودہ حالت واختیار پر قائم رکھوں تو میں گمراہ کن کو معاون بنانے والا ٹھہروں گا''۔

(الاستيعاب في معرفة الأصحاب ج۲ص ۲٦۰، في ترجمة مغيرة بن شعبة)

علامہ سبط ابن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ نے مغیرہ بن شعبہ کے اِس مشورہ کا تذکرہ تفصیلاً کیا ہے، اُنہوں نے ایک بات یہ بھی لکھی ہے کہ مغیرہ نے مولا علی ؑ کو کہا: آپ ابن عامر، معاویہ اور حضرت عثمان ؓ کے دوسرے عمّال کو اُن کے مناصب پر برقرار رہنے دیں یہاں تک کہ سب لوگ آپ کی بیعت کرلیں، پھر بعد میں اُنہیں معزول کردینا۔ یہ الفاظ بھی منقول ہیں کہ آپ اُنہیں ایک مہینہ برقرار رہنے دیں تا کہ آپ کا معاملہ مضبوط ہوجائے پھر ہمیشہ کے لیے معزول کردینا۔ سیدنا ابن عباس ؓ کو مغیرہ بن شعبہ کے اِس آنے جانے کے متعلق معلوم ہوا تو اُنہوں نے مولا علی ؑ کو عرض کیا: پہلے روز مغیرہ نے آپ کو خیر خواہانہ مشورہ دیا ہے اور دوسرے دن اُس نے آپ کو دھوکہ دینے کی کوشش کی ہے۔ سیدنا علی ؑ نے فرمایا: وہ کیسے؟ اُنہوں نے عرض کیا:

لِأَنَّ بَنِي أُمَيَّةَ وَمُعَاوِيَةَ أَصْحَابُ دُنْيَا ، فَمَتٰى أَبْقَيْتَهُمْ لَمْ يُبَالُوْا مَنْ وَلِيَ بِهٰذَا الْأَمْرِ ، وَمَتٰى عَزَلْتَهُمْ أَخَذُوْا هٰذَا الْأَمْرَ بِغَيْرِ شُوْرٰى ، وَقَالُوْا قَتَلَ صَاحِبَنَا ، وَأَلَّبُوْا عَلَيْكَ.

''اس لیے کہ بنوامیہ اور معاویہ دنیادار لوگ ہیں، سو جب آپ اُنہیں برقرار رکھیں گے تو اُنہیں کوئی پروا نہیں ہوگی کہ خلیفہ کون ہے اور جونہی آپ اُنہیں معزول کریں گے تو وہ اس امر کو شوریٰ کے بغیر لے لیں گے اور کہیں گے اس نے ہمارے صاحب کو قتل کیا ہے اور آپ کے خلاف جمع ہوجائیں گے''۔

اِس پر سیدنا علی علیہ السلام نے فرمایا:

أَمَّا مَا ذَكَرْتَ مِنْ إِقْرَارِهِمْ ، فَمَا أَشُكُّ أَنَّهُ خَيْرٌ فِيْ عَاجِلِ الدُّنْيَا وَ صَلَاحِهَا ، وَأَمَّا الَّذِيْ يَلْزَمُنِيْ مِنَ الْحَقِّ وَالْمَعْرِفَةِ بِهِمْ فَلَا يَحِلُّ لِيْ أَنْ أُبْقِيَ مِنْهُمْ وَاحِدًا سَاعَةً مِنْ نَهَارٍ.

''آپ نے جو اُنہیں مقرر رکھنے کا کہا ہے تو مجھے کوئی شک نہیں کہ فی الحال اِس میں دنیوی فائدہ اور اُس کی درستگی مضمر ہے، لیکن مجھ پر جو حق لازم ہے اور جو اُن لوگوں

کی حقیقت عیاں ہے تو میرے لیے حلال نہیں کہ میں اُن میں سے کسی کو دِن کے ایک گھنٹہ کے لیے بھی مقرر رکھوں"۔

(مرآۃ الزمان ملخصا ج٦ ص ٥٦، ٥٧)

خدا جانے کہ مولیٰ علی علیہ السلام اُن لوگوں کی اصلیت سے کتنا آشنا ہوں گے کہ اُنہیں ساعتِ یوم کے لیے بھی اُن کے منصب پر قائم رکھنا حلال نہیں سمجھتے تھے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی معرفت، اُن کا علمی رسوخ، مخصوص فہم، فراست، بصیرت اور رِجس سے طہارت کی قوت اُن کے پاؤں کی ایسی زنجیر تھی جو اُنہیں دنیوی مصلحتوں کی طرف جانے سے روکتی تھی، حتیٰ کہ وہ پل بھر کے لیے بھی دین پر دنیوی فوائد کو ترجیح دینے کے روادار نہیں تھے، اِسی لیے وہ گوناگوں مشکلات کا شکار رہے۔ شاید درجِ ذیل جملہ جو کہ حقیقت پر مبنی ہے، علامہ سید ابوالحسن علی ندوی کی کسی کتاب میں میرے سامنے آیا تھا کہ:

"سیدنا علی رضی اللہ عنہ پر جو شدید مشکلات آئیں وہ اُن کی عبقریت کی زکات تھی"۔

خلاصہ یہ ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ ویسے بھی بنوامیہ کے طلقاء کی فطرت سے آگاہ تھے اور سیدنا عمرو عثمان رضی اللہ عنہما کے دور میں بھی معاویہ سے جو کتاب وسنت کی خلاف ورزی ہوتی رہی اُس سے بھی باخبر تھے، اس لیے اُنہوں نے شروع ہی سے معاویہ کو گورنری کی سیٹ پر قائم رکھنا جائز نہ سمجھا۔ اگر وہ قائم رکھتے تو قصاص وغیرہ کی کوئی تحریک چلتی اور نہ ہی سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قاتل یا قاتلین کا سہولت کار اور پشت پناہ کہا جاتا، اور نہ ہی معاویہ حضرت عثمان کا وارث و ولی بنتا اور نہ ہی سیدنا علی اور اُن کے بعد حسنین کریمین رضی اللہ عنہما مصائب ومشکلات کا شکار ہوتے۔

یہاں سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ معاویہ اگر معزولی کے حکم کو قبول کر لیتا تو تب بھی وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کا نعرہ نہ لگاتا، کیونکہ اِس قسم کے نعرے عوامی قوت کے بغیر نہیں لگائے جاسکتے اور عوامی حمایت حاصل کرنے کے لیے کسی نعرے کا ہونا ضروری ہوتا ہے، اور ظاہر ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کے دعویٰ سے زیادہ خوبصورت نعرہ کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ اِن الفاظ کو محض میرا تخیل نہ سمجھا جائے بلکہ اِس پر مذکورہ بالا عبارت کے علاوہ اُس دور کے متعدد صحابہ اور دوسرے معاصرین کے مزید اقوال و آراء بھی موجود

ہیں، جن کا باحوالہ تذکرہ اِن شاء اللہ ہم اپنی کتاب ''اَلْفِئَۃُ الْبَاغِیَۃُ'' میں کریں گے۔

مولانا بنوری کا بصیرت افروز تبصرہ

یاد رہے کہ شریعت میں بغاوت فقط اُس ہٹ دھرمی کو کہا جاتا ہے جو طاقت کی بنا پر ہو، تاہم چونکہ سیدنا علی ﷺ معاویہ کو پہلے سے ہی گمراہ کن سمجھتے تھے اور اِسی لیے اُنہوں نے اُس کی معزولی کا حکم صادر فرمایا تھا تو اُس کی اصلیت کھل کر سامنے آگئی اور قیامت تک کے لیے غیر متعصب مسلمانوں پر اسلام پسند اور دنیا پسند لوگ واضح ہوئے، قرآن کی تاویل سمجھ آئی اور بغاوت وغیرہ کے مسائل واحکام وجود میں آئے۔ ہر چند کہ تاویلِ قرآن کی تکمیل کی اہل اسلام کو بھاری قیمت چکانا پڑ گئی تاہم اس کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اسلام کا اصلی چہرہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا۔ چنانچہ علامہ مولانا محمد یوسف بنوری نے اپنے الفاظ میں اِسی حقیقت کو یوں بیان کیا ہے۔ وہ علامہ محمد انور شاہ صاحب کشمیری کی کتاب ''إکفار الملحدین'' کے تعارفی الفاظ میں لکھتے ہیں:

> ''مشیتِ الٰہی سے عہد عثمانی میں عہد فاروقی جیسا تدبر و تیقّظ قائم نہ رہ سکا، اس لیے مریض القلب لوگوں نے خصوصاً نام نہاد مسلمان یہودیوں نے خفیہ ریشہ دوانیاں شروع کر دیں تا آنکہ حضرت عثمان غنی ﷺ شہید ہو گئے اور اب چاروں طرف سے علی الاعلان فتنوں نے سر اٹھایا۔ حضرت علی ﷺ کے عہد میں ان فتنوں کا بازار ''حرب و پیکار'' کی شکل میں گرم ہونا شروع ہو گیا اور اسلام کو شدید ترین داخلی و خارجی خطرات کا سامنا کرنا پڑا۔ اگر حضرت علی المرتضیٰ ﷺ جیسی عظیم شخصیت نہ ہوتی تو شاید اسلام ختم ہو جاتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اُن کے حلم و فراست کی برکت سے اسلام کی حفاظت فرمائی۔ جس طرح عہد صدیقی میں فتنۂ ارتداد اور مانعین زکوٰۃ کا فتنہ پوری قوت کے ساتھ رونما ہوا تھا اور اللہ تعالیٰ نے حزم و عزم صدیقی کی برکت سے اسلام کی حفاظت کی تھی، ٹھیک اسی طرح فتنۂ خوارج و شیعت کی شدت کی وجہ سے خلافت علی مرتضیٰ ﷺ میں زوالِ اسلام کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا، اسلام تو بچ گیا لیکن ''جنگ جمل'' اور ''جنگ صفین'' جیسے دردناک

واقعات اور خونچکاں حوادث ضرور رونما ہوئے''۔

(تعارف: اِکفار الملحدین ص ۳۲)

نوٹ:

اِس تفصیل میں یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ سیدنا علی ؓ کے کلام میں ''کُنتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّیْنَ عَضُدًا'' یعنی معاویہ کو ''مُضِلٌّ'' (گمراہ کن) قرار دینے کے الفاظ سیدنا امام حسن ؓ نے اپنے بابا سے خود سنے تھے، لہٰذا اِس سے ثابت ہوا کہ معاویہ کے بارے میں اُن کا موقف بھی یہی تھا، کیونکہ اُن کا اپنے بابا کریم علیہ السلام کے بارے میں عقیدہ تھا کہ وہ چشم زدن کے برابر بھی کبھی شک وتذبذب کا شکار نہیں ہوئے۔ جیسا کہ آئندہ صفحات میں باحوالہ اُن کا کلام آرہا ہے۔

ہماری عقیدت کا عالَم!

قارئین کرام! یہاں میں اپنی اور اپنے مکتبِ فکر کے لوگوں کی عقیدت کا نمونہ پیش کرنا چاہتا ہوں، تاکہ آپ جان سکیں کہ جب ہم ماننے پرآتے ہیں تو کتنا مانتے ہیں، لیکن ہماری عقیدت کو جاننے سے قبل یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ راقم الحروف باقاعدہ چشتی بھی ہے اور قادری بھی۔ ہم سنیوں کی عقیدت کا نمونہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں پیرانِ پیر سیدنا و مرشدنا غوث اعظم شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے اعلان ''قَدَمِیْ هٰذِهٖ عَلٰی رَقَبَةِ كُلِّ وَلِیِّ اللّٰهِ'' (میرا یہ قدم ہر ولی کی گردن پر ہے) کے بعد جو شخص اُن کے قدم کو اپنی گردن پر نہ مانے تو کہا جاتا ہے کہ اُس کی گردن پر سور (خنزیر) کا قدم ہے۔ یہ ہر اُس شخص کے بارے میں کہا جاتا ہے جو سیدنا عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کو ولی تو مانے لیکن اُن کا قدم اپنی گردن پر نہ مانے، حالانکہ یہ فرمان قرآن کی آیت یا حدیث نبوی نہیں ہے مگر پھر بھی ہم غوث اعظم ؓ کے اِس فرمان کے منکر کو نہ جانے کیا کیا سمجھتے ہیں۔ دوسری طرف جس ہستی کی اتباع کا قرآن وحدیث میں حکم آیا ہے، جس ہستی کو حدیث پاک میں محبوبِ خدا و مصطفیٰ ﷺ فرمایا گیا ہے، جس ہستی کے بارے میں فرمایا گیا کہ میں جس کا مولیٰ ہوں تو علی بھی اُس کا مولیٰ ہے، جو اُس کو مولا نہ مانے تو اُس کا کوئی مولا نہیں، جس ہستی کے بارے میں دعا فرمائی گئی کہ اے

ﷺ! جو اُس سے محبت کرے تو اُس سے محبت کر اور جو اُس سے دشمنی رکھے تو اُس کا دشمن بن جا، اور جس ہستی کی محبت کو ایمان اور بغض کو منافقت فرمایا گیا ہے، بعض طلقاء اُس ہستی کے قدم کو اپنی گردن پر تو کیا سمجھتے اُنہیں خلیفہ ہی تسلیم نہ کیا، اُنہیں امیر المومنین نہ مانا، اُن پر سبّ وشتم کیا اور اُن کے ساتھ جنگیں کیں، اِس کے باوجود ہم اُن بعض طلقاء کو اپنا سیدنا، سردار، امیر المومنین، مجتہد اور اجر وثواب سے مالا مال سمجھتے ہیں۔ ہماری عقیدت کا عالم تو دیکھئے! کیا ہم ایسی عقیدت پر دادو تحسین کے مستحق نہیں؟

صلحِ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام ومعاویہ

کراہت ونا گواری کے باوجود صلح سے کون سی صلح مراد ہوسکتی ہے؟ اِس سلسلے میں کئی اقوال ہیں۔ اوپر آپ صحیحین کے حوالے سے "خَیْرَیْنِ" (دو بھلائیوں) کا ذکر پڑھ چکے ہیں۔ اُن میں سے دوسری خیر کے بارے میں علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

وَالْخَیْرُ الثَّانِيُ: اِجْتِمَاعُ النَّاسِ لَمَّا اصْطَلَحَ الْحَسَنُ وَمُعَاوِیَةُ ، لٰکِنْ کَانَ صُلْحًا عَلٰی دَخَنٍ ، وَجَمَاعَةٌ عَلٰی أَقْذَاءٍ.

"اور دوسری خیر لوگوں کا وہ اجتماع ہے جو امام حسن اور معاویہ کی صلح کے وقت ہوا، لیکن وہ صلح کینہ پر تھی اور اجتماع کدورتوں پر تھا"۔

(منهاج السنة ج ۱ ص ۵۶۰)

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی لکھتے ہیں:

وَهُدْنَةٌ عَلٰی دَخَنٍ ، الصُّلْحُ الَّذِيْ وَقَعَ بَیْنَ مُعَاوِیَةَ وَالْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا.

"نا گواری کے باوجود صلح سے مراد وہ صلح ہے جو معاویہ اور سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے مابین واقع ہوئی"۔

(حجة الله البالغة ج ۲ ص ۵۷۹)

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

فِيهِ إِشْعَارٌ إِلىٰ أَنَّهُ صَلَاحٌ مَّشُوبٌ بِالْفَسَادِ ، فَيَكُونُ إِشَارَةً إِلىٰ صُلْحِ الْحَسَنِ مَعَ مُعَاوِيَةَ وَتَفْوِيضُ الْمُلْكِ إِلَيْهِ وِاسْتِقْرَارُ أَمْرِ الإِمَارَةِ عَلَيْهِ ، وَبِهٖ يَظْهَرُ أَنَّ مُعَاوِيَةَ بِصُلْحِ الْحَسَنِ لَمْ يَصِرْ خَلِيْفَةً.

''اِس میں اِس طرف باریک رمز ہے کہ وہ فساد آمیز صلح ہوگی ،سواِس میں سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی معاویہ کے ساتھ صلح ،اُسے ملک سپرد کرنے اور امرِ امارت کا اُس پر قرار پکڑنے کی طرف اشارہ ہے،اوراسی سے ظاہر ہوا کہ صلح امام حسن علیہ السلام کی وجہ سے معاویہ خلیفہ نہیں ہوگیا تھا''۔

(مرقاةالمفاتيح: كتاب الفتن، الفصل الثاني ج ١٠ ص ٢٣ حديث ٥٣٩٦)

ظاہر ہے کہ جو شخص اقتدار کا خواہاں تھا اُسے تو یہ صلح پسند تھی،لہٰذا اب یہ کوئی معمہ نہ رہا کہ جسے یہ صلح ناگوار تھی وہ کون تھا؟ اظہر من الشمس ہے کہ سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کو یہ صلح ناگوار تھی،لیکن انہوں نے جانبین کے اہل اسلام کی حفاظت کی خاطر ایک نااہل اور غیر مستحق شخص سے صلح کر کے اُسے سلطنت سونپ دی، حالانکہ اُس سے ہزار ہا درجہ بہتر لوگ موجود تھے،جیسا کہ ہم اُن میں سے چند حضرات کے اسماء درج کر چکے ہیں۔رہ گئی یہ بات کہ یہ صلح دھوکہ، خیانت اور نفاق پر ہوگی تو یہ بھی ظاہر ہے کہ دھوکہ، خیانت اور نفاق کی نسبت اُس شخص کی طرف کی جاتی ہے جو موقع پر تو شرائطِ صلح کو قبول کر لیتا ہے لیکن بعد میں اُن شرائط کو پورا نہیں کرتا۔نیز یہ بھی ظاہر ہے دھوکہ، خیانت اور نفاق وغیرہ یہ سب ''رِجْــــس'' ہیں اور جن ہستیوں سے ''رِجْس '' کو دور رکھا گیا ہو تو اُن کی طرف دھوکہ خیانت اور نفاق کی نسبت کرنا قرآن وسنت کے انکار کے مترادف ہے،لہٰذا یہ حقیقت از خود عیاں ہوگئی کہ دھوکہ، خیانت اور نفاق کی نسبت کا رُخ کس طرف ہے۔

جانبین کے قلوب میں کدورت تھی

ظاہر اور بدیہی بات تو یہی ہے کہ سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام معاویہ کو خلافت کے لیے نہ صرف یہ کہ نااہل سمجھتے تھے بلکہ مضر بھی سمجھتے تھے مگر اُنہوں نے تحفظِ اہلِ اسلام کی خاطر ناگواری کے باوجود اُس سے صلح کرلی اور ملک اُسے سونپ دیا،لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ کدورت جانبین کے دلوں میں موجود تھی۔ دونوں

طرف کے عوام کے دلوں میں بھی اور اُن کے سربراہوں کے دلوں میں بھی، لیکن دونوں طرف کی کدورتوں کی وجہ یکساں نہیں تھی بلکہ اُن میں زمین و آسمان سے بھی زیادہ فرق تھا۔ وہ کیسے؟ اِس کی توضیح درجِ ذیل عنوان کے تحت ملاحظہ فرمائیے۔

بعض حکماء کی حکمتیں

یہاں سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام اور معاویہ کے ایک دوسرے کو ناپسند کرنے کی وجوہات کے فرق کو بیان کرتے ہوئے ہمیں بعض حکماءِ امت کی حکمت یاد آ گئی ہے، لہٰذا ہم اُس حکمت پر بات کرتے ہوئے یہ فرق سمجھانا چاہتے ہیں۔ بعض حکماءِ امت سورۃ الحجر کی آیت: ﴿وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقَابِلِيْنَ﴾ (اور ہم نے اُن کے سینوں میں جو کچھ کینے تھے سب کھینچ لیے، آپس میں بھائی ہیں تختوں پر روبرو بیٹھے) کے تحت لکھتے ہیں:

> ''یعنی جن جنتی لوگوں کے دلوں میں جو کینہ وغیرہ تھے وہ یہاں دور کر دیے جاویں گے جیسے حضرت علی و امیر معاویہ رضی اللہ عنہما وغیرہ حضرات''۔

(نور العرفان حاشیۃ کنز الایمان ص ۴۲۱)

اِس حکمت پر بات کرنے سے پہلے اِن حکیم الامت کی ایک اور حکمت بھی جان لیجئے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سینے آپس کے کینے بغض و حسد سے بالکل پاک و صاف تھے کیونکہ قرآن کریم اُن کے متعلق اس طرح صفائی بیان فرما رہا ہے:
> وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ أَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ.
> ''اور وہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھی ہیں وہ کافروں پر سخت ہیں اور آپس میں ایک دوسرے پر رحم و کرم والے ہیں''۔

(امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ص ۲۲، ۲۳)

اِن دونوں حکمتوں میں سے کون سی حکمت صحیح ہے اور کون سی غلط؟ بہر حال اِن حکیم الامت کی ایسی حکمتوں کی مثالیں بہت ہیں۔ مثلاً وہ اپنے حاشیہ ''نور العرفان علی کنز الایمان'' اور اپنی کتاب

"شان حبیب الرحمان من آیات القرآن" میں کسی بھی شخص کے خال المومنین ہونے کی نفی کرتے ہیں جبکہ اپنی کتاب "امیر معاویہ ؓ" میں خال المومنین ہونے کا اثبات کرتے ہیں۔ شاید اُن کے نزدیک احوالِ زمانہ کے لحاظ سے حکمتوں کا بدلنا ضروری ہوگا، بہرحال اُن کی یہ حکمتیں ہماری عقل سے ماوراء ہیں۔ ہم پھر اُن کی اُس حکمت بھری تفسیر پر آتے ہیں جس میں اُنہوں نے اپنے بعض محبوبوں کے ساتھ ساتھ سیدنا علی ؓ کے سینے میں بھی کینے کی بات کی ہے۔ ہمارے نزدیک اُن کی اِس تفسیر میں نہ صرف یہ کہ سیدنا علی ؓ کی بے ادبی ہے بلکہ قرآن وسنت سے روگردانی بھی ہے۔ اِس لیے کہ اِس میں کینے کی نسبت کرتے ہوئے سیدنا علی ؓ اور معاویہ میں فرق نہیں کیا گیا۔ پہلے ہم اِس آیت کا مصداق بیان کرتے ہیں پھر اِس لغزش کی وضاحت کریں گے۔

﴿وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ﴾ کا مصداق کون؟

یہ آیت قیامت تک تمام مومنین کے لیے عام ہے، یعنی کسی بھی زمانے کے معاصر مومنین کے مابین دنیا میں کسی قسم کا کوئی کینہ ہوگا اور پھر اُنہیں جنت نصیب ہوئی تو وہاں اُن کے مابین کینہ باقی نہیں رہے گا، بطورِ شانِ نزول اِس کو کسی طبقہ کے ساتھ مقید کرنا درست نہیں، کیونکہ اِس کی شان نزول میں کوئی بھی روایت قیل وقال سے خالی نہیں۔ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اِس آیت کے تحت تقریباً پندرہ روایات درج کی ہیں لیکن اُن میں سے کوئی بھی اسنادی سقم سے مبراء نہیں۔ سند سے قطع نظر کرتے ہوئے فقط معنوی لحاظ سے دیکھا جائے تو ایک دو روایتیں قابل فہم ہیں، مثلاً سیدنا علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ اُنہوں نے فرمایا:

"اللہ کی قسم! یہ آیت ہم اہل بدر کی شان میں نازل ہوئی"۔

دوسری روایت بھی سیدنا علی ؓ سے منقول ہے، جس میں اُنہوں نے اپنی آرزو کا یوں اظہار فرمایا ہے:

إِنِّیْ لَأَرْجُوْ أَنْ أَکُوْنَ أَنَا وَعُثْمَانُ وَالزُّبَیْرُ وَطَلْحَةُ مِمَّنْ قَالَ اللّٰهُ ﴿وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ﴾

"مجھے امید ہے کہ میں، عثمان، زبیر اور طلحہ ؓ اُن لوگوں میں سے ہوں گے جن کے بارے میں ارشادِ الٰہی ہے: ﴿اور ہم نے اُن کے سینوں میں جو کچھ کینے تھے سب

کھینچ لیے﴾“۔

(الدر المنثور ج۸ ص ۶۲۷، ۶۲۹)

جن حضرات کا نام سیدنا علی ﷺ کی طرف منسوب روایت میں آیا ہے چونکہ وہ حضرات دوسری متعدد احادیث کی رو سے جنتی ہیں اِس لیے معنوی لحاظ سے ایسی روایات قابل فہم ہیں، لیکن ہمارے حکیم الامت صاحب نے جو تفسیر فرمائی ہے وہ اُن کی اپنی طبع زاد ہے، وہ تفسیر کسی حدیث، اثر (قولِ صحابی) اور معتبر مفسرین میں سے کسی نے بھی نہیں کی۔ کسی طبقہ یا فرد کو جنت نصیب ہونے پر یا اُسے بہشتی خیال کرنے پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا لیکن دنیا میں کسی کا نام لے کر اُسے جنتی قرار دینے کے لیے قرآن وسنت سے کسی دلیل کا ہونا ضروری ہے۔ ہمارے حکیم الامت صاحب نے سیدنا علی ﷺ کے ساتھ جن صاحب کا نام لیا ہے اُن کے لیے قرآن وسنت میں قطعاً ایسی کوئی دلیل نہیں آئی، حتیٰ کہ باقی دلائل تو کجا اُنہیں سورۃ الحدید کی مشہور آیت ﴿وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى﴾ میں بھی شامل سمجھنا درست نہیں، کیونکہ یہ سورت فتح مکہ سے پہلے نازل ہوئی تھی، اور اس میں جن حضرات کے لیے وعدہ حسنیٰ کا ذکر ہے وہ وہ ہیں جو صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیان مسلمان ہوئے، اور پھر یہ آیت ہے بھی جملہ خبریہ، لہٰذا اس میں وہ لوگ کیونکر شامل سمجھے جاسکتے ہیں جو فتح مکہ سے قبل کافر تھے؟

جنتی ہونا حُسنِ خاتمہ پر موقوف

اَللّٰهُمَّ أَحْسِنْ عَاقِبَتَنَا فِي الْأُمُوْرِ كُلِّهَا، یادرکھنا چاہیے کہ صحیح احادیث سے نام زدشدہ کسی فرد کو جنتی قرار دینا الگ بات ہے اور جماعت یا طبقات کے لیے جنت کی بشارت کا ہونا الگ بات ہے۔ جب کسی فرد کو جنتی قرار دیا گیا تو اُس فرد کو جنتی ماننا لازم ہے، لیکن نام لیے بغیر کسی طبقہ یا جماعت کا ذکر کیا گیا تو پھر اُس طبقہ یا جماعت کے ہر شخص کے خاتمہ کا اعتبار ہوگا۔ قرآن مجید میں متعدد ایسی آیات ہیں جن میں طبقات اور جماعت کے لیے اجرِ عظیم اور جنت کی بشارت کا ذکر ہے اور عموماً خیال کیا جاتا ہے کہ اُس جماعت یا طبقہ کے ہر ہر فرد کا جنتی ہونا ضروری ہے لیکن درحقیقت یہ خیال درست نہیں۔ مثلاً آیت مبارکہ ﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ﴾ (الفتح: ۱۸) کو مدنظر رکھتے ہوئے بیعتِ

رضوان میں شامل اکثر کو نہیں بلکہ تمام لوگوں کو جنتی تصور کیا جاتا ہے حالانکہ یہ درست نہیں بلکہ رضاءِ الٰہی کا یہ مژدہ فقط اُن لوگوں کے لیے تھا جنہوں نے عہد کو نبھایا اور اُس بیعت پر قائم رہے، اِسی لیے اللہ تعالیٰ نے اِن الفاظ کے بعد ارشاد فرمایا:

فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ.

''تو اللہ نے جانا جو اُن کے دلوں میں ہے تو اُن پر اطمینان اتارا''۔

(الفتح:۱۸)

سیدنا ابن عباس ؓ فرماتے ہیں:

إِنَّمَا أُنْزِلَتِ السَّكِيْنَةُ عَلٰى مَنْ عُلِمَ مِنْهُ الْوَفَاءُ.

''اطمینان فقط اُن پر اُتارا گیا جن سے وفا جانی گئی''۔

(الدر المنثور ج۱۳ ص ۴۸۳)

سیدنا ابن عباس ؓ کی یہ تفسیر قرآن بالقرآن ہے، اِس لیے کہ اِس سے قبل جس آیت میں اِس بیعت کو بیعتِ الٰہی فرمایا گیا ہے وہاں ساتھ یہ بھی فرمایا گیا ہے:

فَمَنْ نَّكَثَ فَإِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ وَمَنْ أَوْفٰى بِمَا عَاهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهُ فَسَيُؤْتِيْهِ أَجْرًا عَظِيْمًا.

'' تو جس نے عہد توڑا اُس نے اپنے بڑے عہد کو توڑا، اور جس نے پورا کیا وہ عہد جو اُس نے اللہ سے کیا تھا تو بہت جلد اللہ اُسے بڑا ثواب دے گا''۔

(الفتح: ۱۰)

اسی طرح بعض دوسری آیات سے بھی بلا استثناء تمام صحابہ کو جنتی ثابت کیا جاتا ہے، مثلاً بعض طلقاء سے فیض کے متمنی حضرات لکھتے ہیں:

''سیدُ المُبَلِّغین رحمۃٌ لِّلعالمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے تمام صحابہ کرام علیہم الرضوان اِس امت میں افضل ہیں۔ اللہ عزّوجلّ نے قرآن کریم میں صحابہ کرام علیہم

الرضوان کی فضیلت ومدح بیان فرمائی ہے، اُن کے بہترین عمل، عمدہ اخلاق اور حُسنِ ایمان کا تذکرہ فرمایا اور اُن نفوسِ قدسیہ کو دنیا ہی میں اپنی رضا کا مژدہ سنایا۔ چنانچہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

رَضِيَ اللّٰهُ عَنهُم وَرَضُوا عَنهُ وَاَعَدَّلَهُم جَنّٰتٍ تَجرِي تَحتَهَا الاَنهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا اَبَدًا ذٰلِكَ الفَوزُ العَظِيمُ. (پ۱۱، التوبة ۱۰۰)

ترجمہ کنز الایمان: اللہ اُن سے راضی اور وہ اللہ سے راضی اور ان کے لیے تیار کر رکھے ہیں باغ جن کے نیچے نہریں بہیں ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہیں، یہی بڑی کامیابی ہے"۔

(فیضانِ امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، مکتبۃ المدینۃ کراچی، ص۹)

مستفیضینِ طلقاء نے پوری آیت نقل نہیں کی، دراصل اِس آیت میں تین طبقات کا ذکر ہے:

۱۔ مہاجرین

۲۔ انصار

۳۔ نیکی میں اُن دونوں کی پیروی کرنے والے

چنانچہ مکمل آیت یوں ہے:

وَالسّٰبِقُونَ الاَوَّلُونَ مِنَ المُهٰجِرِينَ وَالاَنصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُم بِاِحسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنهُم وَرَضُوا عَنهُ وَاَعَدَّ لَهُم جَنّٰتٍ تَجرِي تَحتَهَا الاَنهٰرُ خٰلِدِينَ فِيهَا اَبَدًا ذٰلِكَ الفَوزُ العَظِيمُ.

"اور سب سے آگے آگے سب سے پہلے پہلے ایمان لانے والے، مہاجرین اور انصار سے اور جنہوں نے پیروی کی ان کی عمدگی سے، راضی ہو گیا اللہ تعالیٰ اُن سے اور راضی ہو گئے وہ اس سے، اور اس نے تیار کر رکھے ہیں اُن کے لیے باغات بہتی ہیں ان کے نیچے ندیاں ہمیشہ رہیں گے ان میں ابد تک، یہی بہت بڑی کامیابی ہے"۔

(التوبة: ۱۰۰)

اِس آیت میں جس تیسرے طبقہ کا ذکر ہے اُس کے لیے رضائے الٰہی اور جنت کو مہاجرین وانصار کی اتباع بالاحسان سے مشروط کیا گیا ہے، لہٰذا جو لوگ مہاجرین وانصار کے بعد طوعاً یا کرھاً اسلام لائے اور اُن کی اتباع سے محروم رہے وہ تیسرے طبقہ میں شامل نہیں۔ رہے اوّلین دو طبقے یعنی مہاجرین وانصار ؓ تو وہ بھی تمام کے تمام رضائے الٰہی اور جنت کے مستحق نہیں بلکہ فقط وہ مہاجرین وانصار مستحق ہیں جن کا خاتمہ ایمان پر ہوا، کیونکہ ﴿مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ﴾ میں لفظِ "مِنْ" تبعیضیہ ہے، لہٰذا معاذ اللہ اگر کوئی مہاجر یا انصاری خاتمہ بالایمان سے محروم رہا ہو تو وہ اس آیت کا مصداق نہیں ہوگا، اور یقیناً بعض اولین مہاجرین ایمان سے محروم ہو گئے تھے۔ مثلاً حضرت ام حبیبہؓ (رملہ بنت ابی سفیان) کا سابق شوہر عبید اللہ بن جحش اُن اوّلین مہاجرین میں سے تھا جنہوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی مگر وہاں جا کر اُس نے نصرانیت اختیار کر لی تھی اور مرتد ہو گیا تھا۔ اِس کے مرتد ہو جانے کا تذکرہ تقریباً ہر اُس کتاب میں موجود ہے جس میں حضرت ام حبیبہ کے ساتھ نبی کریم ﷺ کے نکاح کا ذکر موجود ہے۔ صحابہ کرام ؓ کی سوانح پر مبنی کتب میں بھی اس شخص کا ذکر موجود ہے، چنانچہ مشہور ومتداول کتب "**الاستیعاب**، **أسد الغابة**" اور "**الإصابة**" میں بھی حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا رملہ بنت ابی سفیان کے ترجمہ میں عبید اللہ بن جحش کے مرتد ہو جانے کا تذکرہ موجود ہے۔

معلوم ہوا کہ اِن دو آیات یا کسی بھی آیت اور صحیح حدیث سے تمام کے تمام صحابہ کو جنتی قرار دینا یا تو عدم تدبر پر مبنی ہے یا پھر بعض بغاۃ وطلقاء کو ناجائز طور پر [Secure] کرنا اور تحفظ دینا مقصود ہے۔ صحابی ہو یا غیر صحابی ہر ایک کا معاملہ "**الأَعْمَالُ بِالْخَوَاتِيمِ**" یعنی انجام کے مطابق ہی ہوگا، ورنہ وہ بھی صحابہ ہی ہوں گے جنہیں حوضِ کوثر سے دھتکار دیا جائے گا اور وہ بھی صحابہ ہی تھے جن کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا:

فِي أَصْحَابِي اِثْنَا عَشَرَ مُنَافِقًا ، فِيهِمْ ثَمَانِيَةٌ لَايَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ.

"میرے صحابہ میں بارہ منافق ہیں، اُن میں سے آٹھ جنت میں داخل نہیں ہوں گے

یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے سوراخ میں داخل ہو"۔

(مسلم: كتاب صفات المنافقين وأحكامهم ، باب ۱ ،ص ۱۲۸۲ حديث ۲۷۷۹)

یہی وجہ ہے کہ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو بعض لوگوں کی نماز جنازہ پڑھانے سے منع کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ منافق ہے، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ رُک جاتے اور دوسرے حضرات کو فرماتے کہ اس کی نماز جنازہ پڑھا دو۔ ظاہر ہے کہ جب منافقین کی نماز جنازہ پڑھائی جاتی ہوگی تو لامحالہ اُنہیں جنت البقیع یا مسلمانوں کے کسی بھی قبرستان میں دفن بھی تو کیا جاتا ہوگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ تمام کے تمام صحابہ کو یا صحابی کہے جانے والے ہر ہر شخص کو جنتی تصور کر لینا عدم تدبر پر مبنی ہے۔ حُسنِ ظن تو اچھی بات ہے مگر ہر صحابی کو جنتی قرار دینے والے لوگوں سے پوچھئے کہ اُن کے نزدیک وہ صحابہ بھی جنتی ہیں جن کو خلیفۂ ثالث حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے قاتلین میں ذکر کیا جاتا ہے؟ نیز بسر بن ابی ارطاۃ بھی صحابی تھا اور قاتلینِ عمار بن یاسر بھی صحابی تھے، اُن کے بارے میں کیا حکم ہے؟ سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کو قتل کرنے کے لیے جو ناپاک ہاتھ استعمال ہوئے تھے وہ ایک صحابی ہی کے ہاتھ تھے اور اُس شخص کا قاتلِ عمار ہونا مشکوک نہیں معلوم ہے، اُس کو ابوالغادیہ کہا جاتا تھا۔ چنانچہ امام ابن عبدالبر اور دوسرے علماء نے لکھا ہے:

"یہ صحابی تھا اور اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ حدیث بھی سنی تھی:

لَا تَرْجِعُوا بَعْدِیْ كُفَّارًا يَضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ.

"میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں اڑانے لگو"۔

یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا محبّ تھا اور سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کا قاتل تھا، اور جب یہ معاویہ وغیرہ سے اندر آنے کی اجازت مانگتا تو کہتا: "قَاتِلُ عَمَّارٍ بِالْبَابِ" (عمار کا قاتل دروازے پر حاضر ہے) جب اس سے سیدنا عمار بن یاسر کے قتل کی کیفیت پوچھی جاتی تو وہ بلا شرم وحیا وہ کیفیت بیان کر دیتا تھا۔ اہل علم نے اس پر بڑا تعجب کیا ہے کہ ایک طرف اُس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مذکورہ بالا حدیث مروی ہے اور دوسری

طرف وہ عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کا قاتل بھی ہے"۔

(الاستيعاب في معرفة الأصحاب: كتاب الكنى، باب الغين، ج٢ ص٤٤٦؛ أسد الغابة ج٦ ص ٢٣١؛ الإصابة ج٧ ص٢٥٩)

سو ابو الغادیہ الجہنی صحابی تو تھا مگر ناقثین (عہد شکن لوگوں) میں شامل ہو کر سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کا قاتل بن گیا، حالانکہ خود اُس کے ہی بعض سربراہوں سے یہ حدیث منقول ہے:

قَاتِلُ عَمَّارٍ وَسَالِبُهُ فِي النَّارِ.

"عمار کا قاتل اور اُس کا سامان لوٹنے والا جہنمی ہے"۔

(المستدرك: كتاب معرفة الصحابة، ذكر شهادة عمار بن ياسر رضي الله عنه ج٣ ص٣٨٧؛ سلسلة الأحاديث الصحيحة للألباني ج٥ ص١٨ حديث ٢٠٠٨؛ عمار بن ياسر رضي الله عنه رجل المحنة و ميزان الفتنة، لأسامة بن أحمد ص١٨٥، ١٨٦)

براہ راست سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے قاتل کے بارے میں تو یہ واضح حدیث آ گئی، کیا اس کے سربراہ اور اُس کے عمل پر راضی رہنے والے کے بارے میں بھی کوئی حدیث ہے؟ اِس سلسلے میں درج ذیل حدیث سے روشنی حاصل کی جا سکتی ہے۔ امام ابوداود رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إِذَا عُمِلَتِ الْخَطِيئَةُ فِي الْأَرْضِ كَانَ مَنْ شَهِدَهَا فَكَرِهَهَا، كَانَ كَمَنْ غَابَ عَنْهَا، وَمَنْ غَابَ عَنْهَا فَرَضِيَهَا كَانَ كَمَنْ شَهِدَهَا.

"جب زمین میں کوئی گناہ کیا جائے، جو شخص وہاں موجود ہو اور وہ اُس گناہ کو پسند نہ کرے تو وہ اُس شخص کی طرح ہے جو وہاں موجود نہ ہو، اور جو وہاں سے غائب ہو اور اُس گناہ پر راضی ہو تو وہ اُس شخص کی طرح ہے جو وہاں موجود ہو"۔

(سنن أبي داود: كتاب الملاحم، باب الأمر والنهي، ج٤ ص٣٣٣ حديث ٤٣٤٥؛ ذم الكلام للهروي ج٢ ص١٥٧ حديث ٣٠٦؛ مجمع الزوائد ج٧ ص٢٩٠)

زیادہ تفصیل میں جانے کی کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ حدیث پاک میں واضح طور پر اصول بیان فرما

دیا گیا ہے:

فَـالإِمَـامُ الَّـذِيْ عَـلَـى النَّـاسِ رَاعٍ وَهُوَ مَسْؤُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ ، أَلَا فَكُلُّكُمْ رَاعٍ ، وَكُلُّكُمْ مَسْؤُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ.

''پس وہ شخص جو لوگوں پر حاکم ہے وہ راعی ہے اور وہ اپنی رعایا کے متعلق جواب دہ ہوگا، سنو! تم میں سے ہر شخص راعی ہے اور اُس سے اُس کی رعایا کے بارے میں باز پرس ہوگی''۔

(بخاری: کتاب الأحکام، باب ١، ص ٩٨٢ حدیث ٧١٣٨)

اِسی لیے حدیث شریف میں سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے قتل میں فقط معاویہ کے سپاہی ابوالغادیہ کو ہی جہنمی نہیں کہا گیا بلکہ جس گروہ میں ابوالغادیہ تھا اُس پورے گروہ کو ''داعی إلی النار'' فرمایا گیا ہے۔ بتایئے! نواب محمد اکبر بگٹی مرحوم کا قتل تو سپاہیوں کے ہاتھوں سے ہوا مگر اُس کی FIR اُس دور کے حاکم کے خلاف کیوں درج کرائی گئی؟ اس لیے کہ ریاستی قتل میں عقلاً اور نقلاً اصل قاتل سربراہِ مملکت ہی ہوتا ہے، بنی اسرائیل کے بچوں کو فرعون کے سپاہی قتل کرتے تھے مگر اللہ جل جلالہ نے اصل قاتل فرعون کو قرار دیا ہے۔

رِجس سے پاک سینے میں بھی کینہ؟

بعض حکماءِ امت نے پہلے تو بعض طلقاء اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو ﴿عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقَابِلِیْنَ﴾ (تختوں پر روبرو بیٹھے) سے استدلال کرتے ہوئے جنت میں آمنے سامنے بٹھا دیا، پھر اُن دونوں کے سینوں میں کینے کے موجود ہونے کی بات کی۔ اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے مبارک سینے میں معاویہ کے لیے غِلّ کینہ تھا، معاذ اللہ۔ یاد رکھئے! سیدنا علی علیہ السلام کے سینے میں کسی انسان کے لیے ''غِلّ'' کی بات کرنا بے ادبی ہی نہیں بلکہ قرآن وسنت کے بھی خلاف ہے۔ علماء لغت وتفسیر نے لفظ ''غِلّ'' کے معانی دھوکہ، خیانت، سرقہ اور کینہ سے کیے ہیں، اور اِن میں سے کوئی بھی معنیٰ سیدنا علی علیہ السلام کی ذات پاک کے لیے کرنا حکمت نہیں بلکہ حماقت ہے، کیونکہ دھوکہ، خیانت، سرقہ اور کینہ وغیرہ سب سینے کی بیماریاں ہیں اور قرآن مجید ایسی تمام بیماریوں کے لیے شفاء ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَ تْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ.

''اے لوگو! آ گئی ہے تمہارے پاس نصیحت تمہارے پروردگار کی طرف سے اور شفاء اُن روگوں کے لیے جو سینوں میں ہیں''۔

(یونس:۵۷)

جب قرآن سینے کے تمام روگوں کے لیے شفاء ہے تو پھر اُس ہستی کے سینے میں کسی کے لیے کینہ کیونکر ہوسکتا ہے جن کے لیے ارشاد ہوا کہ ''علی قرآن کے ساتھ اور قرآن علی کے ساتھ''۔ علاوہ ازیں سیدنا علی علیہ السلام کا شمار اہل کساء علیہم السلام میں ہوتا ہے اور اہل کساء سے رِجْس کو دور کردیا گیا ہے۔ رِجْس ہر اُس بُری چیز کو کہتے ہیں جو عقلاً، شرعاً اور طبعاً تمام حیثیتوں سے بُری ہو، لہٰذا جو ہستی ایسی تمام حالتوں سے منزہ اور مبراء ہو اُن کے سینے میں کسی کے لیے کینہ کا قول کرنا کیونکر درست ہوسکتا ہے؟ معنوی لحاظ سے کینہ رِجْس (پلیدی) ہے، اور کسی سینے میں پلیدی اور طہارت دونوں کا اجتماع کیونکر ممکن ہے؟ بلکہ اہل بصیرت حضرات نے قرآن مجید سے استنباط کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اہل بیت کرام علیہم السلام فقط طاہر ہی نہیں بلکہ عین طہارت ہیں۔

کیا رِجس اور طہارت کا اجتماع ممکن ہے؟

شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ مشہور حدیث ''سَلْمَانُ مِنَّا أَهْلَ الْبَيْتِ'' کی تشریح میں لکھتے ہیں:

وَلَمَّا كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَبْدًا مَحْضًا قَدْ طَهَّرَهُ اللّٰهُ وَأَهْلَ بَيْتِهِ تَطْهِيْرًا وَأَذْهَبَ عَنْهُمُ الرِّجْسَ، وَهُوَ كُلُّ مَا يَشِيْنُهُمْ، فَإِنَّ الرِّجْسَ هُوَ الْقَذَرُ عِنْدَ الْعَرَبِ، هٰكَذَا حَكَى الْفَرَّاءُ. قَالَ تَعَالىٰ: ﴿إِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا﴾ فَلَا يُضَافُ إِلَيْهِمْ إِلَّا مُطَهَّرٌ، وَلَا بُدَّ فَإِنَّ الْمُضَافَ إِلَيْهِمْ هُوَ الَّذِيْ يُشْبِهُهُمْ، فَمَا يُضِيْفُوْنَ لِأَنْفُسِهِمْ إِلَّا مَنْ لَهُ حُكْمُ الطَّهَارَةِ وَالتَّقْدِيْسِ، فَهٰذِهِ شَهَادَةٌ مِنَ

النَّبِيِّ ﷺ لِسَلْمَانَ الْفَارِسِيِّ بِالطَّهَارَةِ وَالْحِفْظِ الإلٰهِيِّ وَالْعِصْمَةِ حَيْثُ قَالَ فِيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:سَلْمَانُ مِنَّا أَهْلَ الْبَيْتِ وَ شَهِدَ اللّٰهُ لَهُمْ بِالتَّطْهِيْرِ وَذِهَابِ الرِّجْسِ عَنْهُمْ.وَ إِذَا كَانَ لَا يُضَافُ إِلَيْهِمْ إِلَّا مُطَهَّرٌ مُقَدَّسٌ وَحَصَلَتْ لَهُ الْعِنَايَةُ الإلٰهِيَّةُ بِمُجَرَّدِ الإِضَافَةِ ، فَمَا ظَنُّكَ بِأَهْلِ الْبَيْتِ فِيْ نُفُوْسِهِمْ فَهُمُ الْمُطَهَّرُوْنَ بَلْ هُمْ عَيْنُ الطَّهَارَةِ.

’’کیونکہ رسول اللہ ﷺ خالص عبد ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کو اور آپ کے اہل بیت کو کامل طہارت سے نوازا اور اُن سے رجس کو دور کر دیا، اور ہر معیوب چیز رجس ہے، کیونکہ عرب کے نزدیک رجس ہر نامناسب چیز کو کہتے ہیں، جیسا کہ امام فراء نے بیان کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: (اللہ تعالیٰ تو یہی چاہتا ہے کہ تم سے دور کر دے پلیدی کو اے اہل بیت اور تمہیں پوری طرح پاک صاف کر دے) پس اہل بیت کرام علیہم السلام کی طرف فقط پاک کی ہی نسبت کی جاسکتی ہے، اور لازمی ہے کہ اُن کی طرف اُسے منسوب کیا جائے جو اُن کے مشابہ ہو، پس اہل بیت اپنی طرف نہیں منسوب کریں گے مگر اسی کو جس کے لیے طہارت و تقدیس کا حکم حاصل ہو، پس رسول اللہ ﷺ نے سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے حق میں طہارت، حفظِ الٰہی اور عصمت کی شہادت دی، جب آپ نے فرمایا: سلمان ہم اہل بیت سے ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے اہل بیت کرام علیہم السلام کے لیے تطہیر اور ہر عیب سے منزہ ہونے کی گواہی دی ہے، اور جب اُن کی طرف فقط وہ مطہر و مقدس شخص ہی منسوب ہو سکتا ہے جس کو یہ عنایت الٰہی محض اِسی نسبت کی وجہ سے حاصل ہوئی تو پھر اہل بیت کرام علیہم السلام کے نفوس کے بارے میں تمہارا کیا گمان ہے جو طاہرین ہی نہیں بلکہ عین طہارت ہیں‘‘۔

(الفتوحات المكية ج١ ص٢٩٨؛فضل أهل البيت للمقريزي ص٤٤؛ فيض القدير للمناوي ج٤ ص١٠٦؛فتاوى رضويه ج١٥ ص٧٣٦)

حکیم الامت جیسے حضرات کو غور کرنا چاہیے کہ اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اہل بیت کرام علیہم السلام کو عین طہارت تسلیم کیا ہے، لہٰذا اگر کسی عقل مند مسلمان کے نزدیک رِجس اور عین طہارت کا اجتماع ممکن ہو تو پھر مولا علی ؓ کے مقدس و مطہر سینہ کو "اَلْحُبُّ فِی اللّٰہ" اور "اَلْبُغْضُ فِی اللّٰہِ" سے معمور ہونے کے ساتھ ساتھ ذاتی کینے سے بھرپور بھی ماننا ہوگا، اور پھر سمجھنا پڑے گا کہ جب سیدنا علی علیہ السلام کے ساتھ حق ہوتا تھا تو ساتھ ساتھ کینہ بھی ہوتا تھا، جب کسی میدان میں اُن کے ساتھ قرآن ہوتا تھا تو ساتھ کینہ بھی ہوتا تھا، اور آقائے کائنات ﷺ نے اُن کے حق میں جو دعا فرمائی تھی:

اَللّٰهُمَّ أَدِرِ الْحَقَّ مَعَهُ حَيْثُ دَارَ.

"اے اللہ! جس جگہ علی جائے اُس کے ساتھ حق کو جاری رکھ"۔

(الجامع الكبير وهو سنن الترمذي: كتاب المناقب، باب مناقب علي بن أبي طالب، ج٦ ص ٧٩، ٨٠ حديث ٣٧١٤؛ المستدرك، كتاب معرفة الصحابة، ذكر مناقب علي بن أبي طالب ؓ ج٥ ص ٣٢٧ حديث ٤٦٨٨، دار التأصيل.)

اِس دعائے نبوی ﷺ کی تاثیر میں یہ بات بھی تسلیم کرنا ہوگی کہ جب اُن کی کسی کے خلاف جنگ ہوئی تھی تو جہاں اُنہیں حق کی معیت حاصل تھی وہاں کینہ بھی اُن کے ساتھ تھا۔

حکیم الامت ہو تو ایسا ہو جو نور و ظلمت، رِجس و طہارت اور حق و کینہ کو جمع کر سکے۔ ہمارے حکیم الامت نے کمال کر دیا کہ اُنہوں نے رِجس و طہارت اور حق و کینہ کو جمع کر دیا جبکہ شاہ اسماعیل شہید بیچارے سے کچھ نہ ہو سکا، وہ مذکورہ بالا احادیث کی طرح کچھ مزید احادیث جمع کر کے سیدنا علی ؓ کے حق میں عصمت تک کا قول کر گئے۔ تفصیل کے لیے ہماری کتاب "اہل کساء علیہم السلام کا مقام، حقائق و اوہام" کا دوسرا ایڈیشن ملاحظہ فرمائیں۔ نیز کتاب ہٰذا میں بھی صفحہ [۱۸۲] پر اُن کا کلام آ رہا ہے۔

مرتضیٰ علیہ السلام کے سینے میں بھی کینہ؟

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر سیدنا علی علیہ السلام کے مبارک سینے میں معاویہ کے لیے کینہ نہیں تھا تو پھر اُنہوں نے اُس کے ساتھ جنگ کیوں کی؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ اُنہوں نے اَلْحُبُّ لِلّٰہِ وَالْبُغْضُ لِلّٰہِ (اللہ کی

خاطر محبت اور اللہ کی خاطر بغض) کو مدنظر رکھتے ہوئے امام البغاۃ سے جنگ کی تھی اور حکمِ الٰہی پر عمل کیا تھا، اور اِس جنگ کی نبی کریم ﷺ پہلے ہی پیش گوئی فرما چکے تھے کہ ہم نے تنزیلِ قرآن کی تکمیل کے لیے جنگیں کیں اور علی تاویل قرآن پر جنگیں کریں گے۔

کینہ تو اپنی ذات کی خاطر ہوتا ہے اور سیدنا علی علیہ السلام اِس قدر علوالہمۃ (بلند فکر کے حامل) تھے کہ اپنی خاطر کسی پر غضب ناک ہونا اُن کے شایانِ شان ہی نہیں تھا۔ خود نبی کریم ﷺ نے اُن کی اعلیٰ ظرفی اور بلندی ہمتی کا اعلان فرمایا ہے۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل مسند ابی سعید خدری رضی اللہ عنہ میں اپنی سند کے ساتھ ایک حدیث لائے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

أَيُّهَا النَّاسُ لَا تَشْكُوا عَلِيًّا فَوَ اللّٰهِ إِنَّه لَأَخْشَنُ فِيْ ذَاتِ اللّٰهِ أَوْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ.

"لوگو! علی کی شکایت نہ کیا کرو، خدا کی قسم! وہ ذات الٰہی یا راہِ الٰہی میں سب سے زیادہ سخت ہیں"۔

(مسند أحمد ج١٨ ص٣٣٧ حديث١١٨١٧؛ فضائل الصحابة للإمام أحمد ج٢ ص٨٤٥ حديث١١٦١؛ غاية المقصد في زوائد المسند ج٣ ص٣٧٠ حديث٣٦٥٧؛ المستدرك: كتاب معرفة الصحابة ج٣ ص١٤٥ حديث٤٦٥٤؛ حلية الأولياء ج١ ص ٦٨؛ جامع المسانيد لابن الجوزي ج٣ ص٩٢ حديث١٩٧٩؛ تقريب البغية للهيثمي ج٣ ص١٠١ حديث ٣٣٠٢؛ البداية والنهاية ج٧ ص٥٧٢؛ جامع المسانيد لابن كثير ج١٢ ص٤٨٨ حديث٨٧٠؛ المسند الجامع ج٦ ص٤٧٩ حديث٤٦٥٦؛ در السحابة للشوكاني ص٢٢٣)

امام حاکم نے اس حدیث کو شیخین کی شرط کے مطابق صحیح کہا ہے اور امام ذہبی نے اُن کی موافقت فرمائی ہے، اور حافظ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے اور اس کے تمام راوی ثقہ ہیں۔

(مجمع الزوائد ج٩ ص١٢٩، وط: ج١٨ ص٢٩٦ حديث١٤٧٣٦)

علامہ سندھی لکھتے ہیں:

أَيْ أَنَّ فِيهِ خَشُونَةً فِي اللّٰهِ ، لَايُرَاعِيْ فِيهِ أَحداً ، وَهٰذَا لَايُوْجِبُ الشِّكَايَةَ مِنْهُ.

''یعنی سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے دل میں اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں سختی ہے، جس میں وہ کسی کی رعایت نہیں کرتے، اور یہ چیز اُن پر اعتراض کا موجب نہیں ہوسکتی''۔

(حاشية مسند أحمد للسندهي ج٧ ص ٥٥ ؛ تعليقات علىٰ مسند أحمد: للشعيب الأرنؤوط ج ١٨ ص ٣٣٧)

زبانِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ضمانت سے معلوم ہوا کہ حیاتِ نبوی یا بعد از وصالِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا ہر ہر اقدام ذاتِ الٰہی کی خاطر تھا، لہٰذا یہ سمجھنا کہ کسی کے بارے میں سینۂ مرتضوی میں کینہ تھا کتاب وسنت دونوں کے خلاف ہے۔

علی کے خلاف سینے بھرپور از کینے

کتاب وسنت سے ثابت ہے کہ سینۂ مرتضوی میں تو کسی کے لیے کوئی کینہ نہیں تھا لیکن اُن کے خلاف کچھ لوگوں کے سینوں میں کینہ ضرور تھا۔ چنانچہ سیدنا علی علیہ السلام سے منقول ایک حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دوسرے حصہ میں ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُنہیں اپنے مبارک سینے سے لگا کر رو پڑے تو انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ کو کیا چیز رُلاتی ہے؟ فرمایا:

ضَغَائِنُ فِيْ صُدُوْرِ أَقْوَامٍ لَا يُبْدُوْنَهَا لَکَ إِلَّا مِنْ بَعْدِيْ ، قَالَ: قُلْتُ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ فِيْ سَلَامَةٍ مِّنْ دِيْنِيْ؟ قَالَ: فِيْ سَلَامَةٍ مِّنْ دِيْنِکَ.

''تمہارے بارے میں قوموں کے سینوں میں کینے ہیں جن کو وہ میرے بعد ہی ظاہر کریں گے۔ فرماتے ہیں: میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میرے دین کی سلامتی میں؟ فرمایا: تمہارے دین کی سلامتی میں''۔

(مسند أبي يعلىٰ (في مسند علي) ج١ ص ٤٢٦، ٤٢٧، حديث ٥٦٥ ؛ مسند البزار ج٢ ص ٢٩٣

حديث٧١٦؛المناقب للمكي ص٦٥؛إتحاف الخيرة المهرة ج٧ص١٩١ حديث٦٦٥٢، وط: ج٩ص٢٥٣ حديث٧٩٣٤؛ كشف الأستار ج٣ص١٨٣ حديث٢٥٢٣؛المقصد العلي للهيثمي ج٢ص١٨٠ حديث ١٢١٢؛مختصر زوائد البزار للعسقلاني ج٢ ص٣١٣ حديث ١٩٢٢؛المطالب العالية ج١٦ص١٠١ حديث٣٩٣٣؛ تاريخ دمشق ج٤٢ص٣٢٢،٣٢٣؛ إزالة الخفاء ج٤ص٥٠٥)

حافظ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اس حدیث کو امام ابویعلیٰ اور امام بزار نے روایت کیا ہے اور اس کی سند میں فضل بن عمیرہ ہے، امام ابن حبان نے اس کی توثیق فرمائی ہے اور دوسروں نے تضعیف، اور باقی تمام راوی ثقہ ہیں۔

(مجمع الزوائد،باب مناقب علي بن أبي طالب ﷺ، باب بشارته بالجنة ج٩ص١١٨، ١١٩)

اس حدیث کے پہلے حصہ کو امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی روایت کیا ہے اور اُن کی سند میں یہ راوی فضل بن عمیرہ بھی موجود ہے، لیکن اس کے باوجود اُنہوں نے لکھا ہے:

هٰذَا حَدِيثٌ صَحِيحُ الإِسْنَادِ وَلَمْ يُخَرِّجَاهُ.

''یہ حدیث صحیح السند ہے اور بخاری و مسلم نے اس کو روایت نہیں کیا''۔

جبکہ امام ذہبی نے لکھا ہے:

''صحیح ہے''۔

(المستدرك على الصحيحين، كتاب معرفة الصحابة،ومن مناقب أمير المؤمنين علي بن أبي طالب ﷺ، ج٣ص١٤٩،١٥٠ حديث٤٦٧٢)

اِس حدیث کی سند و متن کی صحت کے عملی شواہد اتنے زیادہ ہیں کہ قلبِ سلیم کو انکار کی مجال ہی نہیں رہتی اور ماننا پڑتا ہے کہ زبانِ نبوی ﷺ سے جو الفاظ صادر ہوئے تھے وہ پورے ہو کر رہے۔ چنانچہ وہ علی جو تمام کے تمام غزوات میں مین آف دی جہاد تھا، جو اول المسلمین تھا، جو محبوبِ خدا و مصطفیٰ ﷺ تھا، نہ صرف

یہ کہ اُس کی خلافت سے انکار کیا گیا بلکہ مساجد کے منبروں پر اُسے سب وشتم کیا گیا۔ بغض وکینہ کی حد دیکھئے کہ جو ہستی اِس قدر اسلامی تمغوں سے مالا مال تھی اُن کی عظمتوں کے اعتراف کی بجائے اُن پر لعنت کی جانے لگی۔ خود سوچئے کہ سیدنا علی ﷛ کے ساتھ بغض وکینہ کی اِس سے بڑھ کر عملی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے؟

صحابی کا سینہ اور کینہ؟

حدیث میں "ضَغَائِنُ فِيْ صُدُوْرِ أَقْوَامٍ" یعنی سیدنا علی ﷛ کے لیے قوموں کے سینوں میں کینوں کا ذکر آیا ہے، نا معلوم اِس سے یہود و نصاریٰ اور مسلم و غیر مسلم کون کون سی اقوام مراد ہیں، تحقیق سے ہی پتہ چلے گا، تاہم تردید روافض میں شہرہ آفاق مصنف شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اہل تحقیق محدثین کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

> "محققین اہل حدیث نے بعد تتبع روایات دریافت کیا ہے کہ یہ حرکات شائبۂ نفسانی سے خالی نہ تھے، اس تہمت سے خالی نہیں کہ جناب ذوالنورین حضرت عثمان ﷛ کے معاملہ میں جو تعصب اُمویہ اور قرشیہ میں تھا اسی کی وجہ سے یہ حرکات حضرت امیر معاویہ سے وقوع میں آئے، جس کا غایت نتیجہ یہی ہے کہ وہ مرتکب کبیرہ اور باغی قرار دیے جائیں۔ وَالْفَاسِقُ لَیْسَ بِأَهْلِ اللَّعْنِ. ترجمہ: فاسق قابل لعن نہیں"۔

(فتاوی عزیزی کامل ص ۴۱۳)

اسی حقیقت کو بعض فضلاء دیوبند نے بھی بیان کیا ہے اور اُن کے کلام سے اُس باطل خیال کی بھی تردید ہوتی ہے جس کا اظہار ہمارے بعض حکماء امت نے سورۃ الحجر کی آیت کی تفسیر میں کیا ہے۔ چنانچہ فاضل دیوبند علامہ سعید احمد اکبر آبادی نے معاویہ کی مولا علی کے ساتھ جنگ کو ہاشمی اور اُموی رقابت کی وجہ بتایا ہے، اُنہوں نے اِس بات کو ایک عمدہ تمہید کے ساتھ شروع کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ چونکہ معاویہ دیر سے اسلام لائے تھے اِس لیے اُنہیں اکتسابِ فیضِ نبوی کا موقعہ نہیں ملا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

> "مراتبِ ایمانی کا تفاوت: عصبیتِ جاہلیت کی ہلاکت آفرینی اور اسلام میں اس کی شدید مذمت معلوم کرنے کے بعد اَب ذرا اِس پر غور کیجئے کہ قطع نظر اس بحث

سے جو ائمہ محدثین نے ''الْاِیْمَانُ یَزِیْدُ وَیَنْقُصُ'' کے باب میں کی ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ ایمان جس اذعانی کیفیت کا نام ہے، اُس میں اشتداد و ضعف دونوں کی استعداد ہوتی ہے۔ اسی بنا پر ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح آج کل مسلمان مسلمان سب یکساں نہیں ہوتے بلکہ مراتب ایمانی میں متفاوت ہوتے ہیں۔ اسی طرح صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی اس مرتبہ میں یکساں اور برابر کے درجہ کے نہیں تھے۔ خود اپنی ذاتی استعداد اور فطری صلاحیت، افتادِ طبع اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آنحضرت ﷺ کے شرف صحبت کی زیادتی اور کمی کے باعث ان برگزیدہ ہستیوں میں بھی باہمی فرق و امتیاز تھا۔

تمثیلاً حضرت معاویہ کو ہی لیجئے، اُن کی شان میں کسی غیر صحابی کو گفتگو کرنے کی کیا مجال ہے، تاہم یہ حقیقت ہے کہ آپ چونکہ فتح مکہ کے بعد اپنے والد ماجد ابوسفیان کے ساتھ مسلمان ہوئے تھے، اس لیے آپ کو خلفاء اربعہ کی طرح آنحضرت ﷺ کی خدمتِ اقدس میں رہنے اور براہِ راست آفتابِ نبوت و رسالت سے کسبِ فیض کرنے کا زیادہ موقع نہیں ملا، اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش کے ایک معزز اور نامور خاندان سے تعلق رکھنے کے باعث آپ میں جو عمدہ صفات تھیں، مثلاً سیاسی تدبر، استقامت و استقلال اور شہامت و شجاعت اسلام قبول کرنے کے بعد اُن پر اور جلا ہو گئی اور اُن قوتوں کا مَصرف بدل گیا۔

تاہم بنو امیہ اور بنو ہاشم میں جو باہمی رقابت مدت سے چلی آ رہی تھی، امیر معاویہؓ کو اُس سے خالی الذہن نہیں کہا جا سکتا۔ حضرت علیؓ کے مقابلہ میں اُنہوں نے جو کچھ کیا، اُس میں دوسرے عوامل و اسباب کی طرح اس رجحان کو بھی بڑا دخل ہے۔ ممکن ہے حضرت علی پر بھی یہ شبہ کیا جائے لیکن یہ پھر بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ حضرت علیؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں کوئی عمل ایسا نہیں کیا جس کو خاندانی رقابت کے زیر اثر اور اسلام

کی تعلیمات یا اُس کی روح کے خلاف کہا جائے''۔

(مسلمانوں کا عروج وزوال: ص ٤٥)

ہر چند کہ علامہ موصوف کے مکمل اقتباس سے ہمیں اتفاق نہیں ہے، کیونکہ اِس اقتباس کے بعض جملے بعض احادیث نبویہ کے خلاف ہیں، تاہم مجموعی لحاظ سے اُن کا تجزیہ درست ہے۔ اُن کے تجزیہ سے دوسرے فوائد کے ساتھ ساتھ بعض حکماء امت کی حکمت کی قلعی بھی کھل گئی۔ وہ اس طرح کہ جب کوئی صحابی باہمی رقابت وکینہ وغیرہ سے اس قدر پاک ہوتا تھا جس قدر اُسے صحبتِ نبوی میسر آتی تھی تو پھر سوچئے کہ بعض حکماء امت کا بعض طلقاء کے ساتھ ساتھ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی طرف بھی کینہ کی نسبت کرنا کتنا بڑا ظلم ہے؟ ذرا غور تو فرمایئے کہ حکیم الامت نعیمی نے ایسی ہستی کی طرف کینے کی نسبت کردی ہے جو صرف اعلانِ نبوت کے بعد والے مکمل تئیس (۲۳) برس ہی فیضانِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مستفیض ومستفید نہیں ہوتی رہی بلکہ اُنہیں گھٹی کے وقت سے ہی آغوش نبوی میں آنے کی سعادت حاصل ہوگئی تھی، اور اُن کا ایمان واسلام سب کچھ طوعاً تھا کرھاً نہیں تھا۔ وہ بھوکے رہ کر بھی فیضانِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جستجو میں رہتے تھے جبکہ بعض لوگوں کو بارگاہ نبوی میں طلب کیا گیا تو اُنہیں کھانا چھوڑ کر آنا گوارا نہ ہوا۔ سو یہ عاجز انتہائی کرب واضطراب کے ساتھ یہ لکھنے پر مجبور ہے کہ ایک ہی جملہ میں بعض طلقاء اور مرتضٰی شیر خدا کی طرف برابر کینے کی نسبت کرنا جہاں قرآن وسنت میں عدم تدبر کا بدترین مظاہرہ ہے وہیں بارگاہِ مرتضوی کی تنقیص وبے ادبی کی بھی بدترین مثال ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح سیدنا علی علیہ السلام اور معاویہ کی جنگ میں ایک طرف **اَلنَّصِیْحَةُ لِلّٰهِ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ** (اللہ جل جلالہ، اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مومنین کے لیے خیر خواہی) کا جذبہ کارفرما تھا اور دوسری طرف دنیاداری اور قومی تعصب تھا، اسی طرح سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام اور معاویہ کی مصالحت میں بھی ایک طرف دینی جذبہ تھا تو دوسری طرف ذاتی مفاد تھا، اسی لیے اُس صلح کو **هُدْنَةٌ عَلٰى دَخَنٍ** کہا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے قلبِ اقدس میں بعض بغاۃ کے لیے **اَلْبُغْضُ فِی اللّٰهِ** کا جذبہ تھا جبکہ بعض بغاۃ کے سینہ میں اُن کے خلاف خدع، مکر اور کینہ تھا، جیسا کہ شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے اور جیسا کہ سیدنا مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ کی حدیث کے متن سے ہی ظاہر ہے۔

شاہ عبدالعزیز اور حکیم الامت کے اقوال کا جائزہ

ابھی ابھی آپ پڑھ چکے ہیں کہ قاطع رافضیت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور فاضل دیوبند علامہ سعید احمد اکبرآبادی نے ایک صحابی، فقیہ، مجتہد، کاتبِ وحی اور خال المومنین کی طرف شائبہ نفسانی، اُموی تعصب اور خاندانی رقابت کی نسبت کرنے میں کوئی تأمل نہیں کیا، حالانکہ یہ انتہائی خطرناک قول ہے، کیونکہ خاندانی رقابت یا تعصب ایک ہی چیز ہے اور اِسی سے ضِغن یعنی بغض اور کینہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ قول انتہائی خطرناک اس لیے ہے کہ عداوت وبغض بندے کو کفر تک پہنچا دیتے ہیں۔ چنانچہ اعلیٰ حضرتؒ لکھتے ہیں:

''حضرت علی المرتضیٰ سے جنگ کرنے والا اگر اُن سے عداوت وبغض کی وجہ سے کرتا ہے تو اہل سنت کے نزدیک بالاجماع وہ کافر ہے''۔

(فتاوی رضویہ ج۱۵ ص۲۳۵)

اور حکیم الامت نعیمی نے بھی کچھ ایسا ہی لکھا ہے، پہلے اُنہوں نے اِس حدیث کا یوں ترجمہ کیا ہے:

دَبَّ إِلَيْكُمْ دَاءُ الْأُمَمِ قَبْلَكُمْ: الْحَسَدُ وَالْبُغْضَاءُ، هِيَ الْحَالِقَةُ ، لَا أَقُولُ تَحْلِقُ الشَّعْرَ وَلَكِنْ تَحْلِقُ الدِّيْنَ.

''تم میں پچھلی امتوں کی بیماری سرایت کرگئی: حسد اور بغض، یہ مونڈ دینے والی ہے، میں نہیں کہتا کہ بال مونڈ دیتی ہے لیکن یہ تو دین کو مونڈ دیتی ہے''۔

پھر لکھا ہے:

''اس طرح کہ دین وایمان کو جڑ سے ختم کردیتی ہے، کبھی انسان بغض وحسد میں اسلام ہی چھوڑ دیتا ہے، شیطان بھی اِنہیں دو بیماریوں کا مارا ہوا ہے''۔

(مرآۃ شرح مشکاۃ ج۶ ص۶۱۵)

قولِ ابن عباس اور قولِ اعلیٰ حضرت میں غور

اب ذرا غور فرمایئے کہ اِن میں سے کس کا قول حق ہے اور کس کا باطل، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی

نے مولا علی علیہ السلام کے ساتھ اُموی جنگ کو شائبہ نفسانی اور تعصب قرار دیا، فاضل دیوبند مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے اس کو خاندانی رقابت سے تعبیر کیا، اور حکیم الامت نے بھی معاویہ کے لیے کینہ کا لفظ استعمال کیا، اگر چہ اُنہوں نے یہی لفظ مولا علی علیہ السلام کے لیے بھی لکھ دیا ہے۔ راقم الحروف قارئین کرام کو غور وفکر کرنے کی زحمت دیتا ہے کہ وہ فیصلہ فرمائیں کہ اِن میں سے کس کا قول صحیح ہے اور کس کا غلط؟ ہمارے حکیم الامت نے تو مولا علی علیہ السلام کی طرف بھی کینہ کی نسبت کی ہے، جبکہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے مولا علی علیہ السلام کی طرف یہ نسبت نہیں کی اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے تو مولا علی رضی اللہ عنہ کی طرف ایسے شبہات کی بھی نفی کی ہے جو روحِ اسلام کے خلاف ہوں۔

یہ عاجز بھی اِس سے قبل لکھ چکا ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی طرف کسی قسم کے ذاتی بغض و کینہ کی نسبت کرنا قرآن وسنت دونوں کے خلاف ہے۔ اب رہ گئی یہ بات کہ کیا قلبِ معاویہ میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں تعصب، خاندانی رقابت، شائبہ نفسانی اور بقول ہمارے حکیم الامت کے کینہ تھا یا نہیں؟ اِس پر عرض ہے کہ دلوں کے احوال عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ذات ہی جانتی ہے، انسان قرائن واحوال سے ہی کسی کے بارے میں رائے دے سکتا ہے۔ سو عام لوگوں کی کیا مجال کہ وہ کسی صحابی کے بارے میں رائے زنی کریں، اِس سلسلہ میں مکمل احتیاط نہ کی جائے تو انسان کی آخرت برباد ہوسکتی ہے۔ البتہ کسی صحابی کے بارے میں اُس کا کوئی معاصر صحابی ہی قرائن اور گرد وپیش کے احوال کو مدنظر رکھتے ہوئے کچھ اظہار خیال کرے تو پھر معاملہ غور طلب بن جاتا ہے۔ آیا سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے متعلق سینۂ معاویہ میں کینہ تھا؟ اِس بات کے ثبوت میں معاویہ کے ایسے معاصر کے الفاظ ملتے ہیں جن کے بارے میں جبریل علیہ السلام نے آکر اطلاع دی کہ وہ بہترین مفسر ہیں، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اُن کی شان میں فرمایا کہ وہ عمر میں نوجوان ہے اور علم وتجربہ میں بوڑھا، سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اُن کے حق میں فرمایا کہ وہ پردہ کے پیچھے سے غیب کو دیکھتا ہے اور خود اُنہوں نے اپنے بارے میں فرمایا: اگر اونٹ کے پاؤں میں باندھنے والی رسی گم ہو جائے تو میں قرآن مجید کے ذریعے تلاش کرلوں گا۔ اُنہوں نے اپنی بصیرت سے تاڑ لیا تھا کہ معاویہ کے قلب میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے لیے بُغض ہے۔ چنانچہ محدثین کرام لکھتے ہیں:

عَنْ سَعِيدِ بْنِ جُبَيْرٍ قَالَ: كُنَّا عِنْدَ ابْنِ عَبَّاسٍ بِعَرَفَةَ فَقَالَ: يَا سَعِيدُ! مَالِيَ لَا أَسْمَعُ النَّاسَ يُلَبُّونَ ؟ قُلتُ: يَخَافُونَ مُعَاوِيَةَ. فَخَرَجَ ابْنُ عَبَّاسٍ مِنْ فُسْطَاطِهِ فَقَالَ: لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ ، وَإِنْ رُغِمَ أَنْفُ مُعَاوِيَةَ ، اللّٰهُمَّ الْعَنْهُمْ فَقَدْ تَرَكُوا السُّنَّةَ مِنْ بُغْضِ عَلِيٍّ رضی اللہ عنہ.

''حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم عرفہ میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے تو اُنہوں نے پوچھا: سعید! کیا وجہ ہے کہ میں لوگوں کے تلبیہ کی آواز نہیں سن رہا؟ میں نے عرض کیا: معاویہ سے خوف کر رہے ہیں۔ پس ابن عباس رضی اللہ عنہ اپنے خیمہ سے نکلے تو پڑھنے لگے: ''لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ'' اگرچہ معاویہ کی ناک رگڑی جائے، اے اللہ! اِن پر لعنت فرما، اُنہوں نے علی رضی اللہ عنہ سے بغض کی وجہ سے سنت کو چھوڑ دیا ہے''۔

(السنن الكبرىٰ للبيهقي: كتاب الحج، باب التلبية يوم عرفة وقبله وبعده حتىٰ يرمى جمرة العقبة، ج ١٠ ص ٥٩ حديث ٩٥٢١؛ سنن النسائي، كتاب الحج ١٩٧، التلبية بعرفة ص ٤٦٥ حديث ٣٠٠٦؛ صحيح سنن النسائي للألباني ج ٢ ص ٣٤٣ حديث ٣٠٠٦؛ صحيح ابن خزيمة، كتاب الحج، باب استحباب التلبية بعرفات، وعلى الموقف، إحياءً للسنة إذ بعض الناس قد كان تركه في بعض الأزمان، ج ٢ ص ١٣٣٤ حديث ٢٨٣٠؛ المستدرك للحاكم ج ١ ص ٤٦٤، وط: ج ١ ص ٦٣٦ حديث ١٧٠٦؛ المهذب في اختصار السنن الكبير للذهبي ج ٤ ص ١٨٦١)

اِس صحیح حدیث میں تصریح ہے کہ معاویہ نے بغضِ مرتضوی کی وجہ سے ایک سنت نبوی کو ترک کر رکھا تھا اور لوگ فقط اُس کے خوف سے اُس سنت پر عمل کرنے سے قاصر تھے، یہاں اگر آپ چاہیں تو گزشتہ سطور میں مذکور اعلیٰ حضرت کے اِس قول کو بھی مدنظر رکھ سکتے ہیں:

''حضرت علی المرتضیٰ سے جنگ کرنے والا اگر اُن سے عداوت و بغض کی وجہ سے کرتا

ہے تو اہل سنت کے نزدیک بالاجماع وہ کافر ہے"۔

(فتاوی رضویه ج۱۵ ص ۲۳۵)

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ابن صخر کی جنگ اور سبّ وشتم تو شاید پیار سے ہوگا لیکن سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کی مذکورہ بالا حدیث کے مطابق اُنہوں نے سنتِ نبوی کو بغض مرتضوی کی وجہ ترک کرر کھا تھا۔ جب اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے جملہ میں اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں لفظ "بغض" آ گیا ہے تو پھر اگر آپ چاہیں تو درجِ ذیل حدیث میں بھی لفظِ بغض کو مدنظر رکھ لیں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

وَالَّذِي فَلَقَ الْحَبَّةَ وَبَرَأَ النَّسَمَةَ أَنَّهُ لَعَهِدَ النَّبِيُّ الأُمِّيُّ ﷺ إِلَيَّ أَنْ لَا يُحِبُّنِي إِلَّا مُؤْمِنٌ وَلَا يُبْغِضُنِي إِلَّا مُنَافِقٌ.

"اُس ذات جل جلالہ کی قسم جس نے دانے کو چیرا اور جاندار کو پیدا فرمایا، بیشک نبی اُمّی ﷺ نے قطعیت کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ مجھ (علی) سے محبت نہیں کرے گا مگر مومن اور میرے ساتھ بغض نہیں رکھے گا مگر منافق"۔

(صحيح مسلم: كتاب الإيمان، باب الدليل على أن حب الأنصار وعلي رضی اللہ عنہ من الإيمان وعلاماته، وبغضهم من علامات النفاق، ص ۱۵ حديث ۱۳۱ [۷۸])

ملتِ عثمان رضی اللہ عنہ یا ملتِ محمد ﷺ؟

یہاں شاید بعض لوگوں کے ذہن میں سوال پیدا ہو جائے کہ لوگ میدانِ عرفات میں تلبیہ "لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ" کہنے پر معاویہ سے کیوں خوف زدہ تھے؟ تو اِس کا جواب یہ ہے کہ یہ تلبیہ حج و عمرہ کو جمع کرنے کے لیے تھا، ایسا کرنے کو تمتع کہتے ہیں اور بعض اسلاف اِس کو قِران بھی کہہ دیتے تھے۔ واقعہ یہ ہوا کہ بعض سالوں میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو حج کرایا تو اُنہیں حج تمتع سے منع کر دیا تھا اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اُن سے اختلاف کیا تھا۔ چنانچہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ اُنہوں نے بیان کیا:

"سیدنا علی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مابین عسفان کے مقام پر حج تمتع کے مسئلہ

میں اختلاف پیدا ہو گیا تو سیدنا علی ﷺ نے فرمایا: آپ کا اس کے سوا اور کوئی ارادہ نہیں کہ آپ لوگوں کو اُس عمل سے روک دیں جسے نبی کریم ﷺ نے کیا تھا، بہر حال جب سیدنا علی ﷺ نے یہ صورتِ حال دیکھی تو اُنہوں نے حج و عمرہ دونوں کے لیے تلبیہ کی آواز بلند فرمائی''۔

(بخاري: كتاب الحج، باب التمتع والإقران والإفراد بالحج... ص ۲۱۲ حديث ۱۵۶۹)

صحیح مسلم میں ہے کہ اس موقع پر حضرت عثمان غنی نے سیدنا علی رضی اللہ عنہما سے کہا:

دَعْنَا مِنْکَ ، فَقَالَ: إِنِّي لَا أَسْتَطِيعُ أَنْ أَدَعَکَ.

''ہماری جان چھوڑیے! فرمایا: مجھ سے نہیں ہوسکتا کہ میں آپ کو (اِس مسئلہ میں) چھوڑ دوں''۔

(صحيح مسلم: كتاب الحج، باب جواز التمتع، ص ۵۶۱ حديث [۱۵۹] ۱۲۲۳)

یہ حدیث اِس سے زیادہ وضاحت سے بھی آئی ہے، چنانچہ مروان بن الحکم بیان کرتا ہے:

''میں نے عثمان و علی رضی اللہ عنہما کو مکہ کے درمیان پایا، حضرت عثمان ﷺ نے تمتع سے یعنی عمرہ و حج کو جمع کرنے سے منع کیا تھا۔ جب علی نے یہ معاملہ دیکھا تو اُنہوں نے اِن دونوں کو جمع کر کے بہ آواز بلند تلبیہ کیا اور کہا: میں عمرہ اور حج کا اکٹھے تلبیہ کرتا ہوں۔ حضرت عثمان ﷺ نے اُنہیں کہا:

تَرَانِي أَنْهَى النَّاسَ عَنْ شَيْءٍ وَأَنْتَ تَفْعَلُهُ ؟ فَقَالَ: مَا كُنْتُ لَأَدَعَ سُنَّةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ لِقَوْلِ أَحَدٍ مِنَ النَّاسِ.

''آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں لوگوں کو ایک چیز سے روک رہا ہوں اور آپ اُسی چیز کو کر رہے ہیں؟ فرمایا: میں ایسا نہیں ہوں کہ کسی شخص کے قول کی خاطر رسول اللہ ﷺ کی سنت کو چھوڑ دوں''۔

(مسند أبي داود الطيالسي ج ۱ ص ۹۴ حديث ۹۶؛ بخاري: كتاب الحج، باب التمتع

والإقران والإفراد بالحج... ص ۲۱۱ حديث ۱۵۶۳؛ سنن النسائي: كتاب المناسك [۴۹] باب القِرَان، ج ۵ ص ۱۶۲ حديث ۲۷۲۱، ۲۷۲۲؛ السنن الكبرىٰ للبيهقي ج ۹ ص ۲۸۴؛ سنن الدارمي ج ۲ ص ۵۹ حديث ۱۹۲۳؛ موافقة خُبر الخبر للعسقلاني ج ۱ ص ۲۸۸)

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمان ﷜ اِس اختلاف پر خاموش ہو گئے اور کوئی مزاحمت نہ فرمائی، لیکن معاویہ بن ابی سفیان کو یہ اختلاف نہیں بھولا تھا، سو اُنہوں نے سیدنا علی ﷜ سے بغض کی وجہ سے اپنے دور میں اس قدر سختی سے لوگوں کو حج تمتع سے منع کر دیا تھا کہ لوگ اُن سے خوف زدہ ہو گئے تھے اور اِس خوف کی وجہ سے اِس سنت کو ترک کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اِسی لیے سیدنا ابن عباس ﷜ نے فرمایا تھا: ''فَقَدْ تَرَكُوا السُّنَّةَ مِنْ بُغْضِ عَلِيٍّ ﷜'' (لوگوں نے بغض علی میں سنت کو ترک کر دیا) یہاں یہ شبہ بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ چونکہ سیدنا ابن عباس ﷜ ہاشمی تھے، لہٰذا ممکن ہے کہ اُن کی رگِ ہاشمیت حرکت میں آئی ہو اور اُنہوں نے بوجہ تعصب معاویہ کے بارے میں مذکورہ بالا الفاظ کہہ دیے ہوں، لیکن کتبِ اسلامیہ میں ایسی صحیح تصریحات بھی موجود ہیں جو سیدنا ابن عباس ﷜ سے ایسے تعصب کی نفی کرتی ہیں اور معاویہ بن ابی سفیان کے تعصّب کو ثابت کرتی ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی اور دوسرے محدثین لکھتے ہیں:

قَالَ ابْنُ أَبِي عُمَرَ: حَدَّثَنَا سُفْيَانُ، عَنِ ابْنِ طَاوسَ، عَنْ أَبِيهِ قَالَ: إِنَّ مُعَاوِيَةَ قَالَ لِابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا: أَعَلىٰ مِلَّةِ ابْنِ أَبِي طَالِبٍ أَنْتَ؟ قَالَ: لَا، وَلَا مِلَّةِ ابْنِ عَفَّانَ، قَالَ مُعَاوِيَةُ: فَعَلىٰ أَيِّ مِلَّةٍ أَنْتَ؟ قَالَ: عَلىٰ مِلَّةِ مُحَمَّدٍ ﷺ.

''معاویہ نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا: کیا آپ ابن ابی طالب کی ملت پر ہیں؟ اُنہوں نے فرمایا: نہیں، اور نہ ہی میں ابن عفان کی ملت پر ہوں۔ معاویہ نے کہا: تو آپ کس کی ملت پر ہیں؟ فرمایا: سیدنا محمد ﷺ کی ملت پر''۔

(المطالب العالية بزوائد المسانيد الثمانية، كتاب الإيمان والتوحيد، باب الملة ملة محمد ﷺ ج ۱۲ ص ۴۲۷ حديث ۲۹۴۰؛ المصنف لعبد الرزاق ج ۱۱ ص ۴۵۳ حديث ۲۰۹۸۳؛ شرح

أصول اعتقاد أهل السنة للالكائي ج١ ص٩٤ حديث١٣٣؛ الإبانة عن شريعة الفرقة الناجية ومجانبة الفِرَق المذمومة، لابن بطة حنبلي ج٢ ص٣٥٤ حديث٢٣٧، ٢٣٨؛ حلية الأولياء ج١ ص٣٢٩؛ منهاج السنة النبوية لابن تيمية ج١ ص١٧١ وط: ج٢ ص٩٦)

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کے اِس قول کے بارے میں **المطالب العالیة** کے محقق دکتور عمر ایمان ابوبکر لکھتے ہیں:

''یہ اثر (قولِ صحابی) صحیح ہے، اس کے راوی بخاری اور مسلم کے راوی ہیں ماسوا ابن ابی عمر کے، وہ مسلم کا راوی ہے''۔

(المطالب العالية بزوائد المسانيد الثمانية ج١٢ ص٤٢٧)

اِس سے معلوم ہوا کہ معاویہ بن ابی سفیان کے ذہن میں اُموی اور ہاشمی علیحدہ علیحدہ دو ملتیں تھیں اور وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے اختلاف کرنے کو ہاشمی اور اُموی اختلاف گردانتے تھے، پھر یہاں تک بس نہیں بلکہ موصوف ترجیح بھی ملتِ عثمانی کو دیتے تھے، اور اُس ترجیح میں اُن کے مدنظر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت نہیں بلکہ اُن کی قرابت ہوتی تھی۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل لکھتے ہیں:

''عباد بیان کرتے ہیں کہ جب معاویہ بن ابی سفیان حج کرنے آئے تو ہم بھی اُن کے ساتھ مکۃ المکرمہ آئے، اُنہوں نے ہمیں نماز ظہر دو رکعت پڑھائی پھر دار الندوہ کی طرف چلے گئے۔ عباد کہتے ہیں: اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جب مکہ تشریف لاتے تو ظہر، عصر اور عشاء مکمل چار چار رکعت پڑھاتے، پھر جب منیٰ اور عرفات جاتے تو قصر کرتے، پھر جب حج سے فارغ ہو کر منیٰ میں قیام کرتے تو مکہ سے کوچ کرنے تک چار رکعت ہی پڑھتے۔ پس جب معاویہ نے ہمیں ظہر پڑھائی تو دو رکعت پڑھائیں۔ اِس پر مروان بن الحکم اور عمر بن عثمان بن عفان اُن کی طرف بڑھے اور اُنہیں کہنے لگے: آپ نے اپنے چچازاد پر ایسا قبیح عیب لگایا ہے کہ ایسا کسی نے بھی نہیں لگایا۔ اُنہوں نے پوچھا: وہ کیا؟ وہ دونوں کہنے لگے: کیا آپ نہیں جانتے کہ وہ مکہ میں پوری نماز پڑھتے تھے؟

معاویہ نے کہا: افسوس! میں اس کے سوا اور کیا کرتا؟ میں نے رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ بھی اسی طرح نماز پڑھی ہے۔ وہ کہنے لگے: لیکن آپ کے چچا زاد نے تو پوری چار رکعت پڑھائی تھیں، آپ کا اُن کے خلاف کرنا اُن کے لیے عیب ہے۔ عباد کہتے ہیں: پھر جب معاویہ نمازِ عصر کے لیے نکلے تو چار رکعتیں پڑھائیں''۔

(مسند أحمد (مسند الشاميين، مسند معاوية) ج٤ ص ٩٤؛ وط: بتحقيق أحمد شاكر ج١٣ ص١٨٣ حديث ١٦٨٠٠)

حافظ ہیثمی نے کہا ہے: امام احمد کے راویوں کی توثیق کی گئی ہے، حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس کی سند کو حسن کہا ہے، حمزہ احمد الزین نے صحیح کہا ہے اور شیخ شعیب الارنوط نے حسن کہا ہے۔

(مجمع الزوائد ج٢ ص١٥٦، ١٥٧؛ فتح الباري: كتاب تقصير الصلاة، باب يقصر إذا خرج من موضعه، ج٣ ص٤٧١؛ مسند أحمد بتحقيق أحمد الزين ج١٣ ص١٨٣؛ مسند أحمد ج ٢٨ ص ٧٠، ٧١)

حضرت عثمان بن عفان ؓ مکہ میں چار رکعت کیوں پڑھتے تھے؟ اِس کی تاویلات وتوجیہات فتح الباری وغیرہ میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ یہاں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ مروان اور عمرو بن عثمان نے جس بات کو معاویہ کے سامنے عیب بنا کر پیش کیا وہ بات دوسرے صحابہ کرام ؓ کے علم کے مطابق ہی نہیں بلکہ خود معاویہ کی معلومات کے مطابق بھی سنتِ نبوی ﷺ تھی اور شیخین کریمین رضی اللہ عنہما کا عمل بھی اُسی پر تھا مگر معاویہ بن ابی سفیان نے خلیفۂ ثالث کی وجہ سے نہیں بلکہ محض اپنے عمِ زاد کی وجہ سے سنتِ نبوی اور عملِ شیخین کریمین رضی اللہ عنہما کو چھوڑ دیا تھا، کیونکہ وہ خود کو ملت عثمان پر سمجھتے تھے اور سیدنا ابن عباس ؓ کو کہتے تھے: ''أَعَلىٰ مِلَّةِ ابْنِ أَبِي طَالِبٍ أَنْتَ؟'' (کیا آپ ابن ابی طالب کی ملت پر ہیں؟) حالانکہ اُمت مسلمہ کے لیے فقط ملتِ ابراہیمی اور ملتِ محمدی ہے، نبی کریم ﷺ کی سنت کے برعکس کسی کی سنت اور ملت کی کوئی گنجائش نہیں۔

جن لوگوں کے سینے اِس قسم کی مصنوعی ملتوں اور قومی تعصب سے پاک تھے اُنہوں نے واضح فرما دیا

تھا کہ ملت کسی کے باپ کی نہیں بلکہ فقط سید العالمین محمد رسول اللہ ﷺ کی ہے۔ چنانچہ حج تمتع کے متعلق ہی مسند احمد وغیرہ میں ہے کہ سیدنا عمرؓ نے لوگوں کو فرمایا کہ عمرہ کا کمال یہ ہے کہ اُسے حج سے الگ کیا جائے، اِس سے بعض لوگوں کو گمان ہوا کہ اُنہوں نے حج و عمرہ کو جمع کرنے سے منع کر دیا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے حج تمتع کی رخصت بیان فرمائی تو بعض لوگ کہنے لگے: آپ کے والد تو اس سے منع کرتے تھے۔ اس پر ابن عمرؓ کا ردِعمل کیا تھا؟ ذرا غور سے پڑھئے:

أَفَرَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ أَحَقُّ أَنْ تَتَّبِعُوْا سُنَّتَهٗ أَمْ سُنَّةُ عُمَرَ؟ إِنَّ عُمَرَ لَمْ يَقُلْ لَكُمْ إِنَّ الْعُمْرَةَ فِيْ أَشْهُرِ الْحَجِّ حَرَامٌ ، وَلٰكِنَّهٗ قَالَ: إِنَّ أَتَمَّ الْعُمْرَةَ أَنْ تُفْرِدُوْهَا مِنْ أَشْهُرِ الْحَجِّ.

''رسول اللہ ﷺ زیادہ حق رکھتے ہیں کہ اُن کی سنت کی اتباع کی جائے یا عمر کی سنت؟ سیدنا عمرؓ نے تمہیں یہ نہیں فرمایا تھا کہ عمرہ حج کے مہینوں میں حرام ہے، لیکن اُنہوں نے فرمایا تھا کہ پورا عمرہ یہ ہے کہ تم اُسے تنہا حج کے مہینوں کے علاوہ کرو''۔

(مسند أحمد، مسند عبدالله بن عمر، بتحقيق أحمد شاكر ج٥ ص ١٩٠، ١٩١ حديث ٥٧٠٠ ؛السنن الكبرىٰ للبيهقي ج٥ ص ٢١)

ایک مرتبہ بعض شامیوں نے اُن سے یہی مسئلہ پوچھا تو اُنہوں نے اپنے والد کے عمل کی کسی قسم کی توجیہ و توضیح کیے بغیر فرمایا: جائز ہے۔ امام ترمذی لکھتے ہیں:

فَقَالَ الشَّامِيُّ: إِنَّ أَبَاكَ قَدْ نَهٰى عَنْهَا ، فَقَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ: أَرَأَيْتَ إِنْ كَانَ أَبِيْ نَهٰى عَنْهَا وَصَنَعَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ أَأَمْرُ أَبِيْ يُتَّبَعُ أَمْ أَمْرُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ الرَّجُلُ: بَلْ أَمْرُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ: لَقَدْ صَنَعَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ.

''شامی شخص نے کہا: آپ کے باپ نے تو اِس سے منع کیا تھا، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تمہارا کیا خیال ہے، میرے باپ نے اس سے منع کیا اور

رسول اللہ ﷺ نے اسے کیا، آیا میرے باپ کے حکم کی اتباع کی جائے یا رسول اللہ ﷺ کے حکم کی؟ اُس شخص نے کہا: بلکہ رسول اللہ ﷺ کے حکم کی۔ فرمایا: تو رسول اللہ ﷺ نے حج تمتع کیا تھا''۔

(جامع الترمذي: أبواب الحج، باب ماجاء في التمتع، ج۲ ص۱۷۵ حدیث۸۲٤؛ مسند أبي یعلیٰ ج۹ ص۳٤۱، ۳٤۲ حدیث٥٤٥١)

اِس مقام پر السنن الکبریٰ للبیهقي میں کافی وشافی بیان ہے، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ اُنہوں نے فرمایا: میں منع نہیں کرتا لیکن میں چاہتا ہوں کہ لوگ بکثرت بیت اللہ شریف کی زیارت کے لیے آیا کریں اور حج کے مہینوں کے علاوہ بھی عمرہ کیا کریں۔ امینِ شریعتِ نبوی ﷺ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے تو اُن سے باقاعدہ پوچھ ہی لیا تھا کہ اُنہوں نے تمتع سے منع تو نہیں کیا؟ چنانچہ امام بیہقی لکھتے ہیں:

قَالَ عَلِيُّ بْنُ أَبِي طَالِبٍ رضی اللہ عنہ لِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رضی اللہ عنہ: أَنَهَيْتَ عَنِ الْمُتْعَةِ ؟ قَالَ: لَا وَلٰكِنِّي أَرَدْتُ كَثْرَةَ زِيَارَةِ الْبَيْتِ ، قَالَ: فَقَالَ عَلِيٌّ رضی اللہ عنہ: مَنْ أَفْرَدَ الْحَجَّ فَحَسَنَ وَمَنْ تَمَتَّعَ فَقَدْ أَخَذَ بِكِتَابِ اللّٰهِ وَسُنَّةِ نَبِيِّهِ ﷺ.

''سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو فرمایا: کیا آپ نے تمتع سے روک دیا ہے؟ اُنہوں نے عرض کیا: نہیں لیکن میں نے بیت اللہ کی زیارت کی کثرت کا ارادہ کیا ہے۔ اِس پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جس نے حجِ اِفراد کیا تو اچھا کیا اور جس نے تمتع کیا تو اُس نے اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اُس کے نبی ﷺ کی سنت پر عمل کیا''۔

(السنن الکبریٰ للبیهقي ج٥ ص۲۱ حدیث۸۸۷۷؛ المهذب في اختصار السنن الکبیر للذهبي ج٤ ص۱۷٦۲)

بھلا سنتِ نبوی ﷺ سے کوئی خلیفہ راشد کیسے منع کر سکتا تھا؟ کتاب وسنت کی اِس تصریح پر عمل کرنے سے سب سے پہلے جس شخص نے منع کیا وہ معاویہ بن ابی سفیان ہے۔ چنانچہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

تَمَتَّعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ حَتّٰى مَاتَ ، وَأَبُوْبَكْرٍ حَتّٰى مَاتَ ، وَعُمَرُ حَتّٰى مَاتَ ، وَعُثْمَانُ حَتّٰى مَاتَ ، وَكَانَ أَوَّلُ مَنْ نَهٰى عَنْهَا مُعَاوِيَةُ.

''رسول اللہ ﷺ نے حج تمتع کیا یہاں تک کہ آپ کا وصال ہوا، اور حضرت ابوبکر نے کیا حتیٰ کہ اُن کا انتقال ہوا، اور حضرت عمر نے کیا حتیٰ کہ وہ انتقال کر گئے، اور حضرت عثمان ؓ نے کیا حتیٰ کہ اُن کی وفات ہوئی، اور پہلا شخص جس نے اِس سے منع کیا وہ معاویہ ہے''۔

(مسند أحمد بتحقيق أحمد شاكر، مسند ابن عباس، ج۳ ص۱۹۲ حديث ۲٦٦٤، وص ۲۷۱ حديث ۲۸۷۹؛ جامع الترمذي: أبواب الحج، باب ماجاء في التمتع، ج۲ ص ۱۷٤ حديث ۸۲۲؛ المصنف لابن أبي شيبة: كتاب الأوائل، ج۱۳ ص ۳۱ حديث ۳٦۸٦٤؛ شرح معاني الآثار: كتاب مناسك الحج، باب إحرام النبي ﷺ ج۲ ص ۱٤۱ حديث ۳٦٦۱)

بتایئے! سیدنا ابن عباس ؓ نے معاویہ بن ابی سفیان کو اوّل منع کرنے والا شخص کیوں کہا؟ اِس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ابن صخر نے نہ صرف یہ کہ اِس عمل سے منع کیا تھا بلکہ اُس منع میں اِس قدر سختی کی تھی کہ لوگ خوف زدہ ہو گئے تھے، اور سیدنا ابن عباس ؓ بھانپ گئے تھے کہ اِس سختی کا سبب بغضِ علی ہے، چونکہ وہ نہ صرف یہ کہ موصوف کے مزاج سے واقف تھے بلکہ اُنہوں نے موصوف کی زبان سے یہ الفاظ بھی سن رکھے تھے: ''أَعَلٰى مِلَّةِ ابْنِ أَبِيْ طَالِبٍ أَنْتَ؟'' (کیا آپ فرزند ابو طالب کی ملّت پر ہیں؟)

کیا مِلّتِ معاویہ بھی تھی؟

نہ صرف یہ کہ موصوف سنتِ نبوی ﷺ اور شیخین کے عمل پر اپنے عم زاد کے طریقے کو ترجیح دیتے تھے بلکہ جہاں دنیوی مفاد ہوتا تو اپنی رائے کو حکم نبوی ﷺ پر بھی ترجیح دینے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ ایسے موقع پر اگر اُنہیں ٹوکا جاتا اور حدیث نبوی ﷺ سنائی جاتی تو کہتے: میں تو اِس جیسے معاملہ میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔ چنانچہ ہم اپنی کتاب ''الأحاديث الموضوعة في فضائل معاوية'' میں ہادی مہدی اور سود کے عنوان کے تحت تفصیلاً لکھ چکے ہیں کہ اُنہیں ایک سودی معاملہ میں سیدنا عبادہ بن صامت اور سیدنا

ابوالدرداء رضی اللہ عنہما نے ٹوکا تو اُنہوں نے کہا:

مَا أَرٰی بِمِثْلِ هٰذَا بَأْسًا.

''میں اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتا''۔

اس پر سیدنا ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

مَنْ يَعْذِرُنِي مِنْ مُعَاوِيَةَ؟ أَنَا أُخْبِرُهُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَيُخْبِرُنِي عَنْ رَأْيِهِ.

''معاویہ کے بارے میں مجھے کون معذور سمجھے گا؟ میں اُس کو رسول اللہ ﷺ کی حدیث سناتا ہوں اور وہ مجھے اپنی رائے سناتا ہے''۔

(الموطأ للإمام مالك ج۳ ص۳۹۱ حديث۱۴۴۲؛ مسند الإمام الشافعي مع شرحه الشافي لابن الأثير الجزري ج٤ ص۹۷؛ السنن للإمام الشافعي ج۱ ص۳۱۸ حديث۲۱۸؛ الرسالة للإمام الشافعي ص٤٤٦ فقرة۱۲۲۸؛ تهذيب الكمال ج۷ ص١٦٤، ١٦٥)

سیدنا ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کے حدیث نبوی ﷺ کے سنانے کا امیر شام پر کوئی اثر نہ ہوا اور جب وہ اپنی ذاتی رائے پر ڈٹے رہے تو سیدنا ابوالدرداء رضی اللہ عنہ دل برداشتہ ہو کر شام سے چلے گئے، حتیٰ کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو معاویہ کی طرف خط لکھنا پڑا تا کہ وہ ذاتی رائے کو چھوڑ کر سنتِ نبوی ﷺ کی طرف پلٹ آئے۔ شاید یہاں کسی انسان کو یہ سوجھے کہ یہ معاویہ کا اجتہاد تھا، تو جاننا چاہیئے کہ نص کی موجودگی میں اجتہاد نہیں ہوتا۔ چنانچہ علامہ ابوالولید الباجی المالکی سیدنا ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کے الفاظ ''مَنْ يَعْذُرُنِي مِنْ مُعَاوِيَةَ، الخ'' کی تشریح میں لکھتے ہیں:

إِنْكَارٌ مِنْهُ عَلٰى مُعَاوِيَةَ، التَّعَلُّقُ بِالرَّأْيِ يُخَالِفُ النَّصَّ، وَلَمْ يَحْمِلْ ذٰلِكَ مِنْ مُعَاوِيَةَ عَلَى التَّأْوِيْلِ، وَإِنَّمَا حَمَلَهُ مِنْهُ عَلٰى رَدِّ الْحَدِيْثِ بِالرَّأْيِ.

''یہ اُن کی طرف سے معاویہ پر نکیر ہے کہ اُس نے رائے سے نص کی مخالفت کی، اُنہوں نے اس کو معاویہ کی تاویل پر محمول نہیں کیا، اُنہوں نے تو اس کو فقط رائے سے

حدیث کو مسترد کرنا سمجھا ہے"۔

(المنتقیٰ شرح موطأ ج٦ ص٢٣٦)

نص کے مقابلہ میں رائے کا حکم

اگر کسی زمانے میں کوئی بھی انسان نص کے مقابلے میں اپنی رائے پیش کرے تو اُس کا کیا حکم ہے؟ یہ جاننے کے لیے ہم آپ کو تردیدِ روافض میں بعض مشہور ترین علماء کے ہاں لے چلتے ہیں۔ علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

مُعَارَضَةُ أَقْوَالِ الْأَنْبِيَاءِ بِآرَاءِ الرِّجَالِ وَتَقْدِيمِ ذٰلِكَ عَلَيْهَا ، هُوَ مِنْ فِعْلِ الْمُكَذِّبِينَ لِلرُّسُلِ ، بَلْ هُوَ جِمَاعُ كُلِّ كُفْرٍ ، كَمَا قَالَ الشَّهْرِسْتَانِيُّ فِي أَوَّلِ كِتَابِهِ الْمَعْرُوفِ "بِالْمِلَلِ وَالنِّحَلِ" مَا مَعْنَاهُ: أَصْلُ كُلِّ شَرٍّ هُوَ مِنْ مُعَارَضَةِ النَّصِّ بِالرَّأْيِ ، وَتَقْدِيمِ الْهَوٰى عَلَى الشَّرْعِ.

وَهُوَ كَمَا قَالَ: فَإِنَّ اللّٰهَ أَرْسَلَ رُسُلَهُ، وَأَنْزَلَ كُتُبَهُ، وَبَيَّنَ أَنَّ الْمُتَّبِعِينَ لِمَا أَنْزَلَهُ هُمْ أَهْلُ الْهُدٰي وَالْفَلَاحِ، وَالْمُعْرِضِينَ عَنْ ذٰلِكَ هُمْ أَهْلُ الشَّقَاءِ وَالضَّلَالِ، إِلٰى أَنْ قَالَ ...... وَمَعْلُومٌ أَنَّ الْكَلَامَ الَّذِي جَاءَتْ بِهِ الرُّسُلُ عَنِ اللّٰهِ نَوْعَانِ: إِمَّا إِنْشَاءٌ وَإِمَّا إِخْبَارٌ ، وَالْإِنْشَاءُ يَتَضَمَّنُ الْأَمْرَ وَالنَّهْيَ وَالْإِبَاحَةَ ، فَأَصْلُ السَّعَادَةِ تَصْدِيقُ خَبَرِهِ، وَطَاعَةُ أَمْرِهِ ، وَأَصْلُ الشَّقَاوَةِ مُعَارَضَةُ خَبَرِهِ وَأَمْرِهِ بِالرَّأْيِ وَالْهَوٰى ، وَهٰذَا مُعَارَضَةُ النَّصِّ بِالرَّأْيِ ، وَتَقْدِيمُ الْهَوٰى عَلَى الشَّرْعِ.

"انبیاء کرام علیہم السلام کے ارشادات کے مقابلہ میں شخصی آراء کو لانا اور اُن پر مقدم کرنا یہ رسولوں کو جھٹلانے والے لوگوں کا کام ہے بلکہ ہر لحاظ سے کفر ہے، جیسا کہ شہرستانی نے اپنی معروف کتاب "الملل والنحل" کے آغاز میں ذکر کیا ہے، جس کا مفہوم یہ ہے: ہر شر کی جڑ نص کو رائے سے مسترد کرنا اور خواہش کو شرع پر مقدم کرنا ہے۔

اور ایسا ہی ہے جیسا کہ اُنہوں نے فرمایا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو بھیجا اور اپنی کتابوں کو اُتارا تو واضح فرما دیا کہ جنہوں نے اُس کے نازل کردہ کلام کی پیروی کی وہی ہدایت و فلاح والے ہیں اور جو اُس سے روگرداں ہیں وہ شقاوت و گمراہی والے ہیں اور معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اُس کے تمام رسول جو کلام لائے اُس کی دو قسمیں ہیں: یا تو وہ کلام انشاء ہے یا خبر، اور انشاء امر، نہی اور اباحت پر مشتمل ہوتا ہے۔ پس اصل سعادت اُس کی خبر کی تصدیق میں اور اُس کے امر کی طاعت میں ہے، اور اصل بدبختی اُس کی خبر اور امر کی ذاتی رائے اور خواہش سے تقابل میں ہے۔ اِسی کو رائے سے نص کا مقابلہ اور شریعت پر خواہش کی تقدیم کہتے ہیں''۔

(درأ تعارض العقل والنقل، لابن تيمية ج٥ ص ٢٠٤، ٢٠٥)

قارئین کرام! یہی وہ تقدیم علی النص ہے جس کی قرآن مجید میں یوں ممانعت آئی ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ فِيْ قَوْلِهِ: ﴿يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ﴾ قَالَ: لَا تَقُوْلُوْا خِلَافَ الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ.

''سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ فرمانِ الٰہی ﴿اے ایمان والو اللہ اور اُس کے رسول سے آگے نہ بڑھو﴾ کی تفسیر میں فرماتے ہیں: کتاب وسنت کے خلاف نہ بولو''۔

(جامع البيان ج٢١ ص ٣٣٥؛ تفسير ابن أبي حاتم ج١٠ ص ٣٣٠٢؛ ذم الكلام للهروي ج ٢ ص ١١٦؛ حلية الأولياء ج١٠ ص ٣٩٨؛ الدر المنثور ج١٣ ص ٥٢٧)

کتاب وسنت سے محبت کرنے والے اہل اسلام سے اپیل ہے کہ وہ اس حساس مقام کو مزید سمجھنے کے لیے ہماری کتاب **''الأحاديث الموضوعة في فضائل معاوية''** کا یہی مقام ضرور دیکھیں۔ اُنہیں معلوم ہوگا کہ متقدمین اور طوعاً اسلام قبول کرنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے جب اُن کی رائے کے خلاف کوئی نص پیش کی جاتی تو وہ کس طرح اپنی رائے کو چھوڑ کر کتاب وسنت کے سامنے سرنگوں ہو جاتے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ مسلسل نو برس تک ایک فتویٰ دیتے رہے، لیکن جب اُسی مسئلہ میں اُن کی رائے کے

خلاف حدیث نبوی ﷺ آ گئی تو وہ کس طرح حدیث نبوی کے سامنے بچھ گئے تھے۔ ایسی مزید مثالوں کے لیے مذکورہ بالا کتاب کا مطالعہ ضرور فرمایئے۔

نص کے مقابل ذاتی رائے شیخین کی نظر میں

یہاں یہ ناکارہ قارئین کرام کی ایمانی اور روحانی ضیافت کے لیے چند ایسے ہدایت یافتہ حضرات کی مثالیں پیش کرنا چاہتا ہے جو نص کے مقابلہ میں ذاتی رائے کو نفسانیت اور شیطانیت سمجھتے تھے؟ میراث کے مسائل میں کلالۃ کا مسئلہ انتہائی پیچیدہ ہے، یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے بھی مشکل تھا۔ جب سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اس کے متعلق دریافت کیا گیا تو اُنہوں نے واضح نص نہ ہونے کی صورت میں یوں جواب دیا:

إِنِّي سَأَقُولُ فِيهَا بِرَأْيِي ، فَإِنْ كَانَ صَوَابًا فَمِنَ اللّٰهِ ، وَإِنْ كَانَ خَطَأً فَمِنِّي وَمِنَ الشَّيْطَانِ.

”فی الحال میں اس مسئلہ میں اپنی رائے بیان کرتا ہوں، اگر درست ہوئی تو اللہ کی جانب سے ہوگی اور اگر غلط ہوئی تو میری اور شیطان کی طرف سے ہوگی“۔

(سنن الدارمي: كتاب الفرائض، باب الكلالة، ج۲ ص ٤٦٢ حديث ٢٩٧٢؛ المصنف لابن أبي شيبة: كتاب الفرائض، باب: في الكلالة من هم؟ ج ١٠ ص ٥٧٩ حديث ٣٢١٣٠؛ موسوعة الحافظ ابن حجر العسقلاني ج۲ ص ٦٢٠، ٦٢١)

حضرت مسروق بیان کرتے ہیں:

”کاتب نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی طرف سے لکھا: یہ وہ مسئلہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے عمر کو دکھایا ہے، اس پر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کاتب کو ڈانٹتے ہوئے فرمایا بلکہ یوں لکھو!

هٰذَا مَا رَاٰى عُمَرُ ، فَإِنْ كَانَ صَوَابًا فَمِنَ اللّٰهِ ، وَإِنْ كَانَ خَطَأً فَمِنْ عُمَرَ.

”یہ عمر کی رائے ہے، پس اگر درست ہے تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اور اگر خطا ہے تو عمر کی طرف سے ہے“۔

(السنن الكبرىٰ للبيهقي: كتاب أدب القاضي، باب مايقضى به القاضي ويفتي به المفتي ج

۲۰ ص ۳۳۹ حديث ۲۰۳۷٤؛شرح مشكل الآثار: باب بيان مشكل ماروي عن رسول الله ﷺ فی القضاة من منهم فی النار ومَن منهم فی الجنة، ج۹ ص ۲۱٤ ضمن حدیث ۳۵۸۳؛ذم الكلام للهروي ج۲ ص ۱۰۳ حديث ۲۵۸؛موسوعة الحافظ ابن حجر العسقلاني ج۲ ص ٦۲۱ حديث ۱۲۰)

کتاب وسنت کے سامنے یہ اُن شیخین کریمین رضی اللہ عنہما کا سر تسلیم خم کرنا ہے جن کے بارے میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے کہ میرے بعد ان کی پیروی کرنا۔اسی طرح ایک اور بھی عظیم ترین صحابی سے ایسا ہی ایمان افروز قول منقول ہے۔یہ وہ ذہین وفہیم صحابی ہیں جن کے متعلق آقائے کائنات ﷺ نے پہلی ملاقات میں فرمایا تھا: یہ سیکھا سکھایا بچہ ہے۔اُن کے سامنے ایک ایسا مسئلہ لایا گیا جس کے بارے میں اُنہیں کتاب وسنت کی کوئی نص (صراحت) معلوم نہیں تھی تو اُنہوں نے وہ مسئلہ اپنی رائے سے بتایا اور ساتھ ہی فرما دیا: میرا بتایا ہوا صحیح ہوا تو اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول کریم ﷺ کی جانب سے ہوگا اور اگر خطا ہوا تو میری اور شیطان کی طرف سے ہوگا،اور خدا کا فضل یہ ہوا کہ اُن کے بتائے ہوئے کی تصدیق حدیث نبوی ﷺ سے ہوگئی۔آیئے مکمل حدیث سماعت فرمایئے! محدثین کرام لکھتے ہیں:

''عتبہ بن عبداللہ بن مسعود ﷛ سیدنا عبداللہ بن مسعود ﷛ کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ اُن کے ہاں ایک ایسے شخص کی خبر لائی گئی جس نے شادی کی تو مباشرت اور حق مہر کی ادائیگی سے پہلے ہی اُس کا انتقال ہوگیا۔ایک مہینہ تک یا بقول راوی کئی بار اس مسئلہ کے حل کے لیے لوگ آئے۔بالآخر سیدنا ابن مسعود ﷛ نے فرمایا: اب میں اِس مسئلہ کے بارے میں کچھ کہتا ہوں: اُس عورت کے لیے اُسی طرح دستور کے مطابق حق مہر ہے جس طرح دوسری عورتوں کے لیے بغیر کسی کمی بیشی کے ہوتا ہے،اور اُس کا میراث میں بھی حق ہے اور اُس پر عدت بھی ہے۔

فَإِنْ يَّكُ صَوَابًا فَمِنَ اللّٰهِ ، وَإِنْ يَّكُنْ خَطَأً فَمِنِّي وَمِنَ الشَّيْطَانِ ، وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُه بَرِيْئَانِ.

سواگر یہ درست ہے تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے اور اگر خطا ہے تو میری اور شیطان کی طرف سے ہے، اللہ ﷻ اور اُس کا رسول ﷺ بری ہیں"۔

اس پر کچھ اشجعی لوگ کھڑے ہوئے، جن میں ایک جراح اور دوسرے سنان تھے۔ اُنہوں نے عرض کیا: اے ابن مسعود! ہم گواہی دیتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بِرْوَعْ بنت واشق جن کا شوہر ہلال بن مرہ اشجعی تھا، کے بارے میں اسی طرح فیصلہ کیا تھا جس طرح آپ نے کیا ہے۔ اس پر سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ انتہائی خوش ہوئے کہ اُن کا فیصلہ رسول اللہ ﷺ کے فیصلہ کے موافق ہو گیا ہے"۔

(سنن أبي داود: كتاب النكاح، باب فيمن تزوج ولم يسم صداقا حتى مات، ج٢ ص٤٠٧ حديث٢١١٦؛ سنن النسائي: كتاب النكاح، إباحة التزويج بغير صداق ج٦ ص٤٣٢ حديث ٣٣٥٨؛ صحيح ابن حبان ج٩ ص٤١٠، ٤١١ حديث ٤١٠٠، ٤١٠١؛ المستدرك للحاكم ج٢ ص١٨٠)

اِس عظیم فقیہ صحابی کو اُن کی اعلیٰ ذہانت اور نص کے سامنے عاجزی اور متانت کی بدولت امام الانبیاء ﷺ نے انتہائی اعلیٰ وارفع شرف سے نوازا تھا، ارشاد فرمایا تھا:

"میں نے اپنی امت کے لیے اُس بات کو پسند کر لیا جس بات کو ابن مسعود نے میری امت کے لیے پسند کر لیا"۔

(المستدرك للحاكم: كتاب معرفة الصحابة، ذكر مناقب عبد الله بن مسعود رضي الله عنه ج٣ ص ٣٥٩ حديث ٥٣٨٧، ٥٣٨٨)

ایک طرف پندرہ، بیس سال قبل طوعاً (برضا ورغبت) ایمان لانے والے اِن سابقین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال اور طرزِ عمل میں غور فرمایئے کہ جب اُنہیں بروقت کتاب وسنت کی کوئی تصریح نہ ملی اور اُنہوں نے کئی کئی ہفتے غور وخوض کے بعد کوئی مسئلہ بتایا تو ساتھ ہی وضاحت فرما دی کہ خدانخواستہ اگر اُن کا بتایا ہوا مسئلہ خطا ثابت ہوا تو وہ خطا اُن کی اور شیطان کی طرف سے ہوگی، اور دوسری طرف اکیس سال بعد کرہاً اور

مجبوراً اسلام لانے والے بعض طلقاء کے قول اور طرزِ عمل میں غور فرمائیے کہ اُن کے سامنے کھلے بندوں واضح تصریح نبوی ﷺ پیش کی گئی تو اُنہوں نے جھٹ پٹ کہہ دیا: "مَا أَرٰی بِمِثْلِ هٰذَا بَأْسًا" (میں تو اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتا)۔ قارئین کرام بتائیں! کیا طلقاء لوگ سیدنا ابوبکر، عمر اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بڑے مجتہد تھے؟ اور کیا نص کے مقابلے میں اجتہاد کی دال گلتی ہے؟ اگر نہیں تو بولیے کتاب وسنت پر اِس جرأت وتقدیم کو کیا کہا جائے؟ ماوشما کیا کہہ سکتے ہیں جب خود اللہ تعالیٰ نے ایسی جرأت کو مطلقاً کتاب وسنت پر تقدیم فرمایا ہے، جیسا کہ ہم سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ﴿لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ کی تفسیر میں نقل کر چکے ہیں، اور علامہ ابن تیمیہ نے کتاب وسنت پر رائے اور خواہش کو مقدم کرنے پر جو حکم لگایا ہے وہ آپ پڑھ ہی چکے ہیں۔ نیز سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ایسی جرأت اور خواہش کو ملتِ معاویہ کا نام بھی دیا تھا۔ چنانچہ علامہ ابن بطہ حنبلی اپنی سند کے ساتھ لکھتے ہیں:

قَالَ رَجُلٌ لِابْنِ عَبَّاسٍ: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ جَعَلَ هَوَانَا عَلٰى هَوَاكُمْ، فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: اَلْهَوٰى كُلُّه ضَلَالَةٌ، قَالَ: فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: قَالَ لِيْ مُعَاوِيَةُ: أَعَلٰى مِلَّةِ ابْنِ أَبِيْ طَالِبٍ أَنْتَ؟ قُلْتُ: وَلَا عَلٰى مِلَّتِكَ، أَوْ قَالَ: وَلَا عَلٰى مِلَّةِ عُثْمَانَ، أَنَا عَلٰى مِلَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ.

"ایک شخص نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے عرض کیا: اُس اللہ تعالیٰ کے لیے تمام تر حمد ہے جس نے ہماری خواہش کو آپ کی خواہش کے مطابق کر دیا ہے۔ اِس پر سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: خواہش کی پیروی سراسر گمراہی ہے۔ راوی فرماتے ہیں: پھر ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مجھے معاویہ نے کہا تھا: کیا تم ابن ابی طالب کی ملت پر ہو؟ میں نے کہا تھا: نہیں، اور نہ ہی میں تیری ملت پر ہوں، یا فرمایا: اور نہ ہی میں ملتِ عثمان رضی اللہ عنہ پر ہوں، میں تو رسول اللہ ﷺ کی ملت پر ہوں"۔

(الإبانة للعكبري الحنبلي: باب ما أمر به من التمسك بالسنة والجماعة والأخذ بها وفضل من لزمها، ج۲ ص ۳۵۵ حديث ۲۳۸)

اِس مکمل تفصیل سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ موصوف کے سینے میں سیدنا علی ؓ کے خلاف غِلّ کینہ کیوں تھا؟ اِس لیے کہ سیدنا علی علیہ السلام بھی ملتِ عثمانی پر نہیں بلکہ ملّتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مستقیم تھے جبکہ موصوف کے بارے میں آپ جان چکے ہیں کہ اُن کی زبان پر ملتِ علی اور ملتِ عثمان کا ذکر الگ الگ جاری ہو گیا تھا اور زبان پر بلا جبر و اکراہ وہی کچھ جاری ہوتا ہے جو سینے سے آتا ہے۔ کُلُّ اِنَاءٍ یَّنْضَحُ بِمَا فِیْهِ.

بعض حکماء سے سوال

جن بعض نام نہاد حکماء امت نے معاویہ کے خلاف سیدنا علی ؓ کے مبارک سینہ میں کینہ کی نسبت کی ہے اور سیدنا علی ؓ کے خلاف معاویہ کے سینہ میں کینہ کی بات لکھی ہے، کیا وہ یہ سادہ سی وضاحت کرنا پسند فرمائیں گے کہ سینۂ مرتضوی میں اگر معاویہ کے خلاف کینہ تھا تو اُس کا سبب کیا تھا اور سینۂ معاویہ میں جو ذاتِ مرتضٰی کے خلاف کینہ تھا تو اُس کا سبب کیا تھا؟

ہمارا نظریہ ہی نہیں بلکہ ایمان ہے کہ سیدنا علی ؓ کے مبارک سینہ میں کسی کے بارے میں بھی کوئی کینہ نہیں تھا، بلکہ کسی کے ساتھ اُن کی محبت اور کسی کے ساتھ اُن کا بُغض محض رضائے الٰہی کی خاطر ہوتا تھا، اور معاویہ کے خلاف بھی اُن کا بُغض اللہ عزوجل کی خاطر تھا۔ جن لوگوں نے لکھا ہے کہ معاویہ کے سینہ میں سیدنا علی ؓ کے لیے کینہ تھا، کیا وہ یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ اُس کا کینہ بھی محض اللہ عزوجل کی خاطر تھا؟

خلاصہ یہ ہے کہ صلح امام حسن و معاویہ میں جو لفظ ''هُدْنَةٌ عَلٰى دَخَنٍ'' (ناگواری کے باوجود صلح) آیا ہے، وہ ناگواری امام حسن مجتبٰی علیہ السلام کے قلبِ اقدس میں معاویہ کے خلاف دینی لحاظ سے تھی، یعنی معاویہ بن ابی سفیان دینی لحاظ سے امام پاک کو پسند نہیں تھا، باقی رہی یہ بات کہ معاویہ کو امام پاک کیوں ناگوار تھے؟ اس کی تفصیل نیچے ملاحظہ فرمائیں۔

معاویہ کو امام پاک کیوں ناپسند تھے؟

''هُدْنَةٌ عَلٰى دَخَنٍ'' (ناگواری کے باوجود صلح) کی روشنی میں جب آپ جان چکے ہیں کہ امام حسن مجتبٰی علیہ السلام کو معاویہ کیوں ناپسند تھے تو یہ بھی جان لیجئے کہ معاویہ کو امام حسن مجتبٰی علیہ السلام کیوں ناپسند تھے؟

یادرکھنا چاہیے کہ امام پاک کو دنیوی لحاظ سے ناگوار سمجھا گیا تھا، اس لیے کہ ابن ہند اقتدار کے دلدادہ تھے، اُنہوں نے سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ کے ساتھ بھی محض بقائے اقتدار کی خاطر جنگ کی تھی اور قصاصِ عثمان ﷺ کا بہانہ بنایا تھا بلکہ وہ تو یہ بھی چاہتے تھے کہ حضرت عثمان ﷺ قتل ہو جائیں، جیسا کہ ہم خود اُن کے رشتہ دار عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح کی گواہی نقل کر چکے ہیں۔ سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ بھی معاویہ بن ابی سفیان کے بارے میں یہی فرماتے تھے اور سیدنا عمار بن یاسر ﷺ نے تو خود میدانِ صفین میں جو تقریر فرمائی تھی اُس میں صاف صاف فرمایا تھا کہ ان کا نعرۂ قصاص محض بہانہ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اُن کو اقتدار کا چسکا پڑ چکا ہے۔ چنانچہ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما نے دورانِ خطاب فرمایا:

فَخَدَعُوا أَتْبَاعَهُمْ بِقَوْلِهِمْ: "إِمَامُنَا قُتِلَ مَظْلُومًا" لِيَكُونُوا بِذٰلِكَ جَبَابِرَةً مُلُوكًا، وَتِلْكَ مَكِيدَةٌ بَلَغُوا بِهَا مَا تَرَوْنَ، وَلَوْلَا هِيَ مَا تَبِعَهُمْ مِنَ النَّاسِ رَجُلَانِ.

''سوانہوں نے اپنے پیروکاروں کو اپنے نعرے "إِمَامُنَا قُتِلَ مَظْلُومًا" (ہمارا امام ظلماً مارا گیا ہے) سے دھوکہ دے رکھا ہے، تاکہ وہ اِس بہانے سے جابر بادشاہ بن جائیں اور یہ ان کی چال ہے، اسی چال سے یہ یہاں پہنچے ہیں جہاں تم اِنہیں دیکھ رہے ہو، اگر یہ نعرہ نہ ہوتا تو لوگوں میں سے دو شخص بھی ان کی پیروی نہ کرتے''۔

(البداية والنهاية (قطر) ج۷ ص ۴۵۵، وط: بتحقيق عبد المحسن التركي ج ۱۰ ص ۵۲۷)

تنبیہ

خیال رہے کہ اِس تاریخی روایت میں ایک راوی ابو مخنف لوط بن یحییٰ ہیں۔ محدثین اِس کو غیر ثقہ، تالف، ضعیف اور اخباری کہتے ہیں لیکن تاریخ میں اِس کو امام مانا گیا ہے۔ چنانچہ حافظ ابن کثیر جیسا شخص لکھتا ہے:

ذَكَرَ ابْنُ جَرِيرٍ، عَنْ أَبِي مِخْنَفٍ - لُوطُ بْنُ يَحْيىٰ - وَهُوَ أَحَدُ أَئِمَّةِ هٰذَا الشَّأْنِ.

''امام ابن جریر نے ابو مخنف لوط بن یحییٰ سے نقل کیا ہے اور وہ اِس شان کے ائمہ میں سے تھے''۔

(البداية والنهاية ج ١٠ ص ٦٤٦)

دوسرے مقام پر حافظ موصوف نے سیدنا امام عالی مقام علیہ السلام کی شہادت کا واقعہ بیان کرنے سے قبل یوں عنوان قائم کیا ہے:

وَهٰذِهِ صِفَةُ مَقْتَلِهِ ﷺ مَأْخُوذَةٌ مِنْ كَلَامِ أَئِمَّةِ هٰذَا الشَّأْنِ ،لَا كَمَا يَزْعَمُهُ أَهْلُ التَّشَيُّعِ مِنَ الْكَذِبِ الصَّرِيحِ وَالْبُهْتَانِ.

''اور یہ اُن کے واقعۂ شہادت کا بیان ہے جو اِس شان کے ائمہ کے کلام سے ماخوذ ہے، نہ کہ صریح بہتان بازوں اور جھوٹے اہل تشیع سے''۔

اور اِس کے معاً بعد لکھا ہے:

قَالَ أَبُوْمِخْنَفٍ.

''ابو مخنف بیان کرتے ہیں''۔

(البداية والنهاية ج ١١ ص ٥٢١)

غور فرمایئے کہ پہلے کہا کہ صریح جھوٹے اور بہتان باز شیعوں سے روایت نہیں کریں گے پھر فوری کہا: ''**قَالَ أَبُوْمِخْنَفٍ**'' تو اِس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حافظ ابن کثیر کے نزدیک ابو مخنف شیعہ اور جھوٹا نہیں ہے، لیکن دوسرے مقامات پر حافظ ابن کثیر نے اُنہیں شیعی لکھا بھی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک وہ شیعۂ اُولیٰ میں سے ہوں گے، تاہم حافظ ابن کثیر کی یہ عادت بھی تھی کہ جہاں کوئی بات اُن کی پسند کے مطابق نہیں ہوتی تھی تو وہاں وہ سارا زور جرح پر لگاتے تھے اور تعدیل کو یکسر نظر انداز کر دیتے تھے۔ اس کی بعض مثالیں ہم نے ''**شرح كتاب الأربعين في فضائل آل البيت الطاهرين**'' میں قلم بند کی ہیں، اگر آپ چاہیں تو امہات المومنین کے مفاضلہ کی بحث میں دیکھ سکتے ہیں۔ الغرض ابو مخنف سے کوئی مؤرخ ومصنف بے نیاز نہیں رہ سکتا، خواہ وہ ابن جریر ہو، ابن اثیر ہو، ابن کثیر ہو یا کوئی لکیر کا فقیر ہو۔ یہ الگ بات

ہے کہ بعض لوگ ''میٹھا ہپ ہپ اور کڑوا تھو تھو'' والا معاملہ بھی کرتے ہیں۔

ابو مخنف لوط بن یحییٰ کے بارے میں بعض یمنی علماء اہل سنت نے زبردست بات کہی ہے، انہوں نے فرمایا ہے کہ ابو مخنف پر یوں بے دردی سے جرح کی گئی ہے جس طرح امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ پر کی گئی ہے، تو کیا ایسے اکابر محدثین کی جرح امام اعظم رضی اللہ عنہ کے خلاف آنکھیں بند کر کے قبول کر لی جائے؟ انہوں نے فرمایا: ابو مخنف کوئی کذاب یا وضاع شخص نہیں تھا لیکن اُس کا جرم یہ تھا کہ وہ محبِّ اہل بیت تھا۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے معاویہ وابن العاص

جس طرح بعض طلقاء کی خواہش تھی کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ قتل ہو جائیں اور پھر اُن کی یہ خواہش پوری بھی ہوئی اور اُنہوں نے اِس سے فائدہ بھی اُٹھایا، یعنی قصاص کا بہانہ بنا کر عوام کی حمایت حاصل کی۔ چنانچہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ مشہور و متواتر حدیث ''اَلفِئَۃُ البَاغِیَۃُ''، جس کو ہم پہلے بھی نقل کر چکے ہیں، کی مدلل و مفصل تشریح کا نتیجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''پس اس سے ظاہر ہوا کہ وہ باطن میں باغی تھے اور ظاہر میں قصاصِ عثمان (رضی اللہ عنہ) کی آڑ لینے والے تھے۔ پس یہ حدیث ان پر طعن کرنے والی ہے اور ان کی اتباع سے روکنے والی ہے، لیکن وہی ہو کر رہا جو تقدیر میں لکھا تھا، پس ان کے ہاں جو کچھ قرآن وحدیث میں مرقوم تھا سب متروک ہو گیا''۔

(مرقاۃ شرح مشکاۃ ج ۱۰ ص ۲۰۱، وط: ج ۱۱ ص ۱۸)

اسی طرح دنیا کے دلدادہ اُن کے بعض ساتھیوں کی بھی ایسی ہی خواہش تھی، وہ چاہتے تھے کہ جنگِ جمل میں ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا کام بھی تمام ہو جاتا تو اُن کے لیے معاملہ مزید آسان ہو جاتا۔ چنانچہ امام ابن المبرد رحمۃ اللہ علیہ متوفّٰی ۲۸۵ھ لکھتے ہیں:

> وَقَالَ عَمْرٌو لِعَائِشَۃَ رَحِمَھَا اللّٰہُ : لَوَدِدْتُّ أَنَّکِ قُتِلْتِ یَوْمَ الْجَمَلِ ، فَقَالَتْ لِمَ لَا أَبَا لَکَ ؟ قَالَ: کُنْتِ تَمُوْتِیْنَ بِأَجَلِکِ وَتَدْخُلِیْنَ الْجَنَّۃَ ، وَنَجْعَلُکِ أَکْبَرَ التَّشْنِیْعِ عَلٰی عَلِیٍّ.

''عمرو بن العاص نے سیدہ عائشہ رحمہا اللہ سے کہا: میری بڑی خواہش تھی کہ آپ جمل کے دن قتل کردی جاتیں۔ اُنہوں نے فرمایا: تیرا کوئی باپ نہ ہو، کیوں؟ اُس نے کہا: آپ تو اپنے وقت پر ہی وفات پاتیں اور جنت کو سدھار جاتیں اور ہم آپ کی شہادت کو علی بن ابی طالب کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کا بڑا بہانہ بنالیتے''۔

(الکامل فی اللغة والأدب ج۱ ص ۳۲۹)

قتل وقصاص سے مطلوب تک رسائی

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اِن دونوں ساتھیوں کی ایسی خواہش کیوں تھی؟ اِس کی حکمت تو خود عمرو بن العاص کے الفاظ میں ہی آگئی ہے تاہم یہاں اِس پہلو پر مزید روشنی ڈالنا بھی مناسب ہے۔ کتاب وسنت سے ثابت ہے کہ حصولِ مطلب کی خاطر دوسرے انسان کا قتل اتنا ہی قدیم ہے جتنا انسان خود قدیم ہے۔ کبھی کسی قتل سے انسان کو اُس کا مطلوب فوراً مل جاتا ہے کہ جونہی مدمقابل قتل ہوجاتا ہے تو اُس کا منصب، جگہ یا اُس کی چیز قاتل کو مل جاتی ہے بشرطیکہ قاتل قتل کو چھپانے میں کامیاب رہے اور فوری طور پر اُس کا قتل کرنا یا قتل کرانا ظاہر نہ ہو تو اُسے قتل کرنے کا فائدہ مل جاتا ہے، جیسا کہ قاتلینِ یوسف علیہ السلام کو وقتی فائدہ حاصل ہوا تھا۔ یاد رہے کہ وہ اُنہیں کنویں میں پھینک کر اپنے طور پر اُن کا کام تمام کرچکے تھے، اسی لیے تو اُنہوں نے کہا تھا کہ اُنہیں بھیڑیا کھا گیا ہے۔

کبھی جنسی لذت کے حصول کی خاطر بھی قتل ہوتا ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے کہ انسان کا پہلا قتل عورت کی وجہ سے ہوا۔ (المائدۃ: ۲۷، ۳۰)

کبھی کسی قتل سے مقصد فوراً ہاتھ نہیں آتا مگر قاتل حصولِ اقتدار یا بقائے اقتدار کی خاطر جن لوگوں کو اپنے لیے خطرہ محسوس کرتا ہے اُنہیں قتل کرتا یا کراتا چلا جاتا ہے، جیسا کہ قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر فرعون کے بارے میں مذکور ہے۔ ہمارے ملک میں بھی بعض اشخاص نے ایک ہی خاندان کے کئی افراد کو یکے بعد دیگرے قتل کرا کر اپنے لیے اقتدار کا راستہ صاف کیا اور بالآخر اپنے مطلوب کو پالیا۔

مجھے یاد ہے کہ ایک اینکر نے مشہور قانون دان احمد رضا قصوری صاحب سے دریافت کیا: قصوری

صاحب! آپ کیا سمجھتے ہیں کہ فلاں انسان کا قاتل کون ہے؟ اُنہوں نے کہا: قتل کی تین وجوہ ہوتی ہیں: زن، زراورزمین۔ قتل کے بعد غور کرو کہ مقتول کی چیز پر کون قابض ہے؟ پھر کہا: یہاں زراورزمین نہیں بلکہ اقتدار ہے، لہٰذا مقتول کی بدولت جو اقتدار کو پہنچا قتل کا کُھر ابھی اُسی کی طرف جائے گا۔

قصوری صاحب نے پتے کی بات کی ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ جب کسی عزیز کا قتل زراورزمین کی خاطر ہو تو اکثر قاتل ہی مدعی بن جاتا ہے، جیسا کہ سورۃ البقرۃ میں مذکور ہے کہ قاتل ہی مدعی بن گیا تھا۔ کچھ ایسی ہی صورت سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل پر ہوئی کہ جو لوگ چاہتے تھے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ قتل ہو جائیں وہی مدعی اور طالبین قصاص بن گئے تھے، جیسا کہ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح، سیدنا عمار بن یاسر اور ملا علی قاری رحمہ اللہ کے اقوال آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔

وہی قاتل وہی نوحہ خواں

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے جس بندے نے قتل کیا یا کرایا ہوتا ہے واویلا اور نوحہ بھی وہی زیادہ کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے کہ برادرانِ یوسف علیہ السلام نے عمداً اپنے بھائی کو موت کے گھاٹ اُتارنے کی خاطر کنویں میں ڈال دیا اور شام کو روتے ہوئے آئے اور اپنے بابا کو کہا: اُسے بھیڑیا کھا گیا ہے، حالانکہ یہ سراسر جھوٹ تھا۔ ارشادِ الٰہی ہے:

وَجَآءُوْا أَبَاهُمْ عِشَآءً يَّبْكُوْنَ. قَالُوْا يَا أَبَانَا إِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَأَكَلَهُ الذِّئْبُ وَمَا أَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صَادِقِيْنَ.

”اور وہ آئے اپنے بابا کے پاس عشاء کے وقت گریہ زاری کرتے ہوئے۔ (آکر) کہا: باوا جی! ہم ذرا گئے کہ دوڑ لگائیں اور ہم چھوڑ گئے یوسف کو اپنے سامان کے پاس تو کھا گیا اُس کو بھیڑیا، اور آپ نہیں مانیں گے ہماری بات اگرچہ ہم سچے ہیں“۔

(یوسف: ۱۶، ۱۷)

غور کیجئے کہ خود ہی قاتل اور خود ہی گریہ کناں کی اِس سے زیادہ سچی مثال اور کیا ہو سکتی ہے؟ اور یہ بھی سوچئے کہ کتابِ محکم میں اللہ تعالیٰ نے ایسے واقعات آخر کیوں بیان فرمائے؟ فقط اِس لیے کہ اگر امت

مسلمہ میں بھی کبھی کوئی ایسی سازش کی جائے تو اُمت کے دانا لوگ اُس سازش کو قرآن مجید کی روشنی میں فوراً سمجھ جائیں، یہی وجہ ہے کہ اِس سورت کی آخری آیت میں احمقوں کے لیے نہیں بلکہ فقط عقل مندوں کے لیے فرمایا گیا ہے:

لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ.

''بے شک اُن کی خبروں سے عقل مندوں کی آنکھیں کھلتی ہیں''۔

(یوسف علیہ السلام: ۱۱۱)

فی الجملہ یہ کہ جن لوگوں نے خلیفۂ ثالث رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد اُن کی خون آلود قمیص اُٹھا کر رونا دھونا شروع کر دیا تھا وہ اسی طرح جھوٹے تھے جس طرح سیدنا یوسف علیہ السلام کو اپنے ہاتھوں سے کنویں میں پھینک کر خون آلود قمیص اُٹھا کر رونے والے برادرانِ یوسف جھوٹے تھے۔ فرق یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کے خواہاں اُن کے چچازاد تھے اور سیدنا یوسف علیہ السلام کے قاتلین اُن کے باپ زاد تھے۔ اندازہ تو کیجیے کہ جو لوگ اپنے ہاتھوں سے کنویں میں پھینک کر اُن کا کام تمام کر کے آئے تھے وہی خون آلود قمیص دکھا کر کہتے تھے کہ قاتل ہم نہیں بلکہ بھیڑیا ہے اور اُلٹا یہ بھی کہتے تھے کہ ہم ہیں تو سچے لیکن ہمیں سچا مانا نہیں جائے گا۔ یعنی خود ہی قاتل، خود ہی گریہ کناں، خود ہی مدعی اور خود ہی پیکر صدق وصفا۔ شاید ایسے ہی موقع کے لیے کسی دل جلے نے کہا ہے۔

وہی قاتل، وہی شاہد، وہی منصِف ٹھہرے
اقرباء میرے کریں خون کا دعویٰ کس پر؟

امام حسن کے لیے بعض سینوں کے کینے کی تصریح

مذکور الصدر تصریحات کی روشنی میں معلوم ہوا کہ چونکہ اہل بیت کرام علیہم السلام کی بے پناہ مقبولیت کی وجہ سے اُن لوگوں میں مقابلہ کی سکت نہیں تھی اس لیے اُنہوں نے ایسے حربے استعمال کر کے عوام کی ہمدردی حاصل کی۔ پھر اسی طرح وہ مولا علی رضی اللہ عنہ کے بعد امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی مقبولیت سے بھی خوف زدہ تھے، اور یہی بات اُن کی قلبی کدورت کا باعث تھی، حتیٰ کہ جب کڑی شرائط کے تحت صلح ہوئی تو اُن کی

کدورت مزید بڑھ گئی، اور وہ کدورت اُس وقت عیاں ہوگئی جب سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کو زہر دے کر شہید کر دیا گیا۔ چنانچہ امام ابوداود اپنی سند کے ساتھ لکھتے ہیں:

''خالد بیان کرتے ہیں: حضرت مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ، عمرو بن اسود اور اہل قنسرین سے بنو اسد کا ایک شخص معاویہ کے پاس آئے۔ معاویہ نے حضرت مقدام رضی اللہ عنہ سے کہا:

أَعَلِمْتَ أَنَّ الْحَسَنَ بْنَ عَلِيٍّ تُوُفِّيَ ؟ فَرَجَّعَ الْمِقْدَامُ ، فَقَالَ لَهُ رَجُلٌ: أَتَرَاهَا مُصِيبَةً ؟ قَالَ لَهُ: وَلِمَ لَا أَرَاهَا مُصِيبَةً وَقَدْ وَضَعَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِيْ حِجْرِهٖ، فَقَالَ: هٰذَا مِنِّيْ وَحُسَيْنٌ مِنْ عَلِيٍّ ؟ فَقَالَ الْأَسَدِيُّ: جَمْرَةٌ أَطْفَأَهَا اللّٰهُ عزوجل، قَالَ: فَقَالَ الْمِقْدَامُ : أَمَا أَنَا ، فَلَا أَبْرَحُ الْيَوْمَ حَتّٰى أُغِيْظَكَ وَأُسْمِعَكَ مَا تَكْرَهُ ، ثُمَّ قَالَ: يَا مُعَاوِيَةُ ! إِنْ أَنَا صَدَقْتُ فَصَدِّقْنِيْ ، وَإِنْ أَنَا كَذَبْتُ فَكَذِّبْنِيْ ، قَالَ: أَفْعَلُ:

قَالَ: فَأُنْشِدُكَ بِاللّٰهِ ، هَلْ سَمِعْتَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَنْهٰى عَنْ لُبْسِ الذَّهَبِ؟ قَالَ: نَعَمْ.

قَالَ : فَأُنْشِدُكَ بِاللّٰهِ ، هَلْ تَعْلَمُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰى عَنْ لُبْسِ الْحَرِيْرِ؟ قَالَ: نَعَمْ .

قَالَ : فَأُنْشِدُكَ بِاللّٰهِ ، هَلْ تَعْلَمُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰى عَنْ جُلُوْدِ السِّبَاعِ وَالرُّكُوْبِ عَلَيْهَا؟ قَالَ: نَعَمْ.

قَالَ : فَوَ اللّٰهِ لَقَدْ رَأَيْتُ هٰذَا كُلَّهُ فِيْ بَيْتِكَ يَا مُعَاوِيَةُ ! فَقَالَ مُعَاوِيَةُ: قَدْ عَلِمْتُ أَنِّيْ لَنْ أَنْجُوَ مِنْكَ يَا مِقْدَامُ، قَالَ خَالِدٌ: فَأَمَرَ لَهُ مُعَاوِيَةُ بِمَا لَمْ يَأْمُرْ لِصَاحِبَيْهِ، وَفَرَضَ لِابْنِهٖ فِي الْمِئَتَيْنِ ، فَفَرَّقَهَا الْمِقْدَامُ عَلٰى أَصْحَابِهٖ ، وَلَمْ يُعْطِ الْأَسَدِيُّ أَحَدًا شَيْئًا مِمَّا أَخَذَ ، فَبَلَغَ ذٰلِكَ مُعَاوِيَةَ ، فَقَالَ: أَمَّا

الْمِقْدَامُ فَرَجُلٌ كَرِيمٌ بَسَطَ يَدَهُ، وَأَمَّا الْأَسَدِيُّ فَرَجُلٌ حَسَنُ الْإِمْسَاكِ لِشَيْئِهِ.

''کیاتم جانتے ہو کہ حسن بن علی وفات پا گئے؟ اس پر حضرت مقدام رضی اللہ عنہ نے إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ کہا، اس پر کسی شخص نے اُنہیں کہا: کیا تم اس کو مصیبت سمجھتے ہو؟ اُنہوں نے اُس کو فرمایا: میں اس بات کو کیوں نہ مصیبت سمجھوں جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُنہیں اپنی گود میں بٹھا کر فرمایا تھا: یہ مجھ سے ہے اور حسین علی سے ہے۔ اس پر اسدی نے کہا: وہ ایک انگارہ تھا جسے اللہ عزوجل نے بجھا دیا۔ خالد کہتے ہیں: اس پر مقدام رضی اللہ عنہ نے معاویہ کو کہا: آج میں تم کو اُس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک کہ تمہیں غصہ نہ دلاؤں اور وہ کچھ نہ سناؤں جو تمہیں ناگوار ہو۔ پھر فرمایا: اے معاویہ! میں بات شروع کرتا ہوں، اگر میں سچ کہوں تو میری تصدیق کرنا اور اگر میں جھوٹ بولوں تو میری تردید کر دینا۔ معاویہ نے کہا: میں ایسا ہی کروں گا۔

حضرت مقدام رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں تمہیں اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں: کیا تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سونا پہننے کی ممانعت سنی تھی؟ اُنہوں نے کہا: ہاں۔

حضرت مقدام رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں تمہیں اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں: کیا تم جانتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ریشم پہننے سے منع فرمایا؟ اُنہوں نے کہا: ہاں۔

حضرت مقدام رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں تمہیں اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں: کیا تم جانتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے درندوں کی کھال کو پہننے اور اُس پر بیٹھنے سے منع فرمایا تھا؟ اُنہوں نے کہا: ہاں۔

اس پر حضرت مقدام رضی اللہ عنہ نے فرمایا: خدا کی قسم، اے معاویہ! میں یہ سب کچھ تمہارے گھر میں دیکھتا ہوں۔ اس پر معاویہ نے کہا: اے مقدام! مجھے معلوم ہے، آج میں تم سے جان نہیں چھڑا سکتا۔ خالد کہتے ہیں: اس کے بعد معاویہ نے سیدنا مقدام رضی اللہ عنہ

کے لیے اتنے مال کا حکم دیا کہ اتنا اُن کے دوسرے ساتھیوں کے لیے نہ دیا اور اُن کے بیٹے کا وظیفہ دوسو دینار والے لوگوں کے برابر کر دیا۔ پس سیدنا مقدام ﷺ نے وہ سب کچھ اپنے ساتھیوں میں تقسیم کر دیا۔ خالد کہتے ہیں: اسدی کو جو ملا تھا وہ اس نے کسی کو نہ دیا۔ یہ خبر معاویہ کو پہنچی تو اُنہوں نے کہا: مقدام ایک کریم شخص ہیں اُنہوں نے اپنے ہاتھ کھول دیے، رہا اسدی تو وہ اپنی چیز کو اچھے طریقے سے سنبھالنے والا ہے''۔

(سنن أبي داود بتحقيق الألباني: كتاب اللباس، باب في جلود النمور والسباع، ص۷۳۸ حديث ۴۱۳۱)

حدیث مقدام بن معد یکرب کی تحقیق

اِس حدیث میں چار راوی ہیں اور چاروں حمصی ہیں:

۱۔ عمرو بن عثمان بن سعید ابو حفص

۲۔ بقیہ بن ولید بن صائد ابو یُحمد

۳۔ بحیر بن سعید ابو خالد السحولی

۴۔ خالد بن معدان بن ابی یکرب ابو عبداللہ الکلاعی۔

اِن چاروں راویوں میں سے فقط ثانی الذکر راوی کمزور ہیں، ان کے بارے میں جرح وتعدیل کے دونوں اقوال ملتے ہیں اور ان کی جرح میں سب سے سخت قول ان کے مدلس ہونے کا ہے، لیکن ساتھ ہی کہا گیا ہے کہ جب یہ ثقہ اور معروف رجال سے روایت کریں تو پھر ان کی روایت کو قبول کرو۔ چنانچہ عبداللہ بن احمد بن حنبل بیان کرتے ہیں:

سُئِلَ أَبِي عَنْ بَقِيَّةَ وَ إِسْمَاعِيلَ فَقَالَ: بَقِيَّةُ أَحَبُّ إِلَيَّ، وَإِذَا حَدَّثَ عَنْ قَوْمٍ لَيْسُوا بِمَعْرُوفِيْنَ فَلَا تَقْبَلُوْهُ.

''میرے بابا سے بقیہ بن ولید اور اسماعیل بن عیاش کے متعلق دریافت کیا گیا تو اُنہوں نے فرمایا: بقیہ مجھے زیادہ پسند ہے اور جب وہ ایسی قوم سے حدیث نقل کرے

جو معروف نہ ہو تو پھر اُسے قبول نہ کرو۔

یعقوب، ابن سعد، عجلی، ابوزرعہ اور ابن المبارک سے بھی ان کے بارے میں اسی طرح منقول ہے''۔

(تهذيب التهذيب ملخصًا ج١ ص٤٤٥، ٤٤٦)

امام نسائی فرماتے ہیں:

إِذَا قَالَ: حَدَّثَنَا أَوْ أَخْبَرَنَا فَهُوَ ثِقَةٌ.

''جب وہ ''حَدَّثَنَا'' یا ''أَخْبَرَنَا'' کہے تو وہ ثقہ ہے''۔

ابن عدی فرماتے ہیں:

وَإِذَا رَوٰى عَنْ أَهْلِ الشَّامِ فَهُوَ ثَبْتٌ.

''اور جب وہ اہل شام سے روایت کرے تو ثبت ہے''۔

(تهذيب التهذيب ج١ ص٤٤٦)

امام سخاوی لفظ ''ثَبْتٌ'' کی توضیح میں لکھتے ہیں:

''ب کی جزم سے ''ثَبْتٌ'' کا معنیٰ ہے: دل، زبان، کتاب اور حجت میں ثابت''۔

(فتح المغيث ج٢ ص٢٧٩)

قدیم محدثین کرام سے بقیہ بن ولید کے بارے میں یہ تین اصولی باتیں منقول ہیں اور ہم نے جو حدیث لکھی ہے اُس میں یہ تینوں باتیں موجود ہیں:

۱۔ بقیہ بن ولید جن راویوں سے نقل کر رہا ہے وہ سارے کے سارے معروف ہیں۔

۲۔ اِس حدیث کو بقیہ نے ''حَدَّثَنِي'' کے الفاظ سے روایت کیا ہے، جیسا کہ مسند احمد کی سند میں یہ الفاظ موجود ہیں۔

۳۔ امام ابن عدی نے فرمایا کہ جب یہ اہل شام سے روایت کرے تو پھر یہ ثابت القلب واللسان ہے، اور لطف کی بات یہ ہے کہ بشمول اِس کے اِس حدیث کے تمام راوی حمصی اور شامی ہیں، اہل حمص وشام

سب تو نہیں لیکن اُن کی اکثریت بغض اہل بیت میں ملوث تھی لیکن قدیر و حکیم ذات جل جلالہ جن سے چاہتی ہے سچ اُگلوا دیتی ہے۔

سو چونکہ یہ ساری باتیں اِس حدیث کی سند میں جمع ہوگئی ہیں اسی لیے علامہ ناصر الدین البانی نے اِس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ شیخ احمد شاکر نے کہا ہے: "**إسناده صحيح**" (اس کی سند صحیح ہے)، امام ذہبی نے لکھا ہے: "**إسناده قوي**" (اس کی سند قوی ہے)

بعض لوگوں سے اس کی سند کو ضعیف قرار دینے میں غلطی ہوگئی، شاید اِس لیے کہ اُن کی نظر بقیہ بن ولید کے مدلس ہونے پر اور بعض اقوال کے مطابق "**تدليس التسوية**" میں ملوث ہونے پر رُک گئی لیکن اُنہوں نے یہ غور نہیں کیا کہ اِس حدیث کی سند میں ایسی کوئی علت نہیں پائی جاتی۔ جن حضرات کی توجہ بالخصوص اِس حدیث کی سند پر مرکوز ہوگئی تو اُنہوں نے اس کی سند کو صحیح اور قوی مان لیا اور جن کو بقیہ بن ولید کا فقط مدلس ہونا ہی یاد رہا تو اُنہوں نے اِس کی سند کو ضعیف قرار دے دیا جو کہ زیادتی ہے۔ اعتدال وانصاف کی بات یہ ہے کہ چونکہ یہ حدیث بقیہ بن ولید نے معروف اور ثقہ رجال سے روایت کی اور اِس میں اُنہوں نے "**حَدَّثَنِي**" کے الفاظ کی بھی صراحت کی ہے اس لیے اِس حدیث کو صحیح مانا جائے جیسا کہ شیخ احمد شاکر اور علامہ البانی نے صحیح مانا ہے اور علامہ ذہبی نے اس کی سند کو قوی مانا ہے، لیکن تعجب ہے کہ دورِ حاضر میں بعض لوگوں نے اِس معتدل طرزِ عمل سے ہٹ کر اِس حدیث کی سند پر بہت ہی سخت جرح کر دی ہے اور تعدیل کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ ایسے لوگوں سے ہماری گزارش ہے کہ وہ ایسے غیر معتدل انداز سے گریز فرمائیں ورنہ ایسے تعنت بھرے انداز سے بریلویت کا بالعموم اور بعض تنظیموں کا بالخصوص کلھ ہی نہیں بچے گا۔ شاید وہ یہ تصور کرتے ہیں کہ تعدیل کو نظر انداز کر کے صرف تجریح کی چھانٹی لگانا فقط اُن کو آتا ہے اور کسی کو نہیں آتا؟

"أَتَرَاهَا مُصِيبَةً؟" کا قائل کون؟

سنن ابی داود کے متن میں کچھ مخفی رکھنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن حقیقت پھر بھی مخفی نہیں رہ سکی۔ سنن ابی داود میں ہے: "**قَالَ لَهُ رَجُلٌ أَتَرَاهَا مُصِيبَةً؟**" (کسی شخص نے کہا: کیا آپ اسے مصیبت سمجھتے ہیں؟) پھر ایک اسدی شخص نے کہا: "**جَمْرَةٌ أَطْفَأَهَا اللهُ** عزوجل" (وہ ایک انگارہ تھا جسے اللہ عزوجل نے بجھا دیا) سوال

یہ ہے کہ اگر یہ دونوں غیر شرعی، غیر اخلاقی اور بغض بھری باتیں معاویہ کے علاوہ دوسرے دو شخصوں نے کہیں تو حضرت مقدام ﷺ نے معاویہ کو کھری کھری سنانا کیوں شروع کر دیا؟ دراصل اِن میں سے پہلی بات کے قائل خود معاویہ ہیں، جیسا کہ امام احمد، امام طبرانی، امام ابن عساکر، امام ذہبی اور شمس الحق عظیم آبادی کی نقل کردہ حدیث میں یہ تصریح موجود ہے:

فَقَالَ لَهُ مُعَاوِيَةُ : أَتَرَاهَا مُصِيبَةً؟

''تو معاویہ نے اُنہیں کہا: کیا آپ اس کو مصیبت سمجھتے ہیں؟''۔

(مسند أحمد (بتحقيق أحمد شاكر) ج۱۳ ص ۲۹۵ حديث ۱۷۱۲۳ ،وط: (شعيب) ج۲۸ ص ۴۲٦ حديث ۱۷۱۸۹؛ المعجم الكبير ج۳ ص ۳٤ حديث ۲٦۲۸؛ أخبار الحسن للطبراني ص ٦۸ حديث ۱۰٤؛ تاريخ دمشق ج٦۰ ص ۱۸۷، ۱۸۸؛ سير أعلام النبلاء ج۳ ص ۱۵۸؛ عون المعبود في مجلد واحد ص ۱۸۸٤، وط: ج۱۱ ص ۱۸۹، ۱۹۰)

جبکہ دوسرا قول اسدی شخص نے از خود نہیں کیا بلکہ اُس سے پوچھا گیا تو اُس نے میر محفل کی خواہش کے مطابق جواب دیا، اور میرِ مجلس خود بادشاہ سلامت معاویہ ہی تھے، اُنہوں نے ہی اسدی سے پوچھا:

مَا تَقُولُ أَنْتَ ؟ قَالَ: جَمْرَةٌ أُطْفِئَتْ.

''تم کیا کہتے ہو؟ اُس نے کہا: ایک انگارہ تھا بجھا دیا گیا''۔

(سير أعلام النبلاء ج۳ ص ۱۵۸؛ المعجم الكبير ج۲۰ ص ۲٦۹، حديث ٦۳٦)

البانی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے، شیخ احمد شاکر نے کہا: اس کی سند صحیح ہے اور امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: اس کی سند قوی ہے۔

شہادتِ حسن پر قلب کو اطمینان ہو گیا

امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی زہر سے اچانک شہادت پر معاویہ کی خوشی کا تذکرہ علامہ ابن خلکان اور علامہ دمیری نے بھی کیا ہے، مؤخر الذکر کے الفاظ ہیں:

فَلَمَّا بَلَغَ مُعَاوِيَةَ مَوْتُهُ ، سَمِعَ تَكْبِيرُهُ مِنَ الْخَضْرَاءِ ، فَكَبَّرَ أَهْلُ

الشَّامِ لِذٰلِکَ التَّکْبِیْرِ ، فَقَالَتْ فَاخِتَةُ بِنْتُ قَرَظَةَ لِمُعَاوِیَةَ: أَقَرَّ اللّٰهُ عَیْنَکَ ، مَا الَّذِيْ کَبَّرْتَ لِأَجْلِهٖ ؟ فَقَالَ: مَاتَ الْحَسَنُ، فَقَالَتْ: أَعَلٰی مَوْتِ ابْنِ فَاطِمَةَ تُکَبِّرُ ؟ فَقَالَ: وَاللّٰهِ مَا کَبَّرْتُ شَمَاتَةً بِمَوْتِهٖ ، وَلٰکِنْ اِسْتَرَاحَ قَلْبِيْ.

وَدَخَلَ عَلَیْهِ ابْنُ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُمَا ، فَقَالَ لَهٗ : یَاابْنَ عَبَّاسٍ! هَلْ تَدْرِيْ مَاحَدَثَ فِيْ أَهْلِ بَیْتِکَ ؟ فَقَالَ: لَاأَدْرِيْ مَاحَدَثَ ، إِلَّا أَنِّيْ أَرَاکَ مُسْتَبْشِراً ، وَقَدْ بَلَغَنِيْ تَکْبِیْرُکَ ، فَقَالَ: مَاتَ الْحَسَنُ ، فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ یَرْحَمُ اللّٰهُ أَبَامُحَمَّدٍ، ثَلَاثًا، وَاللّٰهِ یَامُعَاوِیَةُ لَاتَسُدُّ حُفْرَتُهٗ حُفْرَتَکَ ، وَلَایَزِیْدُ عُمْرُهٗ فِيْ عُمْرِکَ ، وَلَئِنْ کُنَّا قَدْ أُصِبْنَا بِالْحَسَنِ ، فَلَقَدْ أُصِبْنَا بِإِمَامِ الْمُتَّقِیْنَ وَخَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ ، فَجَبَرَ اللّٰهُ تِلْکَ الصَّدْعَةَ ، وَسَکَّنَ تِلْکَ الْعَبْرَةَ ، وَکَانَ اللّٰهُ الْخَلَفَ عَلَیْنَا مِنْ بَعْدِهٖ.

''جب معاویہ کواُن کی وفات کی خبر پہنچی تو ایوانِ معاویہ سے تکبیر (اللہ اکبر) کی آواز سنی گئی، اس پر اہل شام نے بھی تکبیر کہی تو فاختہ بنت قرظہ نے معاویہ کو کہا: اللہ آپ کی آنکھوں کو ٹھنڈا رکھے، آپ نے کس بات پر تکبیر کہی ہے؟ معاویہ نے کہا: حسن مر گیا۔ اس پر فاختہ نے کہا: کیا آپ نے فرزندِ فاطمہ کی وفات پر تکبیر کہی ہے؟ معاویہ نے کہا: میں نے اُن کی موت کی خوشی میں تکبیر نہیں کہی لیکن میرے دل کو سکون حاصل ہوا ہے۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما معاویہ کے پاس تشریف لائے تو اُس نے اُن سے کہا: اے ابن عباس! کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے اہل بیت میں کیا سانحہ رونما ہوا؟ اُنہوں نے فرمایا: مجھے نہیں معلوم کہ کیا پیش آیا مگر میں آپ کو خوش دیکھ رہا ہوں اور مجھے آپ کا تکبیر کہنا بھی پہنچ چکا ہے۔ اِس پر معاویہ نے کہا: حسن مر گیا۔ سیدنا ابن

عباس رضی اللہ عنہ نے تین بار فرمایا: اللہ تعالیٰ ابو محمد (امام حسن علیہ السلام) پر رحمت فرمائے۔ اللہ کی قسم اے معاویہ! اُن کی قبر تمہاری قبر کی جگہ کو نہیں بھرے گی اور نہ ہی اُن کی عمر تمہاری عمر میں اضافہ کرے گی۔ اگر ہمیں شہادتِ حسن کی وجہ سے صدمہ پہنچا ہے تو یقیناً ہم امام المتقین خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جدائی کے صدمہ سے بھی دوچار ہو چکے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ نے اُس پریشانی کو زائل کیا اور آنسوؤں کو سکون دیا، اور اللہ تعالیٰ ہی اُن کے بعد ہمارا نگہبان ہے"۔

(حیاةالحیوان ج۱ ص۲۱۲؛وفیات الأعیان ج۲ ص۶۶،۶۷)

عصرِ حاضر کے امام النواصب کے بعض مریدین نے "حیاۃ الحیوان" میں اِس جملہ کا ترجمہ یوں کیا ہے:

فَقَالَ: وَاللّٰهِ مَا كَبَّرْتُ شَمَاتَةً بِمَوْتِهِ ، وَلٰكِنْ اِسْتَرَاحَ قَلْبِيْ.

"حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ فرمانے لگے کہ میں نے اُن کے وفات پانے کی خوشی میں نہیں تکبیر کہی بلکہ اس بناء پر کہی ہے کہ میرے قلب کو اطمینان ہو گیا ہے"۔

(عطار الجنان في ترجمة حیاةالحیوان ج۱ ص۲۰۸)

نواصبِ زمانہ سے سوال ہے کہ قرآن وسنت میں کسی مصیبت پر ترجیع (**اِنَّـالِلّٰهِ وَاِنَّآاِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ**) کہنے کا حکم ہے یا تکبیر (اللہ اکبر) کہنے کا؟ تکبیر خوشی پر ہوتی ہے، چنانچہ قرآن مجید میں روزوں کی تکمیل کے تذکرے میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

لِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَاهَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ.

"تاکہ تم گنتی پوری کر لیا کرو اور اللہ کی بڑائی بیان کیا کرو، اِس پر کہ اُس نے تمہیں ہدایت دی اور تاکہ تم شکر گزاری کیا کرو"۔

(البقرة:۱۸۵)

عیدین کے دنوں میں جو تکبیرات کہی جاتی ہیں وہ عید کی خوشی کے لوٹ آنے پر بطور شکرانہ کہی جاتی

ہیں، جبکہ اسی سورت کی آیت نمبر ۱۵۶ میں ہے کہ مصیبت پر "اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ" کہا جاتا ہے لیکن افسوس کہ جس شخص کے بارے میں یہ احادیث "اَللّٰهُمَّ عَلِّمْ مُعَاوِيَةَ الْكِتَابَ" اور "اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ هَادِيًا مَهْدِيًّا" ذکر کی جاتی ہیں اُس نے عام بندے کے مرجانے پر تو کیا بعینہٖ شکلِ مصطفیٰ ﷺ کے اوجھل ہونے پر تکبیر کہنا شروع کر دیا۔ کیا اسی کو قرآن فہمی کہا جاتا ہے اور کیا اِسی کا نام ہادیت ومہدیت ہے؟ پھر اِس پر زیادتی یہ کہ ایک خاتون نے جب سنجیدگی کے ساتھ اِس گھٹیا حرکت پر اعتراض کیا تو اُسے وہ جواب دیا جو اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ بندہ پوچھے کہ شبیہِ مصطفیٰ، دِل بندِ مرتضیٰ، جگر گوشۂ زہرا سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہم السلام کی اچانک شہادت پر کہنا کہ میں خوش تو نہیں ہوا لیکن "میرے قلب کو اطمینان ہو گیا" کیا کسی پیارے کے اچانک شہید ہو جانے پر قلب مضطرب ہوتا ہے یا مطمئن؟ افسوس ہے کہ اُن کا قلب تو شہادتِ حسن مجتبیٰ پر مضطرب نہ ہوا لیکن جن کا دل مضطرب ہوا موصوف اُن پر بھی معترض ہوئے۔ حضرت مقدام بن معدی کرب رضی اللہ عنہ نے شہادتِ امام حسن کی خبر سن کر کہا "اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ" تو موصوف نے فوراً اُنہیں کہا: کیا تم اِس کو مصیبت سمجھتے ہو؟

ذرا شانِ مجتہدانہ میں غور تو کیجئے کہ فاختہ بنت قرظہ نے جب حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا: "کیا آپ نے فرزندِ فاطمہ کی وفات پر تکبیر کہی؟" تو اُسے کیسا مجتہدانہ جواب دیا۔ خود انصاف کیجئے بھلا اطمینانِ قلب اور خوشی میں کیا فرق ہے؟ جبکہ بعض دوسری روایات میں صراحۃً لفظ "سُرُوْر" بھی آیا ہے۔ چنانچہ علامہ مسعودی لکھتے ہیں کہ امام پاک کی خبرِ شہادت سن کر معاویہ اتنا خوش ہوا کہ نعرہ بلند کیا تو اِس پر فاختہ بنت قرظہ نے کہا:

سَرَّكَ اللّٰهُ يَا أَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ! مَا هٰذَا الَّذِيْ بَلَغَكَ فَسَرَرْتَ بِهٖ؟

قَالَ: مَوْتُ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ.

"اے امیر المومنین! اللہ آپ کو مسرور رکھے، یہ آپ کے پاس کیا چیز پہنچی ہے جس نے آپ کو خوش کر دیا ہے؟ کہا: حسن بن علی کی موت"۔

(مروج الذھب ج۳ ص۸)

خود حیاۃ الحیوان کے اگلے الفاظ میں جو سیدنا ابن عباس ؓ اور معاویہ کا مکالمہ آیا ہے اُس سے بھی ظاہر ہے کہ موصوف اتنا خوش تھے کہ اُن کے چہرے پر خوشی کے آثار نمایاں تھے، اسی لیے تو سیدنا ابن عباس ؓ نے فرمایا ''لَا أَدْرِيْ مَا حَدَثَ ، إِلَّا أَنِّيْ أَرَاکَ مُسْتَبْشِراً '' (مجھے نہیں معلوم کہ کیا رونما ہوا مگر میں تمہیں خوش دیکھ رہا ہوں) یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ موصوف نے سیدنا ابن عباس ؓ کے ساتھ تعزیت نہیں کی اور نہ ہی یوں کہا کہ افسوس ہے کہ ہمارے نبی کا نواسہ شہید کردیا گیا بلکہ کہا تو یوں کہا: ''یَا ابْنَ عَبَّاسٍ! هَلْ تَدْرِيْ مَا حَدَثَ فِيْ أَهْلِ بَيْتِکَ؟'' (اے ابن عباس! کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے اہل بیت میں کیا سانحہ رونما ہوا؟) حالانکہ یوں بھی کہا جاسکتا تھا کہ ''اے ابن عباس تم جانتے ہو کہ ہمارے نبی کے اہل بیت میں کیا سانحہ رونما ہوا؟'' اور صحیح حدیث میں آچکا ہے کہ اسدی بدبخت نے مجلسِ معاویہ میں امام پاک کو ''جَمْرَةٌ'' (انگارا) کہا تو موصوف کے ماتھے پر شکن تک نہ آئی، جبکہ یہاں موصوف شہادتِ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کو فقط سیدنا ابن عباس ؓ کے لیے سانحہ قرار دے رہے ہیں، جبکہ ایسی ہستیوں کا سانحۂ ارتحال تمام مسلمانوں کا مشترکہ غم ہوتا ہے۔ سیدنا ابن عباس ؓ کو بھی چونکہ معاویہ سے ایسی غمخواری کی توقع نہیں تھی اسی لیے اُنہوں نے اُس کی بات کی پروا کیے بغیر فرمایا: ہاں اگر ہمیں یہ صدمہ پہنچا ہے تو ہم اس سے قبل اس سے بھی بڑے صدمہ سے دوچار ہوچکے ہیں تاہم اے معاویہ! ہمیشہ تم بھی نہیں رہو گے۔

اِس عبارت میں مکمل سیاق وسباق کو مدنظر رکھتے ہوئے انصاف سے بتایئے کہ سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی اچانک شہادت پر کسی کا ایسا اندازِ عمل امام پاک سے محبت کی علامت ہے یا بغض کی؟ اگر محبت کی علامت ہے تو عقلاً اور نقلاً واضح فرمایئے اور اگر بغض کی علامت ہے تو پھر درجِ ذیل حدیث کو ضرور مدنظر رکھیے۔ حضرت ابو ہریرہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

مَنْ أَحَبَّ الْحَسَنَ وَالْحُسَيْنَ فَقَدْ أَحَبَّنِيْ ، وَمَنْ أَبْغَضَهُمَا فَقَدْ أَبْغَضَنِيْ.

''جس نے حسن اور حسین کو محبوب رکھا تو اُس نے مجھے محبوب رکھا اور جس نے اُن سے بغض رکھا تو اُس نے مجھ سے بغض رکھا''۔

(سنن ابن ماجه بتحقيق الألباني ص ٤٠ حديث ١٤٣)

بعض لوگ حیاۃ الحیوان وغیرہ کتب کو غیر معتبر کہہ کر اِس واقعہ کو مسترد کرنے کی کوشش کرسکتے ہیں لیکن اُنہیں یہ خیال بھی رہنا چاہیئے کہ سنن ابی داود کی حدیث صحیح ہے اور حیاۃ الحیوان، وفیات الأعیان اور مروج الذہب وغیرہ کتب میں جو اِس واقعہ کی تفصیل ہے یہ حدیث اُس کی مؤید ہے۔ نیز اگر کہا جائے کہ یہ سب روایات اِس لیے قابل قبول نہیں کہ وہ صحابی تھے اور کوئی صحابی مبغض اہل بیت نہیں ہوسکتا تو اِس پر گزارش ہے کہ اگر ہر صحابی کہے جانے والے شخص کا محبّ اہل بیت ہونا لازمی ہوتا تو نبی کریم ﷺ بار بار اور مختلف الفاظ میں اہل بیت کرام علیہم السلام سے بغض رکھنے والے کے لیے ترہیب وتنبیہ کیوں فرماتے؟ اور ایسے شخص کو بے ایمان کیوں فرماتے؟ کیا اِس قسم کی تمام احادیثِ نبویہ غیر صحابہ کے لیے ہیں؟

نیز موصوف اگر محبّ اہل بیت ہی تھے تو اُس وقت روئے زمین پر وہ واحد اسلامی سربراہ تھے، کیا اُنہوں نے سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے زہر سے شہید کیے جانے پر کوئی ازخود نوٹس لیا تھا اور جو لوگ امام حسن کی اُن کے جد کریم ﷺ کے ساتھ تدفین میں رکاوٹ بنے تھے اُن کی کوئی سرزنش کی تھی؟

بعض شارحین کا تکلف اور اُس کا بطلان

سنن ابی داود کے شارحین میں سے اکثر نے اِس حدیث کی بلا تکلف شرح فرمائی ہے مگر بعض شارحین نے تصنع وتکلف سے بھی کام لیا ہے۔ چنانچہ بعض متکلفین لکھتے ہیں:

> (فَقَالَ الْمِقْدَامُ) حِیْنَ سَمِعَ مَا قَالُوْهُ فِيْ اِبْنِ بِنْتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ حِیْنَ قِیْلَ مُرَاعَاةً لِمُعَاوِیَةَ بْنِ أَبِيْ سُفْیَانَ، لِمَا تَوَهَّمُوْهُ مِنْهُ مِنَ التَّشَفِّي بِقَتْلِهٖ وَحَاشٰی مُعَاوِیَةَ ؓ أَنْ یَّكُوْنَ فِيْ قَلْبِهٖ بَغْضَاءً لِلْحَسَنِ أَوْلِأَبِیْهِ عَلِيٍّ ؓ، فَإِنَّ الصَّحَابَةَ مُبَرَّؤُوْنَ مِنْ ذٰلِکَ، لِشَهَادَتِهٖ ﷺ لَهُمْ بِأَنَّهُمْ كَالنُّجُوْمِ الَّتِيْ يُهْتَدٰی بِهَا وَيُسْتَضَاءُ بِنُوْرِهَا، لَا سِیَّمَا وَقَدْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لِمُعَاوِیَةَ: اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ هَادِیًا مَّهْدِیًّا.

”پس حضرت مقدام ؓ نے جب وہ بات سنی جو لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کے نواسے کے بارے میں معاویہ بن ابی سفیان کی دل جوئی کے لیے کہی، کیونکہ

اُنہوں نے گمان کیا کہ معاویہ کو سیدنا حسن کے قتل سے خوشی ہوئی ہے، اور معاویہ اِس بات سے دور تھے کہ اُن کے دل میں حسن یا اُن کے والد گرامی علی ﷺ کے لیے بغض ہو، بلاشبہ صحابہ اِس بات سے مبراء ہیں کیونکہ اُن کے حق میں شہادتِ نبوی ﷺ ہے کہ وہ نجوم ہیں جن سے ہدایت اور نور حاصل کیا جاتا ہے، خصوصاً رسول اللہ ﷺ نے معاویہ کی شان میں فرمایا ہے: اے اللہ! اُسے ہادی اور مہدی بنا دے"۔

(شرح سنن أبي داود لابن رسلان الرملي الشافعي ج١٦ ص٤٢٢، ٤٢٣)

شیخ ابن رسلان شافعی کا یہ کلام چار وجوہ سے باطل ہے:

۱۔ اوّلاً اِس لیے کہ مجلسِ معاویہ کے سامعین کو کوئی وہم نہیں ہوا تھا بلکہ اُنہوں نے خود معاویہ کی زبان سے یہ الفاظ سنے تھے "أَتَـرَاهَا مُصِيبَةً؟" امام ابوداود نے عمداً لفظ معاویہ کی جگہ پر لفظ "رَجُلٌ" لگا دیا ہے، مگر دوسرے محدثین نے واضح لکھ دیا ہے کہ اِن الفاظ کا قائل کوئی انسان نہیں بلکہ معاویہ خود تھا، جیسا کہ ہم باحوالہ لکھ چکے ہیں، لہٰذا مجلس معاویہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور اپنے کانوں سے سننے والے حاضرین وہم کا شکار نہیں ہوئے بلکہ شیخ ابن رسلان ہی حدیث کے دوسرے مصادر کی طرف رجوع نہ کرنے کی وجہ سے وہم کا شکار ہوئے ہیں۔

۲۔ شیخ ابن رسلان کا حدیث "أَصْـحَابِيْ كَالنُّجُوْمِ" سے دلیل حاصل کرنا بھی وہم پر مبنی ہے، کیونکہ یہ حدیث موضوع ہے۔ اِس عاجز نے اپنی کتاب "**شرح أسنى المطالب في مناقب علي بن أبي طـالـب**" میں اِس حدیث کے پانچ طرق نقل کر کے اس کا موضوع ہونا ثابت کیا ہے۔ علاوہ ازیں قرآن کریم کے مطابق جن لوگوں کی اتباع شرط ہے وہ مہاجرین وانصار میں سے سابقون اولون ہیں اور یہی وہ حضرات ہیں جن کی اتباع اُن کے بعد والوں پر لازم ہے، جیسا کہ ہم متعدد مقامات پر لکھ چکے ہیں۔ اسی لیے وہ صحابی جن کی پسند کو آقائے کائنات ﷺ نے اپنی پسند کا درجہ دیا تھا، فرماتے تھے:

مَنْ كَانَ مُسْتَنًّا فَلْيَسْتَنَّ بِمَنْ قَدْ مَاتَ ، فَإِنَّ الْحَيَّ لَا تُؤْمَنُ عَلَيْهِ الْفِتْنَةُ ، أُولٰئِكَ أَصْحَابُ مُحَمَّدٍ ﷺ ، كَانُوا أَفْضَلَ هٰذِهِ الْأُمَّةِ ، أَبَرَّهَا

قُلُوبًا ، وَأَعْمَقُهَا عِلْمًا ، وَأَقَلُّهَا تَكَلُّفًا ، اِخْتَارَهُمُ اللّٰهُ لِصُحْبَةِ نَبِيِّهِ ﷺ ، وَإِقَامَةِ دِينِهِ ، فَاَعْرِفُوا لَهُمْ فَضْلَهُمْ ، وَاتَّبِعُوهُمْ فِي أَثَرِهِمْ ، وَتَمَسَّكُوا مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ أَخْلَاقِهِمْ وَدِيْنِهِمْ ، فَإِنَّهُمْ كَانُوا عَلَى الْهُدَى الْمُسْتَقِيمِ.

''جو شخص سنت اپنانا چاہتا ہو تو وہ اُن لوگوں کی سنت اپنائے جو وفات پا چکے ہیں، کیونکہ زندہ لوگ فتنے سے محفوظ نہیں ہیں، وہ لوگ سیدنا محمد ﷺ کے صحابہ تھے، اس امت کے افضل حضرات تھے، قلبی طور پر پوری امت سے بڑھ کر نیک، علمی طور پر پوری امت سے زیادہ عمیق اور تکلف سے بہت دور تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے نبی ﷺ کی صحبت اور اپنے دین کے قیام کے لیے منتخب فرمایا تھا، تم اُن کی فضیلت کو پہچانو، اُن کے نقش قدم کی پیروی کرو اور حتی المقدور اُن کی عادات کو اپناؤ! بلاشبہ وہ ہدایتِ مستقیمہ پر فائز تھے''۔

(النصيحة للراعي والرعية لأبي الخير التبريزي ص ٢٠ ؛ حلية الأولياء ج١ ص ٣٠٥ ؛ شرح السنة ج١ ص ٢١٤ ؛ جامع بيان العلم لابن عبد البرج٢ ص ٩٤٧ ؛ مختصر الحجة على تارك المحجة، لأبي الفتح نصر المقدسي ص ١٥٧، ١٥٨ ؛ شرح العقيدة الطحاوية لابن أبي العز الحنفي ص ٥٤٦ ؛ تحفة الأخيار للكنوي ص ٦٧)

خود امام الانبیاء والمرسلین ﷺ نے متاخرین کے مقابلہ میں سابقین کو ''أَصْحَابِي'' (میرے صحابہ) فرمایا ہے، جیسا کہ صحیح مسلم میں خالد بن ولید کے مقابلہ میں سیدنا عبد الرحمان بن عوف ؓ کو اپنا صحابی فرمایا ہے، جب خالد بن ولید جو معاویہ بن ابی سفیان سے تقریباً دو سال قبل مسلمان ہوئے تھے حضرت عبد الرحمان کے مقابلہ میں خود حضور اکرم ﷺ کے روبرو ''أَصْحَابِي'' کے خطاب سے باہر تھے تو پھر اُن سے دو سال بعد کرھاً خیمۂ اسلام میں داخل ہونے والے طلقاء کیونکر اِس فضیلت کے مستحق ہو سکتے ہیں؟

خلاصہ یہ ہے کہ شیخ ابن رسلان شافعی کا مطلقاً تمام صحابہ کے فضائل میں بعض طلقاء کو شامل کرنا اور پھر اُنہیں باعث ہدایت ونور قرار دینا قرآن وسنت اور قدیم صحابہ کرام ؓ کی فہم کے سراسر خلاف ہے۔

۳۔ ثالثاً یہ کہ شیخ ابن رسلان شافعی نے بالخصوص شان معاویہ بن ابی سفیان میں جو حدیث بایں الفاظ پیش کی ہے "اللّٰھُمَّ اجْعَلْهُ هَادِيًا مَّهْدِيًا" وہ روایۃً اور درایۃً دونوں لحاظ سے موضوع و باطل ہے۔اس موضوع روایت کی مکمل و مفصل تردید کے لیے راقم الحروف کی کتاب "الأحاديث الموضوعة في فضائل معاوية" کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

۴۔ رابعاً یہ کہ اگر سامعین کو وہم ہوا تھا کہ معاویہ بن ابی سفیان کے دل میں امام حسن کے بارے میں بغض ہے، اور حقیقت یہ نہیں تھی تو پھر معاویہ بن ابی سفیان نے اُس شخص کو ٹوکا کیوں نہ جس نے امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کو بھری مجلس میں "جَمْرَةٌ" (انگارہ) کہا تھا؟ کیا تاریخ و حدیث کی کسی کتاب سے معاویہ کا اُس بدبخت اسدی شخص کو روکنا ٹوکنا یا ڈانٹنا ثابت کیا جا سکتا ہے؟ قطعاً نہیں، کیونکہ اُس بدبخت نے تو معاویہ کی خوشنودی کے لیے "جَمْرَةٌ" (انگارہ) کے الفاظ کہے تھے، یہی وجہ ہے کہ ابن صخر اُس پر ناراض نہیں ہوئے تھے بلکہ اُلٹا اُس کو پیسے دیے تھے۔

اہل بیت سے بغض تو سلطان خوش

اسدی نے جو دربارِ معاویہ میں سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کو "جَمْرَةٌ" (انگارہ) کہا تو کیوں کہا؟ اِس کی صحیح توجیہ اُن شارحین سے مل سکتی ہے جو اِس مقام پر تکلف و تصنع سے محفوظ رہے ہوں، لہٰذا آیئے! شیخ ابن رسلان شافعی کی تکلف پر مبنی تشریح کے بعد اِس جملہ کی بلا تکلّف تشریح بھی ملاحظہ فرمایئے! علامہ ابوالحسن محمد بن عبدالھادی متوفی ۱۱۳۸ھ المعروف سندھی کبیر لکھتے ہیں:

فَقَالَ الْأَسَدِيُّ: أَيْ طَلَبًا لِرِضَاءِ مُعَاوِيَةَ وَتَقَرُّبًا إِلَيْهِ.

"تو اسدی نے معاویہ کی خوشنودی اور قرب حاصل کرنے کے لیے امام پاک کو انگارہ کہا"۔

(فتح الودود شرح سنن أبي داود ج٤ ص ١٤٤، ١٤٥)

مولانا خلیل احمد سہارنپوری لکھتے ہیں:

فَقَالَ الْأَسَدِيُّ: طَلَباً لِرِضَاءِ مُعَاوِيَةَ وَتَقَرُّباً إِلَيْهِ (جَمْرَةٌ أَطْفَأَهَا اللّٰهُ تَعَالىٰ، أَيْ أَخْمَدَهَا وَأَزَالَ شَرَرَ شُرُوْرِهَا وَفِتْنَتِهَا.

''اسدی نے معاویہ کی خوشنودی اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے کہا: (وہ ایک انگارہ تھا جسے اللہ ﷻ نے بجھا دیا) یعنی اللہ تعالیٰ نے اُسے بجھا دیا اور اُس کے بھڑکنے کے شر اور فتنہ کو زائل کر دیا''۔

(بذل المجهود في حل سنن أبي داود ج١٧ ص١٤، ١٥، وط: ج١٧ ص٩، وط: ج١٢ ص ١٦٠)

اہل حدیث عالم شیخ شمس الحق عظیم آبادی نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔

(عون المعبود في مجلد واحد ص١٨٨٤، وط: ج١١ ص١٩١)

مشہور اہل حدیث مترجم وشارح علامہ وحید الزمان نے اِس حدیث کی شرح میں چند جملے لکھے ہیں وہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ وہ اسدی بد بخت کے جملے ''جَمْرَةٌ أَطْفَأَهَا اللّٰهُ'' کے تحت لکھتے ہیں:

''یعنی امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب تک زندہ تھے تو معاویہ کو خوف تھا کہیں خلافت اُن کے ہاتھ سے جاتی نہ رہے۔ اس واسطے اُس اسدی نے معاذ اللہ امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو باعث فتنہ اور فساد خیال کیا''۔

علامہ موصوف سیدنا مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ کی طرف سے معاویہ کو کھری کھری سنانے کے عزم وخلوص کی تشریح میں لکھتے ہیں:

''یعنی جیسے اسدی نے دنیا کی ظاہرداری کے لیے خوشامد سے تم کو خوش کرنے کے لیے ایک ناحق بات کہہ دی، ویسی ہی میں حق بات تم سے کہوں گا اگر چہ تم ناراض اور ناخوش ہو یا بُرا مانو''۔

معاویہ بن ابی سفیان نے جو امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی شہادت کو مصیبت نہ سمجھا، اس کی توجیہ میں علامہ موصوف لکھتے ہیں:

''امام حسن علیہ السلام کے انتقال پر معاویہ کا یہ کہنا کہ یہ مصیبت نہیں ہے' مبنی تھا اوپر تعصب کے علی اور اولادِ علی سے، راضی ہو اللہ اپنے رسول کے اہل بیت سے اور ہمارا

حشر اُن کے ساتھ کرے۔آمین''۔

(سنن أبي داود مترجم ج۳ ص۱۹۷)

علامہ شمس الحق عظیم آبادی لکھتے ہیں:

وَالْعَجَبُ كُلُّ الْعَجَبِ مِنْ مُعَاوِيَةَ فَإِنَّهُ مَا عَرَفَ قَدْرَ أَهْلِ الْبَيْتِ حَتّٰى قَالَ مَا قَالَ ، فَإِنَّ مَوْتَ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ مِنْ أَعْظَمِ الْمَصَائِبِ ، وَجَزَى اللّٰهُ الْمِقْدَامَ وَ رَضِيَ عَنْهُ فَإِنَّهُ مَا سَكَتَ عَنْ تَكَلُّمِ الْحَقِّ حَتّٰى أَظْهَرَهُ وَهٰكَذَا شَأْنُ الْمُؤْمِنِ الْكَامِلِ الْمُخْلِصِ.

''معاویہ پر انتہائی تعجب ہے، پس وہ اہل بیت کی شان نہ پہچان سکا حتیٰ کہ اس نے وہ کہا جو کہا۔ بیشک سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی وفات بڑی مصیبت ہے، اللہ تعالیٰ حضرت مقدام رضی اللہ عنہ کو جزائے خیر عطا فرمائے، بلاشبہ وہ حق کے اظہار سے خاموش نہ رہ سکے حتیٰ کہ اُسے ظاہر کر کے رہے، اور یہی کامل مخلص مومن کی شان ہوتی ہے''۔

(عون المعبود في مجلد واحد ص۱۸۸٤ وط: ج۱۱ ص۱۹۱)

شہادتِ حسن مجتبیٰ کو مصیبت نہ سمجھنا، اُس پر خوش ہونا اور امام پاک علیہ السلام کو انگارہ کہنے پر خاموش رہنا یہ سب کچھ اُس کدورت کو ظاہر کر رہا ہے جس کو صحیحین میں لفظِ ''دَخَنٌ'' سے بیان کیا گیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ امام پاک معاویہ کو دینی لحاظ سے نااہل اور ناپسندیدہ سمجھتے تھے جبکہ معاویہ امام پاک کو اپنے اور اپنے خاندان کے اقتدار کے لیے مضر ہونے کی وجہ سے ناپسندیدہ سمجھتے تھے، اور یہی وہ '' دَخَنٌ'' ہے جو بخاری، مسلم، سنن ابی داود اور مسند احمد وغیرہ میں بیان کیا گیا ہے۔ سو جب صلح کے بعد ''دَخَنٌ'' (کینہ و کدورت) کا یہ عالم تھا تو پھر ہمارے بعض اکابر کا اِس صلح کو معاویہ کی اہلیت وصلاحیت کی دلیل سمجھنا کیونکر درست ہو سکتا ہے؟ ہمارا حسنِ ظن یہ ہے کہ ہمارے جن بعض اکابر نے صلحِ امام حسن علیہ السلام کو معاویہ کی اہلیت کی دلیل تصور کر لیا ہے اُنہیں صحاح کی یہ احادیث مستحضر نہیں ہوں گی، ورنہ اُن سے یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اُس شخص کا دفاع کریں جس نے امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کو زہر سے اچانک شہید کیے جانے کو مصیبت

نہ سمجھا، جس نے اپنی مجلس میں امام حسن کو انگارہ کہنے والے بد بخت کو ٹوکا اور نہ ہی اُسے سزا دی بلکہ اُلٹا اُسے پیسے دیے۔ چونکہ ہمارے بعض اکابر فقہ، عقائد، علم کلام اور مسلسل ردّ وقدح میں مشغولیت کی وجہ سے تفسیر وحدیث کی طرف زیادہ توجہ نہیں دے سکے تھے اسی لیے اُن کی توجہ مذکورہ بالا احادیث کی طرف نہیں گئی ہوگی۔ شاید علامہ عبدالحی بن فخر الدین حسنی لکھنوی متوفّٰی ۱۳۴۱ھ نے اُن کی ایسی ہی مشغولیات کی وجہ سے لکھا ہوگا کہ:

قَلِيْلُ الْبِضَاعَةِ فِی الْحَدِيْثِ وَالتَّفْسِيْرِ.

''وہ حدیث وتفسیر میں قلیل پونجی رکھتے تھے''۔

(الإعلام بمن في تاريخ الهند من الأعلام ج۸ص ۱۱۸۲)

ہم علامہ لکھنوی کی بات کا برانہیں مناتے، کیونکہ تجربہ شاہد ہے کہ انسان جب کسی ایک طرف زیادہ منہمک ہو جاتا ہے تو دوسری طرف اُس سے رہ جاتی ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی حدیث وتفسیر پر کوئی تصنیف نہیں ہے، لہٰذا علامہ لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ کا تبصرہ حقیقت پر مبنی ہے۔

حدیثِ مقدام رضی اللہ عنہ کی روشنی میں چند سوالات

مذکورہ بالا حدیث میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ معاویہ بن ابی سفیان نے سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی اچانک شہادت کو مصیبت نہیں سمجھا تھا اور جس صحابی نے شہادت کی اُس خبر کو مصیبت سمجھ کر ''إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ'' پڑھا تھا اُس پر بھی تعجب کیا تھا اور کہا تھا کہ یہ کوئی مصیبت ہے کہ تم نے ''إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ'' پڑھ دیا ہے؟ اور جس بد بخت نے امام پاک کو انگارہ کہا تھا اُسے ڈانٹنے کی بجائے اُلٹا پیسے دیے تھے۔ اِس پر ہم جملہ اہل اسلام سے بالعموم اور وکلائے سلطان سے بالخصوص سوال کرتے ہیں کہ معاویہ بن ابی سفیان کے اِن الفاظ وانداز کا سبب کیا تھا؟ آیا یہ امام پاک سے محبت کی وجہ سے تھا یا اُن سے بغض وکینہ کی وجہ سے؟ بعض لوگوں نے اہل اسلام کی اصلاح کے لیے ایک کتاب لکھی ہے، جس کا نام اُنھوں نے ''بغض وکینہ'' رکھا ہے۔ پہلے ہم اُس کتاب سے چند اقتباسات نقل کرتے ہیں پھر سوال کریں گے کہ اہل انصاف اِس سلسلے میں کیا فرماتے ہیں۔ وہ ایک مقام پر کینہ کی تعریف میں لکھتے ہیں:

"دل میں دشمنی کو روکے رکھنا اور موقع پاتے ہی اس کا اظہار کرنا کینہ کہلاتا ہے۔
(لسان العرب، ۱/۸۸۸) حجۃ الاسلام حضرت سیدنا امام محمد بن محمد غزالی علیہ رحمۃ اللّٰہِ الوالی نے احیاء العلوم میں کینے کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے: اَلْحِقْدُ اَنْ یُّلْزِمَ قَلْبَہٗ اِسْتِثْقَالَہٗ وَالْبُغْضَۃَ لَہٗ وَالنِّفَارَ عَنْہُ وَاَنْ یَّدُوْمَ ذٰلِکَ وَیَبْقٰی یعنی: کینہ یہ ہے کہ انسان اپنے دل میں کسی کو بوجھ جانے، اُس سے دشمنی و بغض رکھے، نفرت کرے اور یہ کیفیت ہمیشہ ہمیشہ باقی رہے۔ (احیاء العلوم، کتاب ذم الغضب و الحقد و الحسد، ۳/۲۲۳)"۔

(بغض و کینہ، دعوتِ اسلامی، شعبہ اصلاحی کتب، ص ۵)

اِس تعریف کے مکمل الفاظ خصوصاً اِس جملہ "دل میں دشمنی کو روکے رکھنا اور موقع پاتے ہی اس کا اظہار کرنا کینہ کہلاتا ہے" میں بار بار غور فرما کر بتلایئے کہ شہادتِ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام پر زبانِ معاویہ کے ذریعے اُن کے اندر سے جو الفاظ باہر آئے تھے، آیا وہ امام پاک سے محبت کی علامت ہیں یا کینہ کی؟ دو میں سے کوئی ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے، تیسری نہیں، کیونکہ بعض لوگوں کی اِسی کتاب میں آگے یہ بھی لکھا ہوا ہے:

"محبت کینے کی ضد (یعنی اُلٹ) ہے"۔

(بغض و کینہ، دعوتِ اسلامی، شعبہ اصلاحی کتب، ص ۴۸)

نیز اُن لوگوں کی کتاب میں یہ بھی لکھا ہوا ہے:

"کینے سے آٹھ ہلاکت خیز چیزیں جنم لیتی ہیں: اُن میں سے ایک یہ ہے کہ کینہ پرور حسد کرے گا یعنی کسی کے غم سے شاد ہوگا اور اُس کی خوشی سے غمگین۔ دوسرا یہ کہ شماتت کرے گا یعنی کسی کو کوئی مصیبت پہنچے گی تو خوشی کا اظہار کرے گا"۔

(بغض و کینہ، دعوتِ اسلامی، شعبہ اصلاحی کتب، ص ۱۴)

اگر حدیثِ مقدام بن معدی کرب رضی اللہ عنہ میں معاویہ کی زبان پر جاری شدہ الفاظ اور امام پاک کو "جَمْرَۃٌ" (انگارہ) کہنے پر خاموش رہنا محبت کے سبب سے تھا تو عقلاً اور نقلاً ثابت کیجئے، ورنہ محبت کی ضد

کینہ ہے اور اسلامی بھائیوں نے کینے کا حکم یہ لکھا ہے:

''مسلمان سے بلا وجہ شرعی کینہ و بغض رکھنا حرام ہے۔(فتاوی رضویہ ۶/ ۵۲۶) یعنی کسی نے ہم پر نہ تو ظلم کیا اور نہ ہی ہماری جان و مال وغیرہ میں کوئی حق تلفی کی پھر بھی ہم اُس کے لیے دل میں کینہ رکھیں تو یہ ناجائز و حرام اور جہنم میں لے جانے والا کام ہے''۔

(بغض و کینہ ،دعوتِ اسلامی ،شعبہ اصلاحی کتب ،ص ۵)

نیز ان حضرات کی کتاب میں یہ حدیث نبوی ﷺ بھی مرقوم ہے:

''**اِنَّ النَّمِیمَۃَ وَالْحِقْدَ فِی النَّارِ لَا یَجْتَمِعَانِ فِیْ قَلْبِ مُسْلِمٍ** بیشک چغل خوری اور کینہ پروری جہنم میں ہیں، یہ دونوں کسی مسلمان کے دل میں جمع نہیں ہو سکتے''۔

(بغض و کینہ ،دعوتِ اسلامی ،شعبہ اصلاحی کتب ،ص ۸)

یہ اور اِس کے علاوہ کتاب ''بغض و کینہ'' میں نبوی تحذیرات و وعیدات پر بہت سی احادیث ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ احادیث مطلقاً ہر مسلمان کے لیے برابر ہیں یا مسلمانوں کے بعض طبقات اِن سے مستثنیٰ بھی ہیں؟ اگر کوئی طبقہ مستثنیٰ ہو تو دلائل کے ساتھ واضح فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔ اگر بغض و کینہ کی یہ وعیدات مطلق ہوں یعنی کسی بھی مسلمان کے بارے میں کوئی شخص اپنے دل میں بغض و کینہ رکھے تو اُس کے لیے یہی سزا ہے تو پھر یہ بھی بتا دیجیے کہ جو شخص اہل بیت کرام علیہم السلام کے ساتھ بغض و کینہ رکھے تو اُس کے لیے کیا سزا ہوگی؟ لیجیے! یہ بھی اُن حضرات ہی کی کتاب سے پیش کیے دیتا ہوں:

''حضرت سیدنا حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فرمان عبرت نشان ہے: ہم سے بغض مت رکھنا کہ رسول پاک ،صاحبِ لولاک ،سیاح افلاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **لَا یُبْغِضُنَا وَلَا یَحْسُدُنَا اِلَّا ذِیْدَ عَنِ الْحَوْضِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ بِسِیَاطٍ مِّنْ نَّارٍ** جو شخص ہم سے بغض یا حسد کرے گا، اسے قیامت کے دن حوضِ کوثر

سے آگ کے چابکوں کے ذریعے دور کیا جائے گا۔(المعجم الاوسط، ٢/ ٣٣، الحدیث ٢٤٠٥)

ایک طویل حدیثِ پاک میں یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص بیت اللہ شریف کے ایک کونے اور مقام ابراہیم کے درمیان جائے اور نماز پڑھے اور روزے رکھے اور پھر اہل بیت کی دشمنی پر مر جائے تو وہ جہنم میں جائے گا"۔

(بغض و کینه ،دعوتِ اسلامی،شعبه اصلاحی کتب،ص ٢٤)

فی الجملہ یہ کہ حدیث مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ میں شہادتِ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کو معاویہ کا مصیبت نہ سمجھنا اور اُن کی مجلس میں امام پاک کو "جَمْرَةٌ" (انگارہ) کہنے پر اُن کا ٹس سے مس نہ ہونا محبت کی وجہ سے تھا تو ثابت فرمایئے، اور اگر بغض و کینہ کی وجہ سے تھا تو پھر اُنہیں اُن تمام وعیدات وتحذیرات سے مستثنیٰ ثابت فرمایئے جو زبانِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے صادر ہوئیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ لوگ اِس مسئلہ کو ضرور حل فرمائیں گے جن کا یہ مشہور نعرہ ہے:

"مجھے اپنی اور ساری دنیا کے لوگوں کی اصلاح کی کوشش کرنی ہے"۔

(بغض و کینه ،دعوتِ اسلامی،شعبه اصلاحی کتب،ص ٤)

اگر اِس مسئلہ کو کسی کنارے نہ لگایا گیا تو اہل اسلام نے اُس نبوی پیش گوئی کا مصداق کسی نہ کسی کو تو سمجھنا ہوگا جو ہم اِس سے قبل متعدد حوالہ جات کے ساتھ نقل کر چکے ہیں کہ آقائے کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو پہلے ہی فرما دیا تھا:

"تمہارے بارے میں قوموں کے سینوں میں کینے ہیں جن کو وہ میرے بعد ہی ظاہر کریں گے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میرے دین کی سلامتی میں؟ فرمایا: تمہارے دین کی سلامتی میں"۔

(مسند أبي يعلىٰ (في مسند علي) ج١ ص٤٢٦، ٤٢٧ حديث ٥٦٥)

اور اس مصداق کی تعیین میں اسلامی بھائیوں کی کتاب میں درج شدہ وہ حدیث بھی ممد (مددگار)

ثابت ہوگی جو یوں ہے:

''حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کی گئی کہ لوگوں میں سے کون افضل ہے؟ فرمایا: ہر سلامت دل والا، سچی زبان والا۔ لوگوں نے عرض کی: سچی زبان والے کو تو ہم جانتے ہیں، یہ سلامت دل والا کیا ہے؟ فرمایا: **هُوَ التَّقِيُّ النَّقِيُّ لَا اِثْمَ فِيْهِ وَلَا بَغْيَ وَلَا غِلَّ وَلَا حَسَدَ** یعنی وہ ایسا ستھرا ہے جس پر نہ گناہ ہو، نہ بغاوت، نہ کینہ اور نہ حسد۔ سنن ابن ماجه ، كتاب الزهد، باب الورع، ٤/٤٧٨ ، الحديث ٤٢١٦)''۔

(بغض و كينه ،دعوتِ اسلامی، شعبه اصلاحی كتب، ص ٣٤)

کینہ ور کا مصداق معین کرنے میں اہل اسلام کی مدد کسی اور لفظ نے نہ بھی کی تو لفظِ بغاوت سے تو وہ ضرور کسی نتیجے پر پہنچ جائیں گے۔ علاوہ ازیں بعض لوگ درجِ ذیل تصریحاتِ اہل سنت سے بھی کسی نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں۔ امام ابو العباس قرطبی اور امام مناوی رحمۃ اللہ علیہما حدیث الثقلین کی تشریح میں اہل بیت کرام علیہم السلام کے ساتھ محبت کی تاکید و فرضیت کو بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

وَمَعَ ذٰلِکَ فَقَابَلَ بَنُوْ اُمَيَّةَ عَظِيْمَ هٰذِهِ الْحُقُوْقِ بِالْمُخَالَفَةِ وَالْعُقُوْقِ ، فَسَفَكُوْا مِنْ أَهْلِ الْبَيْتِ دِمَاءَ هُمْ وَسَبُوْا نِسَاءَ هُمْ وَأَسَرُوْا صِغَارَهُمْ وَخَرَبُوْا دِيَارَهُمْ وَجَحَدُوْا شَرَفَهُمْ وَفَضْلَهُمْ وَاِسْتَبَاحُوْا سَبَّهُمْ وَلَعَنَهُمْ ، فَخَالَفُوا الْمُصْطَفٰى صلى الله عليه و آله وسلم فِيْ وَصِيَّتِهٖ وَقَابَلُوْهُ بِنَقِيْضِ مَقْصُوْدِهٖ وَاُمْنِيَتِهٖ ، فَوَاخَجْلُهُمْ إِذَا وُقِفُوْا بَيْنَ يَدَيْهِ ، وَيَا فَضِيْحَتُهُمْ يَوْمَ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهِ.

''اس فرمان کے باوجود بنو امیہ نے مقابلہ کیا، ان کے عظیم حقوق کے برعکس چلے اور نافرمانی کی۔ پس اُنہوں نے اہل بیت کرام علیہم السلام کا خون بہایا، اُن کی خواتین اور بچوں کو قید کیا، اُن کے گھروں کو برباد کیا، اُن کے شرف وفضیلت کا انکار کیا اور اُن

پر سبّ وشتم اور لعنت کو مباح کیا۔ سو انہوں نے مصطفیٰ ﷺ کی وصیت کی مخالفت کی اور آپ کے مقصود اور آرزو کے خلاف کیا۔ پس وہ کس قدر خجالت کا سامنا کریں گے جب آپ ﷺ کی بارگاہ میں کھڑے کیے جائیں گے اور کتنا رُسوا ہوں گے جب آقا ﷺ کے سامنے پیش کیے جائیں گے"۔

(المفهم لما أشكل من تلخيص كتاب مسلم: كتاب النبوات، باب فضائل أهل البيت ﷺ ج٦ ص٣٠٤؛ فيض القدير شرح الجامع الصغير ج٣ ص١٥ حديث ٢٦٣١)

ناصبیت کہاں سے چلی؟

مذکورہ بالا عبارت میں مذکور آٹھ مظالم وفسادات کا مرتکب اِن دونوں ائمہ اہل سنت نے بنوامیہ کو ٹھہرایا ہے۔ سو جان لیجئے کہ جب کُھرا کسی گاؤں اور قبیلے تک پہنچ جائے تو پھر دانا لوگ خاص گھر کا سراغ بھی لگالیا کرتے ہیں، اور مجھے خدشہ ہے کہ اگر کوئی شخص "فتح الباري" کے درجِ ذیل مقام سے آگاہ ہوگیا تو وہ خاص گھر تک بھی پہنچ جائے گا اور اُسے معلوم ہوجائے گا کہ ناصبیت کہاں سے چلی۔ حافظ رحمہ اللہ بعض متقدمین سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وَوَقَعَ فِيْ "شَرْحِ الْوَجِيْزِ لِلرَّافِعِيْ" عِنْدَ ذِكْرِ الْخَوَارِجِ قَالَ: هُمْ فِرْقَةٌ مِنَ الْمُبْتَدِعَةِ خَرَجُوْا عَلىٰ عَلِيٍّ حَيْثُ اِعْتَقَدُوْا أَنَّهُ يَعْرِفُ قَتَلَةَ عُثْمَانَ وَيَقْدِرُ عَلَيْهِمْ وَلَا يَقْتَصُّ مِنْهُمْ لِرِضَاهُ بِقَتْلِهِ وَمُوَاطَأَتِهِ إِيَّاهُمْ، وَيَعْتَقِدُوْنَ أَنَّ مَنْ أَتىٰ كَبِيْرَةً فَقَدْ كَفَرَ، وَاسْتَحَقَّ الْخُلُوْدَ فِي النَّارِ، وَيَطْعَنُوْنَ لِذٰلِكَ فِي الْأَئِمَّةِ. انتهىٰ.

وَلَيْسَ الْوَصْفُ الْأَوَّلُ فِيْ كَلَامِهِ وَصْفَ الْخَوَارِجِ الْمُبْتَدِعَةِ وَإِنَّمَا هُوَ وَصْفُ النَّوَاصِبِ أَتْبَاعِ مُعَاوِيَةَ بِصِفِّيْنَ، وَأَمَّا الْخَوَارِجُ فَمِنْ مُعْتَقِدِهِمْ تَكْفِيْرُ عُثْمَانَ وَأَنَّهُ قُتِلَ بِحَقٍّ، وَلَمْ يَزَالُوْا مَعَ عَلِيٍّ حَتّٰى وَقَعَ التَّحْكِيْمُ بِصِفِّيْنَ فَأَنْكَرُوا التَّحْكِيْمَ وَخَرَجُوْا عَلىٰ عَلِيٍّ وَكَفَّرُوْهُ.

''رافعی کی ''شرح الوجیز'' میں خوارج کے ذکر میں مذکور ہے، انہوں نے کہا:
وہ ایک بدعتی فرقہ ہے جنہوں نے سیدنا علی علیہ السلام پر خروج کیا بایں وجہ کہ اُنہوں نے سمجھا کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلین کو جانتے ہیں، اُن پر قدرت رکھتے ہیں اور اُن سے قصاص نہیں لیتے، ان کی اُن کے قتل میں مرضی شامل ہے کیونکہ اُنہوں نے اُن لوگوں کو اپنے ہاں پناہ دے رکھی ہے، اور وہ خوارج یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ جو شخص گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہوا تو وہ کافر ہو گیا اور ہمیشہ جہنم میں رہنے کا سزاوار ہو گیا، اور اِس وجہ سے وہ ائمہ پر بھی طعن کرتے ہیں۔ رافعی کا کلام پورا ہو گیا۔

رافعی کے کلام میں جو پہلی علامت مذکور ہے وہ بدعتی خوارج کی نہیں، بلکہ وہ اُن نواصب کی علامت ہے جو جنگِ صفین میں معاویہ کے پیروکار تھے۔ باقی رہے خوارج تو اُن کا عقیدہ یہ تھا کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تکفیر کرتے تھے اور اُن کے قتل کو جائز سمجھتے تھے، وہ مسلسل سیدنا علی علیہ السلام کے ساتھ رہے، یہاں تک کہ صفین میں تحکیم واقع ہوئی تو اُنہوں نے تحکیم کا انکار کر دیا اور سیدنا علی علیہ السلام کے خلاف خروج کیا اور اُن کی تکفیر کی''۔

(فتح الباري: كتاب التوحيد، باب قراءة الفاجر والمنافق، حديث ٧٥٦٢، ج١٧ ص ٦٢٦)

اِس عبارت میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے متبعینِ معاویہ کو نواصب قرار دیا ہے، اِس کا نتیجہ کیا نکلا؟ ظاہر ہے کہ متبوع ناصبی نہ ہو تو متبعین ناصبی نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ حافظ ابن کثیر نے تمام ملوکِ بنو امیہ کو ناصبی تسلیم کیا ہے، ماسوا عمر بن عبدالعزیز اور معاویہ بن یزید کے۔ وہ لکھتے ہیں:

وَهٰكَذَا خُلَفَاءُ بَنِيْ أُمَيَّهْ ... عِدَّتُهُمْ كَعِدَّةِ الرِّفُضِيَّه
وَ لٰكِنَّ الْمُدَّةُ كَانَتُ نَاقِصَه ... عَنْ مِائَةٍ مِنَ السِّنِيْنَ خَالِصَه
وَ كُلُّهُمْ قَدْ كَانَ نَاصِبِيًّا ... إِلَّا الإِمَامَ عُمَرَ التَّقِيَّا
مُعَاوِيَةُ ثُمَّ ابْنُهُ يَزِيْدُ ... وَابْنُ ابْنِهٖ مُعَاوِيَ السَّدِيْدُ

''اور یونہی خلفاء بنی امیہ تھے، اُن کی تعداد رافضیہ کی طرح تھی، لیکن اُن کی مدت کم تھی،

مکمل سو سال سے بھی گھٹ تھی، وہ سب کے سب ناصبی تھے ماسوا امام عمر متقی کے،
معاویہ پھر اُس کا بیٹا یزید اور اُس کا پوتا معاویہ سچا"۔

(البداية والنهاية بتحقيق محسن التركي ج١٧ ص ٣٧٥)

اس کلام میں یزید کے بیٹے معاویہ کو "سَدِيْدٌ" (سچا) کہہ کر اُسے ناصبیت سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے، لیکن خیال رہے کہ یہ ضروری نہیں کہ ہر سچا، پارسا، عابد وزاہد آدمی ناصبیت سے پاک ہو، ایسا ہوتا تو تمام خوارج عداوتِ مرتضیٰ سے پاک ہوتے۔ معاویہ بن یزید کو یہاں سدید کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اُس نے خاص معاملہ میں حق وسچ کا اظہار کیا تھا، اور وہ یہ کہ اُس نے خلافت میں اپنے دادا اور باپ کو غلط قرار دیا تھا اور اُن دونوں کے بارے میں "فَصَارَ فِيْ قَبْرِهٖ رَهِيْنًا بِذُنُوْبِهٖ" کے الفاظ استعمال کیے تھے، جبکہ سیدنا علی اور امام حسین علیہما السلام کو برحق تسلیم کیا تھا، جیسا کہ تردید روافض میں مشہور مصنف علامہ ابن حجر مکی نے اپنی کتاب "الصواعق المحرقة" کے خاتمہ کے آخری صفحات میں صراحۃً بیان کیا ہے۔

(الصواعق المحرقة ص ٢٢٤، وط: ص ٦٠١؛ حياة الحيوان: خلافة معاوية بن يزيد، ج١ ص ٢٢١، ٢٢٢)

نیز چونکہ فاضل ناظم نے معاویہ رحمۃ اللہ علیہ بن یزید پلید کو خلفاء میں شمار کیا ہے اسی لیے اُنہیں سدید کہہ کر ناصبیت سے مستثنیٰ کیا ہے، ورنہ معاویہ بن یزید نے تو خلافت کو پسند ہی نہیں کیا تھا، الا یہ کہ جتنے دن وہ زندہ رہا تھا اُسے خلیفہ تصور کیا گیا تھا اور اُس کی وفات کے بعد ہی کسی اور شخص کو منتخب کیا گیا تھا۔

جس طرح مذکورہ بالا منظوم کلام میں حضرت عمر بن عبدالعزیز اور معاویہ بن یزید کے علاوہ تمام اُموی خلفاء کو ناصبی کہا گیا ہے اسی طرح بعض علماء ظاہریہ نے بھی خلافتِ راشدہ کے بعد والے تمام اُموی خلفاء کو ناصبی مانا ہے، ماسوا حضرت عمر بن عبدالعزیز اور یزید بن ولید کے۔ چنانچہ مشہور مصنف اور اُموی غلام علامہ ابن حزم ظاہری اندلسی بنو عباس کی خلافت کے تذکرہ میں کہتے ہیں کہ اُن کی خلافت بھی ملک عضوض تھی اور کسروی طرز پر عجمی حکومت تھی، البتہ وہ صحابہ کرام ﷡ میں سے کسی پر سب وشتم نہیں کرتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

إِلَّا أَنَّهُمْ لَمْ يُعْلِنُوْا بِسَبِّ أَحَدٍ مِنَ الصَّحَابَةِ رِضْوَانُ اللّٰهِ عَلَيْهِمْ،

بِخِلَافِ مَا كَانَ بَنُوْ أُمَيَّةَ يَسْتَعْمِلُوْنَ مَنْ لَعَنَ عَلِيَّ بْنَ أَبِيْ طَالِبٍ رِضْوَانُ اللّٰهِ عَلَيْهِ ، وَلَعَنَ بَنِيْهِ الطَّاهِرِيْنَ مِنْ بَنِي الزَّهْرَاءِ ، وَكُلُّهُمْ كَانَ عَلٰى هٰذَا حَاشَا عُمَرَبْنَ عَبْدِ الْعَزِيْزِ وَيَزِيْدَبْنَ الْوَلِيْدِ رَحِمَهُمَا اللّٰهُ تَعَالٰى ، فَإِنَّهُمَا لَمْ يَسْتَجِيْزَا ذٰلِکَ.

''الا یہ کہ اُنہوں نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم میں سے کسی پر علانیہ سبّ وشتم نہیں کیا، بخلاف بنوامیہ کے، وہ گورنر ہی اُنہیں بناتے تھے جو سیدنا علی بن ابی طالب رضوان اللہ علیہ پر لعنت کرتے تھے اور اُن کی اُس ذریتِ طاہرہ پر لعنت کرتے تھے جو سیدہ فاطمہ علیہا السلام سے تھی۔ وہ سارے کے سارے اسی طریقے پر گامزن تھے ماسوا سیدنا عمر بن عبدالعزیز اور یزید بن ولید رحمۃ اللہ علیہما کے، اُن دونوں نے اِس کی اجازت نہیں دی تھی''۔

(رسائل ابن حزم ج٢ ص١٤٦، ١٤٧)

اگر کوئی کہے کہ اِس عبارت میں ابن حزم نے ناصبی تو نہیں کہا تو اُنہیں کہا جائے کہ جب اُنہوں نے دو خلفاء کے علاوہ تمام بنوامیہ کو مولیٰ علی اور اُن کی اولاد طاہرہ علیہم السلام پر لعنت کرنے والا لکھا ہے تو کیا لعنت ناصبیت (عداوتِ اہل بیت) کی وجہ سے نہیں ہوتی تو محبتِ اہل بیت کی وجہ سے ہوتی ہے؟

حیاۃ الحیوان کے ترجمہ میں خیانت

حیاۃ الحیوان کے اِس مقام پر ایک سگِ عطار نے ترجمہ میں خیانت کی ہے، مثلاً اُنہوں نے درجِ ذیل جملہ کا ترجمہ یوں کیا ہے:

فَلَمَّا جَاءَهُ الْقَدَرُ الْمَحْتُوْمُ ،وَاخْتَرَمَتْهُ أَيْدِي الْمَنُوْنِ،بَقِيَ مُرْتَهَنًا بِعَمَلِهٖ، فَرِيْدًا فِيْ قَبْرِهٖ ، وَوَجَدَ مَا قَدَّمَتْ يَدَاهُ ، وَرَأٰى مَاارْتَكَبَهٗ وَاعْتَدَاهُ.

''مگر جس وقت ان کے انتقال کا وقت آپہنچا تو موت نے ان کو اپنی آغوش میں لے لیا تو وہ اپنے اعمال کے ہمراہ اس فانی دنیا سے کوچ کر گئے۔ گور میں تنہا دفنائے گئے۔ جو

کچھ بھی وہ کر چکے اس کا پھل ان کو مل گیا''۔

(عطار الجنان ترجمة حياة الحيوان ج١ ص٢١٦)

دراصل معاویہ بن یزید نے نام نہاد خلافت کو ناپسندیدہ سمجھتے ہوئے جہاں خود کو اُس سے دور رکھنے کا اظہار کیا تھا وہیں اُس نے اپنے دادا معاویہ اور باپ یزید کی بھی مذمت کی تھی، اور اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے اُس نے جو الفاظ منتخب کیے اُن کا ترجمہ وہ نہیں بنتا جو سگِ عطار نے کیا ہے۔ صحیح ترجمہ یہ ہے:

''پس جب اُس کے پاس حتمی تقدیر آ پہنچی اور موت کے ہاتھوں نے اُسے جڑ سے اُکھاڑ دیا، وہ اپنے اعمال میں گروی، قبر میں تنہا پڑا ہوا ہے، اُس نے وہ سب کچھ پا لیا جو اُس کے ہاتھوں نے آگے بھیجا تھا اور اُس نے وہ دیکھ لیا جس کا اُس نے ارتکاب کیا تھا اور زیادتی کی تھی''۔

(حياة الحيوان للدميري ج١ ص٢٢٢)

اہل علم کو چاہیئے کہ وہ اصل عربی الفاظ کو مدنظر رکھتے ہوئے خود ہی اِس مقام میں غور فرمالیں اُن پر خیانت یا عدم خیانت واضح ہو جائے گی۔ یہاں اگر ایک اور مقام کو بھی سامنے رکھ لیا جائے تو سگ عطار کتنا امین ہیں سب واضح ہو جائے گا۔ اُنہوں نے ایک مقام پر درجِ ذیل جملہ کا ترجمہ یوں کیا ہے:

وَكَانَ مِنْ أَكْبَرِ الْمُؤَلِّبِيْنَ عَلَيْهِ مُحَمَّدُ بْنُ أَبِيْ بَكْرٍ.

''اور اُن ساروں سے زیادہ شیطان محمد بن ابی بکر تھے''۔

(عطار الجنان ترجمة حياة الحيوان ج١ ص١٩٥)

علماء دیوبند نے اِس جملہ کا ترجمہ یوں کیا ہے:

''اِن تمام لوگوں میں سب سے زیادہ فتنہ انگیز محمد بن ابی بکر تھے''۔

(حياة الحيوان ج١ ص١٨٥، ادارہ اسلامیات، انار کلی، لاهور)

یہ سگِ عطار لفظ ''مُؤَلِّب'' کے ترجمہ میں لفظ ''شیطان'' کہاں سے لے آیا۔ اگر ربیبِ مرتضٰی سیدنا محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے مطالبہ کرنے والوں میں سب سے زیادہ سرگرم مان بھی لیا جائے تو

اُنہیں شیطان کیونکر کہا جاسکتا ہے؟ جبکہ اُن کے بارے میں سگ عطار چند سطور پہلے یہ بھی لکھ چکا ہے:

"یہ خط عثمان کی جانب سے گورنر مصر عبداللہ بن ابی سرح کے لیے ہے جب محمد بن ابی بکر فلاں فلاں کے ساتھ آئیں تو پھر اُن کے ہاتھ اور پیروں کو کاٹ کر کھجور کی شاخوں سے آویزاں کر دیا جائے"۔

(عطار الجنان ترجمة حياة الحيوان ج١ ص١٩٥)

بتایئے! جس شخص کے بارے میں ایسا خط لکھا جائے اور اُس خط سے قبل اُس نے کسی قسم کے جرم کا ارتکاب بھی نہ کیا ہو، اور پھر جب وہ خط پکڑا جائے اور اُس کو وہ شخص خود اپنی آنکھوں سے پڑھ لے تو وہ بے قصور شخص بپھرے گا نہیں تو اور کیا کرے گا؟ کیا سگِ عطاروں کے نزدیک مشاجراتِ صحابہ میں سکوت کا یہی مطلب ہے کہ سیدنا ابوبکرؓ کے فرزند، ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بھائی اور سیدنا علیؓ کے تربیت یافتہ کم سن صحابی کو شیطان کہا جائے؟

خلاصہ یہ ہے کہ اگر قارئین کرام حیاۃ الحیوان کے درجِ بالا دونوں مقامات میں غور فرمائیں گے تو اُن پر واضح ہو جائے گا کہ سگ عطار ترجمہ کرنے میں کتنا امین ہے اور یہ بھی روشن ہو جائے گا کہ سگ عطار دُم کن کے سامنے ہلاتے ہیں اور بھونکتے کن پر ہیں۔

صلح اور پسند میں فرق

معاویہ کی جھوٹی تعریف میں زمین وآسمان کے قلابے ملاتے ہوئے بعض مقررین وواعظین کو بیان کرتے ہوئے سنا گیا ہے کہ اہل بیت کرام علیہم السلام کی جن کے ساتھ صلح ہے ہماری بھی اُن کے ساتھ صلح ہے اور اہل بیت کی جن کے ساتھ لڑائی ہے ہماری بھی اُن کے ساتھ لڑائی ہے۔ اس سے وہ امام حسن مجتبیٰؑ کی معاویہ کے ساتھ صلح اور امام حسینؑ کی یزید کے ساتھ لڑائی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

اِس پر پہلی بات تو یہ ہے کہ صلح اور پسند میں فرق ہے۔ بتلایئے! نبی کریم ﷺ نے معاہدہ نامہ لکھ کر مشرکین مکہ کے ساتھ محدود مدت تک کے لیے جو صلح فرمائی تھی، کیا اُس کا یہ مطلب لیا جاسکتا ہے کہ اُس محدود مدت میں مشرکین آپ کے پسندیدہ ہو گئے تھے؟ دو ملکوں یا دو گروہوں کے درمیان جنگ نہ کرنے پر یا

پہلے سے جاری جنگ کو روکنے پر جو معاہدہ ہوتا ہے، بتایئے اُس کو صلح نامہ کہا جاتا ہے یا محبت نامہ؟ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہمیشہ اہم معاملات کے بارے میں جو صلح نامہ اور معاہدہ لکھا جاتا ہے اُس کے بعد دلوں میں ایک دوسرے کے بارے میں محبت کے جذبات نہیں ہوتے بلکہ تحفظات اور خدشات باقی ہوتے ہیں۔ مثلاً بخاری شریف میں ہے:

صَالَحَ النَّبِيُّ ﷺ الْمُشْرِكِينَ يَوْمَ الْحُدَيْبِيَةِ عَلٰى ثَلاثَةِ أَشْيَاءَ.

''نبی کریم ﷺ نے حدیبیہ کے دن مشرکین کے ساتھ تین شرطوں پر مصالحت فرمائی''۔

(بخاري: كتاب الصلح، باب الصلح مع المشركين، ص ٣٦١ حديث ٢٧٠٠)

کیا اِس کو یوں کہا جاسکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حدیبیہ کے دن مشرکین کے ساتھ تین شرطوں پر محبت فرمائی تھی؟ صلح اور پسند میں فرق نہ کرنا بہت بڑی حماقت ہے، فسادی شخص یا فسادی افراد کے ساتھ نزاع کی صورت بن جائے تو صلح ناگواری کے ساتھ ہوتی ہے جبکہ پسند اور انتخاب رغبت سے ہوتا ہے، مثلاً یوں تو کہا جاتا ہے کہ آپ کو کون پسند ہے لیکن یوں نہیں کہا جاتا کہ آپ کس کے ساتھ صلح کرنا چاہیں گے؟ کیونکہ صلح تو اُسی کے ساتھ ہی کرنا ہوتی ہے جس کے ساتھ تنازع ہو، تاکہ نقصان سے بچا جاسکے، لہٰذا صلح اور پسند میں جو فرق ہے اُسے ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

لفظ صُلح کی لغوی اور اصطلاحی تعریف

صلح اور پسند میں فرق نہ کرنے والے لوگوں کو چاہیئے کہ وہ ذرا صلح کی تعریف میں بھی غور فرمالیں۔ مولانا عبدالحفیظ بلیاوی لکھتے ہیں:

''صُلُح (ک ف ن) صَلاحًا وَصُلُوحًا وَصَلاحِيَةً، درست ہونا فساد کا زائل ہونا''۔

(مصباح اللغات ص ٤٧٦)

یعنی صلح فساد کی ضد ہے، لفظِ صلح کی لغوی اور اصطلاحی تعریف اکٹھے یوں کی گئی ہے:

الصُّلْحُ: بِالضَّمِّ وَسُكُوْنِ اللَّامِ فِي اللُّغَةِ اِسْمٌ مِنَ الْمُصَالَحَةِ خِلافُ الْمُخَاصَمَةِ مَأْخُوْذٌ مِنَ الصِّلاحِ، وَهُوَ الِاسْتِقَامَةُ. يُقَالُ صَلَحَ الشَّيْءُ إِذَا

زَالَ عَنْهُ الْفَسَادُ. وَفِي الشَّرِيْعَةِ عَقْدٌ يَرْفَعُ النِّزَاعَ أَيْ يَكُوْنُ الْمَقْصُوْدُ وَالْغَرَضُ مِنْهُ رَفْعُ النِّزَاعِ.

''صلح ''ص'' کے پیش اور ''ل'' کی جزم سے لغت میں مصالحت کا اسم ہے جو کہ مخاصمت کی ضد ہے۔ یہ صلاح سے ماخوذ ہے اور استقامت کی ایک حالت ہے۔ جب کسی چیز سے فساد زائل ہو جائے تو کہا جاتا ہے: چیز درست ہو گئی، اور شریعت میں ایسے معاہدہ کو صلح کہتے ہیں جس سے تنازع ختم ہو جائے، یعنی اُس معاہدہ کا مقصود اور غرض وغایت نزاع کا رفع کرنا ہوتا ہے''۔

(موسوعة كشاف اصطلاحات الفنون ج۲ ص۱۰۹۵؛ البناية في شرح الهداية للعيني ج۱۰ ص۳؛ بهار شريعت، تخريج شده، ج۲ (ب) ص۱۱۳۲، مكتبة المدينة، كراچی)

کویتی حکومت کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والے فقہی انسائیکلوپیڈیا (**الموسوعة الفقهية**) میں کتاب وسنت اور اجماعِ امت سے صلح کے مستحسن ہونے پر کلام کرنے کے بعد قیاس کی روشنی میں بھی بات کی گئی ہے۔ چنانچہ اُس موسوعہ کے مرتبین علماء کی جماعت لکھتی ہے:

وَأَمَّا الْمَعْقُوْلُ: فَهُوَ أَنَّ الصُّلْحَ رَافِعٌ لِفَسَادٍ وَاقِعٍ، أَوْ مُتَوَقَّعٍ بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ، إِذْ أَكْثَرُ مَا يَكُوْنُ الصُّلْحُ عِنْدَ النِّزَاعِ، وَالنِّزَاعُ سَبَبُ الْفَسَادِ، وَالصُّلْحُ يَهْدِمُهُ وَيَرْفَعُهُ، وَلِهٰذَا كَانَ مِنْ أَجَلِّ الْمَحَاسِنِ.

''عقلی طور پر صلح مومنین کے مابین واقع شدہ فساد یا متوقع فساد کو رفع کرنے والی ہوتی ہے، کیونکہ صلح اکثر نزاع کے وقت ہوتی ہے اور نزاع باعثِ فساد ہوتا ہے اور صلح اُس کو رفع دفع کر دیتی ہے، اسی لیے اِس کا شمار بڑی نیکیوں میں ہوتا ہے''۔

(الموسوعة الفقهية ج۲۷ ص۳۲۵، ۳۲۶)

مصلح کون اور مفسد کون؟

ذرا غور فرمائیے کہ تعریف کس چیز کی کی گئی؟ صلح کی۔ صلح کی ضد کیا ہے؟ فساد۔ جب صلح کی ضد فساد

ہے تو پھر امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام اور معاویہ کے مابین جو صلح ہوئی اُس میں کھلے فساد یا چھپے ہوئے فساد کا خدشہ کس جانب سے تھا؟ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ مفسد کون تھا اور مصلح کون؟ ظاہر ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "لَعَلَّ اللّٰهَ اَنْ يُّصْلِحَ بِهٖ" (یقیناً اللہ تعالیٰ اِس کے ذریعے صلح کرائے گا) میں ضمیرِ واحد جس کی شان میں استعمال فرمائی ہے وہی ہستی مصلح تھی اور اُن کا مدمقابل مفسد۔

یہاں کسی کو خیال پیدا ہوسکتا ہے کہ چونکہ یہ تنازع تھا، لہٰذا فساد کی نسبت دونوں طرف ہوسکتی ہے، لیکن یہ شیطانی خیال ہے، کیونکہ حدیث شریف میں سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی طرف صلح اور اصلاح کی نسبت کی گئی ہے، لہٰذا صلح کی ضد (فساد) کی نسبت فقط دوسری طرف ہی رہے گی۔ نیز سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی طرف فساد کی نسبت اس لیے بھی نہیں ہوسکتی کہ فساد "رِجْس" ہے اور "رِجس" کو اُن سے ہمیشہ کے لیے دور کردیا گیا ہے، پھر اُن کا مبارک نام بھی فساد کی نسبت کو قبول نہیں کرتا، کیونکہ اُن کا نام "حَسَن" حکمِ الٰہی سے رکھا گیا تھا، اس لیے وہ اسم بامسمیٰ تھے، اُن کی ذات میں جہاں ح، س اور ن سے مشتق ہونے والے تمام الفاظ "حُسن، اِحسان، حَسَنَة، مُحْسِن اور حُسنیٰ" کی معنوی خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھیں وہیں وہ اُن خوبیوں کی ضد سے یکسر منزہ اور مبراء بھی تھے۔ وہ سراپا خیر و بھلائی تھے اور ازل سے یہ ہوتا آرہا ہے کہ ہمیشہ خیر و بھلائی سے شر و فساد ہی ٹکراتا ہے۔

یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام تو اپنے بابا کریم علیہ السلام کے مشن کی تکمیل کے لیے بغاوت کو کچلنے کی خاطر اُسی مسلح لشکر کو لے کر آئے تھے جس کو اُن کے بابا نے تیار کر رکھا تھا، لیکن معاویہ کیوں مسلح لشکر کے ساتھ آیا تھا؟ کیا وہ اب بھی قصاصِ عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے آیا تھا؟ اگر جواب اثبات میں ہو تو پھر اِس کا ثبوت چاہیئے۔ اگر ثبوت کوئی نہیں تو پھر ماننا پڑے گا کہ معاویہ بن ابی سفیان کی ساری تگ و دو صرف اور صرف دنیا کے لیے تھی۔

جب حقیقت یہ ہے تو پھر یہ کس قدر مضحکہ خیز بات ہے کہ کہا جاتا ہے امام حسن علیہ السلام نے معاویہ کی اہلیت کے پیشِ نظر اُس کو اختیار فرمایا تھا؟ ارے میاں! امام پاک نے معاویہ کو اختیار نہیں فرمایا تھا بلکہ صلح کو اختیار فرمایا تھا۔ کیا فساد اور مفسد کو بھی اختیار کیا جاتا ہے؟ صلح میں اصل ہدف فریقین کے جان و مال کا تحفظ

اور امن کا حصول ہوتا ہے، اور ہدف کے حصول کے لیے کبھی کبھی مشکل اور ناخوش گوار مراحل سے بھی گذرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ کبھی حالیہ فوائد کے حصول کے لیے اور کبھی مستقبل میں فوائد کے حصول کے لیے اہل قبلہ سے تو کیا کھلے کفار سے بھی صلح و سمجھوتہ کرنا پڑ جاتا ہے۔ چنانچہ علامہ عینی حنفی رحمۃ اللہ علیہ ایک حدیث کی تشریح میں لکھتے ہیں:

قَالَ أَصْحَابُنَا: يَجُوزُ الصُّلْحُ مَعَ الْكُفَّارِ بِمَالٍ يُؤْخَذُ مِنْهُمْ أَوْيُدْفَعُ إِلَيْهِمْ ، إِذَا كَانَ الصُّلْحُ خَيْراً فِي حَقِّ الْمُسْلِمِينَ.

''ہمارے ائمہ احناف نے کہا ہے: کفار کے ساتھ صلح کرنا اُن سے کچھ مال لے کر یا اُنہیں کچھ مال دے کر جائز ہے، بشرطیکہ وہ صلح مسلمانوں کے حق میں بہتر ہو''۔

(عمدة القاري ج١٤ ص١٨ ،وط: ١٤ ص ٢٤)

اوپر جو بحوالہ بخاری مشرکین مکہ کے ساتھ سید العالمین ﷺ کی صلح کا ذکر ہو چکا ہے، کیا یہ سمجھنا درست ہوگا کہ اُس صلح میں آقا نے مشرکین کو اختیار فرمایا تھا؟ ہرگز نہیں، بلکہ اُن کی یکطرفہ شرائط کو قبول کر کے اُنہیں دفع کیا تھا اور صلح کو اختیار فرمایا تھا۔

فسادی اور فساد کو اختیار کیا جاتا ہے یا دفع ؟

صلح کی تعریف میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ اس سے مقصود نزاع اور فساد کو ختم کرنا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ فساد تب ختم ہوتا ہے جب مفسد کو دفع کیا جائے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جب مفسد کو مار کر بھگایا جائے تو پھر وہ صلح کیا ہوئی؟ لامحالہ فسادی شخص کو کچھ دے دلا کر ہی دفع کیا جاتا ہے، لہٰذا خود ہی فرمایئے کہ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے کس طرح اپنے مدمقابل مفسد شخص کو دفع کیا تھا؟ فی الجملہ یہ کہ مفسد کو دفع کیا جاتا ہے اور صلح کو اپنایا جاتا ہے، اور صلح کے معاملات کسی گروہ کے سرغنہ شخص کے ساتھ ہی طے کیے جاتے ہیں اور اُن شرائط کو طے کرتے وقت جانبین کے عوام کا مفاد مدنظر ہوتا ہے۔ چنانچہ جب کسی غیر مسلم سرغنہ سے صلح کے امور طے پا رہے ہوں تو اُس وقت اُس غیر مسلم کی ذات مدنظر نہیں ہوتی بلکہ وہی تو باعث نزاع ہوتا ہے لیکن شرائطِ صلح پھر بھی اُسی کے ساتھ طے ہوتی ہیں، معاہدہ بھی اُسی کے ساتھ کیا جاتا ہے اور دستخط بھی اُسی کے ہوتے ہیں۔

دیکھئے! نبی کریم ﷺ نے حدیبیہ کے موقع پر جن کفار کے ساتھ صلح کی تھی اُنہیں یہ بات بھی گوارا نہیں تھی کہ لکھا جائے "هٰذَا مَا قَاضٰى عَلَيْهِ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" اُنہوں نے کہا تھا: "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" کی بجائے "مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ" لکھا جائے۔ آقا کریم ﷺ نے فرمایا: جو یہ کہتے ہیں وہی لکھ دو۔ اِس کے باوجود آقا کریم ﷺ نے صلح کا معاملہ اُن ہی کے ساتھ طے فرمایا تھا۔ بتایئے! کیوں؟ کیا کفر کے سرغنہ لوگ آپ کا مقصود تھے؟ نہیں بلکہ جانبین کے عوام کا تحفظ اور مستقبل میں کچھ لوگوں کے ایمان واسلام کی اُمید آپ کا مقصود تھا۔

امام حسن کو فساد کا امکان نہیں یقین تھا

امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے جس شخص کے فساد کو دفع کرنے کی خاطر اُس کے ساتھ صلح فرمائی تھی، اُس کا مفسد ہونا اُن کے نزدیک مبہم نہیں تھا بلکہ یقینی تھا، کیونکہ وہ اُس کے فساد کا مشاہدہ اپنے بابا کریم سیدنا علی علیہ السلام کے دور میں کر چکے تھے۔ اُس شخص نے اُن کے بابا کے خلاف بغاوت وخروج کیا تھا اور بغاوت وخروج امن نہیں فساد ہی ہوتا ہے۔ شاید بعض عاشقانِ طلقاء کے ذہن میں خیال پیدا ہو کہ راقم الحروف بڑا گستاخ ہے کہ ایک صحابی کی طرف فساد کی نسبت کر رہا ہے، تو جناب یہ کوئی گستاخی نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ بغاوت فساد ہی ہوتی ہے اصلاح نہیں۔ اگر یقین نہ آئے تو آیئے میرے علاوہ ایک آدھ اور شخص کے کلام میں ہی غور فرما لیجئے۔ ملا علی قاری لکھتے ہیں:

أَمَّا مُعَاوِيَةُ وَأَتْبَاعُهُ فَيَجُوزُ نِسْبَتُهُمْ إِلَى الْخَطَأِ وَالْبَغْيِ وَالْخُرُوْجِ وَالْفَسَادِ ، وَأَمَّا لَعْنُهُمْ فَلَا يَجُوْزُ أَصْلاً.

"معاویہ اور ان کے پیروکاروں کی طرف خطا، بغاوت، خروج، اور فساد کی نسبت کرنا تو جائز ہے، مگر اُن پر لعنت کرنا جائز نہیں"۔

(شرح الشفا للقاري ج۲ ص۵۵٦)

معلوم ہوا کہ سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے اپنے سابقہ تجربہ کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک فسادی شخص کو اُس کا مطلوب دے کر اُس کو اور اُس کے فساد کو تو دفع کیا تھا البتہ صلح کو اختیار فرمایا تھا۔

صلح کے باوجود مکر وخدع کا خدشہ

صلح کچھ دے دلا کر ہو یا کچھ دیے بغیر ہو، بڑے اور اہم معاملات میں صلح کے باوجود بھی خدشات وتحفظات باقی رہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں صلح کی طرف مائل ہونے کا حکم فرمایا ہے وہیں اُس علیم بذات الصدور جل جلالہ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اگر تمہیں فریقِ مخالف کی جانب سے دھوکہ دہی اور منافقت کا خدشہ ہو تو مجھ پر بھروسہ کر کے صلح کر لو۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

وَإِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ.
وَإِنْ يُّرِيْدُوْا أَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَإِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ.

''اور اگر وہ مائل ہوں صلح کی طرف تو آپ بھی مائل ہو جایئے اُس کی طرف اور بھروسہ کیجئے اللہ تعالیٰ پر، بیشک وہی سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔ اور اگر وہ ارادہ کریں کہ آپ کو دھوکہ دیں تو بیشک کافی ہے آپ کو اللہ تعالیٰ''۔

(الأنفال: ٦٢)

ظاہر ہے کہ جب ایک طرف سے دھوکہ دہی کا امکان باقی ہو تو دوسری طرف بھی خدشات باقی رہتے ہیں۔ خود سوچئے کہ دل میں جب ایسے خدشات باقی ہوں تو جس شخص کے ساتھ صلح کی گئی ہو وہ پسندیدہ کیونکر ہو سکتا ہے؟ جبکہ زیر بحث صلح کے بارے میں تو صحیح احادیث میں آ چکا ہے کہ صلح ہو گی مگر دلوں میں کدورت باقی رہ جائے گی۔ کیا بیک وقت محبت و کدورت کا اجتماع ممکن ہے؟

جانبین سے کدورت تھی، اب مسلم کیا کرے؟

اگر اجتماعِ کدورت ومحبت ممکن نہیں تو پھر بتایئے کہ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے صلح کے باوجود جس شخص کو ناپسندیدہ سمجھا اور وہ شخص بھی امام پاک کو ناپسندیدہ سمجھتا رہا حتیٰ کہ اُن کی شہادت پر خوش ہوا اور اُس کی مجلس میں امام پاک کو انگارا کہا گیا تو وہ ٹس سے مس نہ ہوا، تو جانبین کی اِس ناپسندیدگی پر ایک مومن کو کیا کرنا چاہیئے؟ آیا مومن شخص ''أَصْحَابِيْ كَالنُّجُوْمِ'' والی روایت کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک صحابی کی اتباع

میں سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے بارے میں اپنے دل میں کدورت رکھے یا متعدد احادیثِ صحیحہ کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک قطعی انعام یافتہ اور قطعی جنتی سردار ہستی کی پیروی میں اُس شخص سے مجتنب رہے جس کے نزدیک امام پاک ناپسندیدہ تھے اور وہ امام پاک کے نزدیک ناپسندیدہ تھا؟ صحابہ، طلقاء اور دوسرے لوگوں کے لیے شرطِ ایمان کس کی محبت ہے؟ اِس سوال کا جواب دینا اُن لوگوں پر لازم ہے جو صلحِ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کو بعض طلقاء کی اہلیت و پسندیدگی کی دلیل سمجھتے ہیں۔

وجوہِ صلح

سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام صلح کے لیے کیوں آمادہ ہوئے تھے؟ آیا اُنہوں نے اپنے لشکر کی کمزوریوں اور بے وفائیوں سے دل برداشتہ ہو کر از خود معاویہ کو صلح کی پیش کش کی تھی، یا صلح کی پیش کش معاویہ نے کی تھی اور امام پاک نے قبول فرمائی تھی؟

اِس سلسلے میں اکثر کتب تاریخ یہ بتاتی ہیں کہ امام پاک نے اپنے لوگوں کی زیادتیوں اور کمزوریوں کی وجہ سے از خود صلح کی پیش کش کی تھی، حتیٰ کہ کتبِ تاریخ میں یہاں تک مرقوم ہے کہ امام پاک علیہ السلام نے معاویہ سے فقط صلح ہی نہیں چاہی تھی بلکہ اپنے لیے امان بھی مانگی تھی۔ مثلاً تاریخ الطبری میں ایک روایت میں پہلے یہ مرقوم ہے کہ سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ کوفہ سے مدائن تشریف لائے اور اُنہوں نے قیس بن سعد رضی اللہ عنہ کی سرپرستی میں بارہ ہزار افراد پر مشتمل ایک لشکر بھیجا تھا۔ امام پاک مدائن میں تشریف فرما تھے کہ کسی نے پکار کر کہا: قیس بن سعد قتل کر دیے گئے، لہٰذا بھاگ نکلو۔ لوگوں نے دوڑ لگا دی، امام پاک کا خیمہ اُکھاڑ دیا حتیٰ کہ جس چادر پر امام پاک تشریف فرما تھے وہ بھی آپ کے نیچے سے کھینچ لی گئی۔ امام پاک وہاں سے اُٹھے اور قصر ابیض میں جا بیٹھے، وہاں یہ کھسر پھسر ہونے لگی کہ امام پاک کو پکڑ کر معاویہ کے سپرد کر دیا جائے اور اُن کے بدلہ میں مال و عزت حاصل کی جائے۔ آگے لکھا ہے:

فَلَمَّا رَأَى الْحَسَنُ علیہ السلام تَفَرُّقَ الْأَمْرِ عَنْهُ بَعَثَ إِلٰى مُعَاوِيَةَ يَطْلُبُ الصُّلْحَ.

”سیدنا امام حسن علیہ السلام نے جب دیکھا کہ معاملہ اُن کے ہاتھ سے نکل چکا ہے تو

اُنہوں نے معاویہ کے پاس صلح کے لیے آدمی بھیجا"۔

اِس سے اگلی روایت میں ایک جملہ یوں آیا ہے:

وَكَتَبَ الْحَسَنُ إِلَى مُعَاوِيَةَ فِي الصُّلْحِ وَطَلَبِ الْأَمَانِ.

"امام حسن نے معاویہ کی طرف صلح کے بارے میں لکھا اور امان طلب کی"۔

(تاريخ الطبري ج٥ ص١٥٩، ١٦٠؛ الكامل في التاريخ ج٣ ص٥)

یہ جملے یا تو درست نہیں ہیں یا پھر یہ اُس وقت کے بعض سامعین وحاضرین کے اندازوں پر مبنی ہیں۔ اِن جملوں کے نادرست ہونے کے کچھ دلائل تو خود کتبِ تاریخ میں موجود ہیں اور کچھ کتبِ حدیث میں، مثلاً بعض کتبِ تاریخ میں ہے کہ سیدنا علی علیہ السلام نے معاویہ کی عہد شکنی کے باعث دوبارہ اُس کی بغاوت کو کچلنے کے لیے جو لشکر تیار کیا تھا اُس کی تعداد چالیس ہزار سے زائد تھی اور وہی لشکر سیدنا امام حسن علیہ السلام کی معیت میں تھا۔ علماء تاریخ نے لکھا ہے:

وَبَايَعَهُ أَكْثَرُ مِنْ أَرْبَعِينَ أَلْفًا، كَانُوا قَدْ بَايَعُوا أَبَاهُ عَلَى الْمَوْتِ، وَكَانُوا أَطْوَعَ لِلْحَسَنِ وَأَحَبَّ لَهُ.

"چالیس ہزار سے زائد لوگوں نے اُن کی بیعت کی، یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے اُن کے بابا کریم علیہ السلام کے ہاتھ پر موت کی بیعت کی تھی، اور وہ لوگ سیدنا امام حسن علیہ السلام کے زیادہ مطیع اور زیادہ محب تھے"۔

(أسد الغابة ج٢ ص١٨؛ التبيين في أنساب القرشيين لابن قدامة ص١٠٥؛ مرآة الزمان لسبط ابن الجوزي ج٧ ص٨، ٩؛ تاريخ الإسلام للذهبي ج٤ ص٦)

حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اِس لشکر نے مولیٰ علی علیہ السلام کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، امام حسن جنگ کا ارادہ نہیں رکھتے تھے لیکن یہ لشکر اُن کی رائے پر غالب آ گیا تھا۔ ابن کثیر اس لشکر کی کثرت کے بارے میں لکھتے ہیں:

فَاجْتَمَعُوا اجْتِمَاعًا عَظِيمًا لَمْ يُسْمَعْ بِمِثْلِهِ.

''اُنہوں نے ایسا عظیم لشکر جمع کرلیا تھا جس کی مثال نہیں سنی گئی''۔

(البداية والنهاية ج ۱۱ ص ۱۳۱، ۱۳۲)

اِس عظیم لشکر کی خواہش یہ تھی کہ معاویہ کے ساتھ جنگ کی جائے۔ چنانچہ امام پاک نے اپنے خطبہ میں جب اُنہیں یہ فرمایا تھا:

''تمہارا کام سننا اور اطاعت کرنا ہے۔ تم اُس سے صلح کرو گے جس سے میں صلح کروں گا اور اُس سے جنگ کرو گے جس سے میں جنگ کروں گا تو وہ شک میں پڑ گئے تھے اور آپس میں کہنا شروع کردیا تھا:

مَا هٰذَا لَكُمْ بِصَاحِبٍ ، وَمَا يُرِيْدُ الْقِتَالَ.

''یہ تمہارے مطلب کے آدمی نہیں اور یہ جنگ کا ارادہ نہیں رکھتے''۔

(تاريخ الطبري ج ٥ ص ١٦٢؛ مرآة الزمان ج ٧ ص ٨؛ تاريخ ابن خلدون ج ٢ ص ٦٤٨)

لہٰذا اُس دور کے بعض حاضرین کا یا بعد والے لوگوں کا یہ سمجھنا کہ امام پاک علیہ السلام نے اپنے لشکر کی سردمہری کی وجہ سے ازخود صلح کی پیش کش فرمائی تھی یا معاویہ سے امان چاہی تھی، سراسر غلط ہے۔ صحیح بات وہ ہے جو کتبِ حدیث میں مذکور ہے۔ بخاری شریف میں ہے کہ صلح کی پیش کش معاویہ کی طرف سے کی گئی تھی جسے امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے شرائط کے ساتھ قبول فرمایا تھا۔ بخاری کی یہ حدیث ہم کتاب کے آغاز میں نقل کرچکے ہیں، جس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ معاویہ کی طرف سے صلح کی یہ پیش کش امام پاک کے لشکر کی کثرت کو مدنظر رکھتے ہوئے کی گئی تھی۔ بعض دوسری احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ امام پاک علیہ السلام نے بھی یہ پیش کش کس مپرسی کی حالت میں نہیں بلکہ ایسے ماحول میں قبول فرمائی تھی جب لشکر اور گردوپیش کا معاملہ اُن کے کنٹرول میں تھا۔ چنانچہ درجِ ذیل سوال وجواب سے یہی حقیقت عیاں ہوتی ہے۔ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ حضرت جبیر بن نفیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

قُلْتُ لِلْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ: إِنَّ النَّاسَ يَقُوْلُوْنَ إِنَّكَ تُرِيْدُ الْخِلَافَةَ فَقَالَ: قَدْ كَانَ جَمَاجِمُ الْعَرَبِ فِي يَدَيَّ ، يُحَارِبُوْنَ مَنْ حَارَبْتُ وَيُسَالِمُوْنَ مَنْ

سَالَمْتُ تَرَكْتُهَا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللّٰهِ تَعَالٰى وَحَقْنِ دِمَاءِ أُمَّةِ مُحَمَّدٍ ﷺ.

''میں نے سیدنا حسن بن علی ؓ سے عرض کیا: لوگ کہتے ہیں کہ آپ خلافت کے خواہاں ہیں۔ فرمایا: عرب کی گردنیں میرے قبضے میں تھیں، میں جس سے جنگ کرتا وہ اُس سے جنگ کرتے اور میں جس سے صلح کرتا وہ اُس سے صلح کرتے۔ میں نے تو اقتدار کو اللہ تعالیٰ کی رضا اور سیدنا محمد ﷺ کی امت کے خون کے تحفظ کی خاطر چھوڑا ہے''۔

(المستدرك، كتاب معرفة الصحابة، ومن فضائل الحسن بن علي بن أبي طالب ؓ ج۳ ص ۱۸۶ حديث ۴۷۹۵؛ حلية الأولياء ج۲ ص ۳۷؛ سير أعلام النبلاء ج۳ ص ۲۷۴؛ تاريخ الخلفاء للسيوطي ص ۳۱۸؛ المواهب اللدنية ج۳ ص ۵۶۷)

امام حاکم نے اِس حدیث کو بخاری اور مسلم کی شرط کے مطابق صحیح قرار دیا ہے اور امام ذہبی نے اُن کی تائید فرمائی ہے۔

سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی فراست

ہر چند کہ امام کا لشکر عظیم تھا اور وہ لشکر چاہتا بھی تھا کہ معاویہ کے خلاف جنگ کی جائے مگر امام پاک دیکھ رہے تھے کہ اُن کے لشکر کے کچھ لوگ تھک چکے تھے اور اُن میں سے بعض کے حوصلے پست بھی ہو گئے تھے اور اُن کے دینی جذبہ میں بھی کچھ کمی آ گئی تھی، اور چونکہ اُس وقت اہل اسلام کے ساتھ جنگ کرنے کی صورت میں مالی فوائد کا کوئی تصور نہیں تھا، جبکہ فریقِ مخالف اپنی فوج کو ہر حال میں نوازتا تھا اور اُن کے ہاں حلال وحرام اور جائز و ناجائز کی کوئی پروا نہیں کی جاتی تھی، اور لشکر کی پست ہمتی کی صورتِ حال تو خود سیدنا علی ؓ کی حیات میں بھی پیدا ہو گئی تھی، کیونکہ لشکرِ شام اہل اسلام کا مال بھی اُسی طرح لوٹتا تھا جس طرح اہل کفر کا لوٹا جاتا تھا، اور وہ مسلم خواتین کو اُسی طرح لونڈیاں بناتے اور اُنہیں فروخت کرتے تھے جس طرح کفار کی عورتوں کو بنایا جاتا تھا۔ اِن وجوہات کی بنا پر شامی فوج ہر لڑائی میں دلچسپی لیتی تھی، جبکہ دوسری جانب ہر ہر قدم کتاب وسنت کے مطابق اٹھانے کی پابندی تھی اس لیے لشکرِ حق کے جذبات میں کچھ کمی آ گئی تھی۔ قرآنی

تصریح کے مطابق جہادی جذبہ کی یہ کمی تو خود حضور اکرم ﷺ کی حیات میں بھی بعض صحابہ کرام ؓ میں آ گئی تھی، تفصیل ہماری کتاب "الأحاديث الموضوعة في فضائل معاوية" میں ''شامیوں کی چستی اور عراقیوں کی سستی کا راز'' کے عنوان کے تحت ملاحظہ فرمائیں۔

فی الجملہ یہ کہ امام پاک نے دو اہم وجوہ کے پیش نظر جنگ سے اجتناب فرمایا:

۱۔ اپنی فوج کی کمزوری کی وجہ سے مطلوبہ نتیجے کے حصول کا مشکوک ہونا

۲۔ جانبین سے بہت زیادہ خون بہہ جانا

اِس کے علاوہ قتال سے مجتنب رہنے کی اور بھی وجوہ ہو سکتی ہیں لیکن اُن وجوہ میں ایسی وجہ قطعاً کوئی نہیں ہے جس کا معاویہ کی اہلیت وصلاحیت سے تعلق ہو۔ امام پاک معاویہ کو اتنا ہی برا سمجھتے تھے جتنا اُس کو اُن کے والد گرامی سیدنا علی علیہ السلام برا سمجھتے تھے اور اُنہیں اپنے بابا کریم علیہ السلام کے اقدام کی صحت پر کسی قسم کا قطعاً کوئی شک نہیں تھا۔ اِس کی تفصیل درجِ ذیل عنوان کے تحت ملاحظہ فرمایئے۔

امام حسن مجتبیٰ اور مولا مرتضیٰ کی یقینی ہم آہنگی

کچھ لوگ تو امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے صلح قبول کرنے کو معاویہ کی اہلیت وصلاحیت کی دلیل سمجھتے ہیں، جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں جبکہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اُن کی صلح کی وجہ یہ ہے کہ اُن کے نزدیک اُن کے والد کے اقدامات درست نہیں تھے۔ یہ دونوں قسم کے لوگ یا تو حماقت وغوایت کا شکار ہیں یا پھر عمداً مغالطہ آفرینی سے کام لیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے نزدیک نہ تو اُن کے والد گرامی علیہ السلام کا موقف کمزور یا نادرست تھا اور نہ ہی اُن کے نزدیک معاویہ قابلِ خلافت تھا، البتہ حالات بدل گئے تھے اور مجبوریاں حائل ہو گئی تھیں۔ ہر چند کہ امام کا لشکر مجتمع نظر آتا تھا اور دشمن اُس سے مرعوب بھی تھا مگر امام پاک لشکر کی اندرونی شکستہ دلی سے بے خبر نہیں تھے۔ اِس لیے اُنہوں نے دشمن کی مرعوبیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اُس سے شرائط بھی لکھوالی تھیں اور اپنے لشکر کی اندرونی کمزوری کو مدنظر رکھتے ہوئے دشمن سے صلح بھی کر لی تھی۔ گویا امام پاک کے اِس اقدام کو حکمتِ عملی اور مجبوری دونوں سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ آیئے! ذرا امام پاک کے اُس خطاب میں غور کرتے ہیں جو اُنہوں نے صلح سے قبل اپنے لشکر کو کیا تھا اور اُن کے مورال کو

جانچا تھا۔ امام ابن اثیر جزری، حافظ ابن عساکر اور امام ذہبی لکھتے ہیں:

''ہمیں ابوبکر ابن درید نے خبر دی، وہ کہتے ہیں: حضرت حسن ؓ اپنے والد امیر المومنین (علی المرتضیٰ ؓ) کی شہادت کے بعد (خطاب کے لیے) کھڑے ہوئے تو اللہ ﷻ کی حمد کے بعد فرمایا: اللہ کی قسم! ہمیں اہل شام کے متعلق کسی شک یا ندامت نے نہیں روکا بلکہ ہم اہل شام سے سلامتی اور صبر کے ساتھ لڑتے تھے مگر اب عداوت کی وجہ سے سلامتی جاتی رہی اور جزع کے سبب سے صبر چلا گیا۔ چنانچہ جب جنگِ صفین کی طرف تم بلائے جاتے تھے تو اُس وقت تمہارا دین تمہاری دنیا سے آگے تھا مگر اب تمہاری دنیا تمہارے دین سے آگے ہے۔ یاد رکھو! ہم تو اب بھی تمہارے لیے ویسے ہی ہیں جیسے تھے مگر تم ہمارے لیے ویسے نہیں رہے جیسے پہلے تھے۔ تمہارے دو طرح کے لوگ مقتول ہو چکے ہیں، کچھ تو صفین میں جن کے لیے تم گریہ کناں ہو اور کچھ نہروان میں مقتول ہوئے جن کا تم انتقام چاہتے ہو۔ جو لوگ باقی رہ گئے ہیں وہ پست ہمت ہیں اور جو رو رہے ہیں وہ پریشان ہیں۔ سنو! معاویہ نے ہمیں ایک پیش کش کی ہے جس میں عزت ہے اور نہ ہی انصاف۔ سو اگر تم موت کے خواہش مند ہو تو ہم معاویہ کی پیش کش کو مسترد کر دیتے ہیں اور معاملہ اللہ ﷻ کے سپرد کرتے ہوئے تلوار کی نوک سے فیصلہ کرتے ہیں اور اگر تم زندگی کے خواہش مند ہو تو ہم معاویہ کی پیش کش کو قبول کر لیتے ہیں، اور جس بات پر تم راضی ہو اُسی کو اختیار کر لیتے ہیں۔ پس لوگوں نے ہر طرف سے آواز دی کہ ہم باقی رہنے کے خواہش مند ہیں۔ جب سب نے متفق ہو کر یہی بات کی تو سیدنا امام حسن ؓ نے صلح منظور کر لی''۔

(أسد الغابة في معرفة الصحابة ج۲ ص۱۸، ۱۹، ومترجم اردو ج۱ ص۵۶۲؛ الکامل فی التاریخ ج۳ ص۵، ۶؛ تاریخ دمشق ج۱۳ ص۲۶۸؛ سیر أعلام النبلاء ج۳ ص۲۶۹)

سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے اِس خطبہ میں تین باتیں توجہ طلب ہیں:

۱۔ إِنَّا وَاللّٰهِ مَا ثَنَانَا عَنْ أَهْلِ الشَّامِ شَكٌّ وَلَا نَدَمٌ.

”اللہ کی قسم! ہمیں اہل شام کے متعلق کسی شک یا ندامت نے نہیں روکا“۔

۲۔ أَلَا وَإِنَّا لَكُمْ كَمَا كُنَّا ، وَلَسْتُمْ لَنَا كَمَا كُنْتُمْ.

”آگاہ رہو! ہم تو اب بھی تمہارے لیے ویسے ہی ہیں جیسے تھے مگر تم ہمارے لیے اب ویسے نہیں رہے جیسے پہلے تھے“۔

۳۔ أَلَا وَإِنَّ مُعَاوِيَةَ دَعَانَا إِلىٰ أَمْرٍ لَيْسَ فِيهِ عِزٌّ وَلَا نَصَفَةٌ.

”سنو! معاویہ نے ہمیں ایک پیش کش کی ہے جس میں عزت ہے اور نہ ہی انصاف“۔

چونکہ امام پاک علیہ السلام نے یہ تینوں جملے جنگِ صفین اور جنگِ نہروان کو مدنظر رکھتے ہوئے ارشاد فرمائے ہیں، لہٰذا معلوم ہوا کہ اُنہیں اپنے والد گرامی علیہ السلام کی اُن دونوں جنگوں کی حقانیت پر کوئی شک تھا اور نہ ہی کوئی ندامت۔ اُن کا تو اپنے والد کے بارے میں یہاں تک عقیدہ تھا کہ وہ کبھی چشم زدن کے لیے بھی شک میں مبتلا نہیں ہوئے۔ چنانچہ ایک مرتبہ اُنہوں نے سیدنا علی علیہ السلام کے بارے میں عمرو بن العاص کی نامناسب گفتگو کی تردید میں اُس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

وَاللّٰهِ إِنَّكَ لَتَعْلَمُ أَنَّ عَلِيًّا عليه السلام لَمْ يَتَرَيَّبْ فِي الْأَمْرِ ، وَلَمْ يَشُكَّ فِي اللّٰهِ طَرْفَةَ عَيْنٍ.

”اللہ کی قسم! تم بخوبی جانتے ہو کہ سیدنا علی علیہ السلام کسی معاملہ میں خوف کا شکار نہیں ہوئے اور نہ ہی اُنہوں نے چشم زدن کے برابر معاملۂ الٰہی میں شک کیا“۔

(المحاسن والمساوي للبيهقي ص ٨٠)

اِس حقیقت کو تو مشہور غاوی اور ناصبی قاضی ابوبکر ابن العربی مالکی تک نے بھی تسلیم کیا ہے، چنانچہ وہ لکھتا ہے:

أَمَّا قَوْلُ الرَّافِضَةِ أَنَّهُ عَهِدَ إِلَى الْحَسَنِ فَبَاطِلٌ ، مَا عَهِدَ إِلىٰ أَحَدٍ وَلٰكِنَّ الْبَيْعَةَ لِلْحَسَنِ مُنْعَقِدَةٌ ،وَهُوَ أَحَقُّ مِنْ مُعَاوِيَةَ وَمِنْ كَثِيرٍ مِنْ غَيْرِهِ،

وَكَانَ خُرُوُجُهُ لِمِثْلِ مَا خَرَجَ إِلَيْهِ أَبُوُهُ مِنْ دُعَاءِ الْفِئَةِ الْبَاغِيَةِ إِلَى الِانْقِيَادِ لِلْحَقِّ وَالدُّخُولِ فِي الطَّاعَةِ ، فَآلَتِ الْوِسَاطَةُ إِلَى أَنْ تَخَلّٰى عَنِ الْأَمْرِ صِيَانَةً لِحَقْنِ دِمَاءِ الْأُمَّةِ.

''رہا روافض کا قول کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے امام حسن رضی اللہ عنہ کو ولی عہد بنایا تھا تو یہ باطل ہے، اُنہوں نے کسی کو ولی عہد نہیں بنایا تھا، تاہم امام حسن رضی اللہ عنہ کی بیعت منعقد ہو گئی تھی اور وہ معاویہ اور دوسرے بہت سے لوگوں سے زیادہ حق دار تھے، اور اُن کا نکلنا اسی طرح تھا جس طرح اُن کے والد نکلے تھے، باغی گروہ کو حق کی طرف بلانے اور طاعت میں داخل کرنے کے لیے، پھر درمیان میں وساطت (کچھ لوگ) آ گئے تو امام پاک تحفظِ خونِ امت کی خاطر خلافت سے دست بردار ہو گئے''۔

(العواصم من القواصم لابن العربي المالكي ص ٣٢٤)

اس سے معلوم ہوا کہ سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نہ صرف یہ کہ اپنے بابا کریم علیہ السلام کے اقدامات کی حقانیت پر مکمل یقین رکھتے تھے بلکہ وہ اُن کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے باغیوں کو حق کی طرف لانے کے لیے نکل بھی چکے تھے۔

سوال: جب قاضی ابن العربی ناصبی تک نے تسلیم کیا ہے کہ امام پاک اپنے بابا کی طرح بغاوت کو کچلنے کی خاطر نکلے تھے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ معاویہ کیوں نکلے تھے؟ اگر کہا جائے کہ قصاص عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے نکلے تھے تو یہ مطالبہ پیش کیوں نہ کیا اور اگر مطالبہ کیا تھا تو قبل از قصاص صلح کی پیش کش کیوں کی تھی؟

اہل بیت محفوظ یا معصوم؟

امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اُن کے والد کبھی شک سے دوچار نہیں ہوئے۔ میں عرض کرتا ہوں: بھلا وہ ہستی کسی معاملہ میں شک وتذبذب کا شکار کیونکر ہو سکتی تھی جن کے حق میں زبانِ نبوی ﷺ سے دعا صادر ہوئی کہ وہ جدھر بھی رُخ فرمائیں حق اُدھر ہو جائے۔ غور فرمایئے! دعا یوں نہیں مانگی گئی کہ جدھر حق ہو اُنہیں اُدھر پھیر دے بلکہ دعا یہ کی گئی کہ جدھر وہ رُخ فرمائیں حق اُدھر ہو جائے۔ چونکہ ایسی انوکھی دعائیں

فقط اہل بیت کرام علیہم السلام کے لیے ہی مانگی گئیں اسی لیے بعض علماء اہل سنت نے متشدد ہونے کے باوجود اِس قسم کی دعاؤں کو اہل بیت کرام علیہم السلام کی عصمت کی دلیل قرار دیا ہے۔ چنانچہ مشہور متنازع کتاب ''تقویۃ الإیمان'' کے مصنف شاہ محمد اسماعیل شہید فاروقی لکھتے ہیں:

''مقاماتِ ولایت میں سے ایک مقامِ عظیم عصمت ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ عصمت کی حقیقت حفاظتِ غیبی ہے جو معصوم کے تمام اقوال، افعال، اخلاق، احوال، اعتقادات اور مقامات کو راہِ حق کی طرف کھینچ کر لے جاتی ہے اور حق سے روگردانی کرنے سے مانع ہوتی ہے۔ یہی حفاظت جب انبیاءؑ سے متعلق ہو تو اُسے عصمت اور اگر کسی دوسرے کامل سے متعلق ہو تو اُسے حفظ کہتے ہیں۔ پس عصمت اور حفظ حقیقت میں ایک ہی چیز ہے لیکن ادب کے لحاظ سے عصمت کا اطلاق اولیاء اللہ پر نہیں کرتے۔

حاصل یہ کہ اِس مقام میں مقصود یہ ہے کہ یہ حفاظت غیبی جیسا کہ انبیائے کرام کے متعلق ہے ایسا ہی اُن کے بعض اکابر متبعین کے متعلق ہوتی ہے۔...... اور نبی ﷺ نے حضرت علیؑ کے حق میں دعا کی:

اَللّٰهُمَّ أَدِرِ الْحَقَّ مَعَهُ حَيْثُ دَارَ.

اے اللہ! جس جگہ علی جائے اُس کے ساتھ حق جاری رکھ۔

اور فرمایا:

اَلْقُرْآنُ مَعَ عَلِيٍّ وَعَلِيٌّ مَعَ الْقُرْآنِ.

قرآن علی کے ساتھ ہے اور علی قرآن کے ساتھ۔

اور فرمایا:

إِنِّي تَارِكٌ فِيكُمُ الثَّقَلَيْنِ: كِتَابَ اللّٰهِ وَ عِتْرَتِي أَهْلَ بَيْتِي، وَلَنْ يَّتَفَرَّقَا حَتَّىٰ يَرِدَا عَلَيَّ الْحَوْضَ.

میں تم میں دو بھاری چیزیں چھوڑتا ہوں: ایک تو کتاب ہے اور دوسری میرے اہل بیت

اور یہ دونوں تم سے جدا نہ ہوں گے حتیٰ کہ حوضِ کوثر پر آئیں گے"۔

(منصبِ امامت ص ٦٦، ٦٧، ٦٨)

شاہ اسماعیل شہید کے اِس طویل اقتباس میں سے پہلے حسبِ ذیل الفاظ میں غور فرمائیے:

"عصمت کی حقیقت حفاظتِ غیبی ہے جو معصوم کے تمام اقوال، افعال، اخلاق، احوال، اعتقادات اور مقامات کو راہِ حق کی طرف کھینچ کر لے جاتی ہے"۔

پھر اُن کی درج کردہ سنن ترمذی کی اِس حدیث میں غور فرمائیے!

اَللّٰھُمَّ اَدِرِ الْحَقَّ مَعَهٗ حَیْثُ دَارَ.

"اے اللہ! جس جگہ علی جائے اُس کے ساتھ حق جاری رکھ"۔

پھر اِن دونوں باتوں کا نتیجہ نکالتے ہوئے بتائیے کہ شاہ صاحب کے اِن الفاظ: "عصمت کی حقیقت حفاظتِ غیبی ہے جو معصوم کے تمام اقوال، افعال، اخلاق، احوال، اعتقادات اور مقامات کو راہِ حق کی طرف کھینچ کر لے جاتی ہے" میں اور سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے مذکورہ بالا الفاظ کے نتیجے میں کیا فرق ہے؟ یعنی کسی کا چشم زدن کے لیے بھی شک و تذبذب میں مبتلا نہ ہونا اور کسی کا معصوم ہونا، اِن دونوں باتوں میں کیا فرق ہے؟

محفوظ الاقوال والافعال کا معاویہ کے بارے میں موقف

جب یہ ثابت ہو گیا کہ سیدنا مولیٰ علی علیہ السلام چشمِ زدن کے لیے بھی کسی معاملہ میں تذبذب اور شک کا شکار نہیں ہوئے اور اُن کے تمام اقوال، افعال، اخلاق، احوال، اعتقادات اور مقامات محفوظ و معصوم تھے تو پھر یہ حقیقت اِس سے قبل بیان ہو چکی ہے کہ اُن کے نزدیک معاویہ لائقِ خلافت بھی نہیں تھا اور خلیفۂ برحق کے حکم سے سرتابی کرنے کی وجہ سے باغی بھی تھا، اور چونکہ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے نزدیک اُن کے بابا کے تمام اقدامات ہر لحاظ سے شکوک و شبہات سے منزہ و مبراء تھے اِسی لیے اُن کے نزدیک بھی معاویہ کا خلافت کے لیے نااہل ہونا اور باغی ہونا متحقق ہو گیا۔ جب آپ پر یہ حقیقت عیاں ہو گئی تو اب ایک مرتبہ "الکامل فی اللغة والأدب للمبرد" اور دوسرے حضرات کی وہ عبارت ضرور پڑھ لیجئے جس میں ہے کہ امام حسن

مجتبیٰ علیہ السلام صلح کے باوجود معاویہ کو خوارج سے بھی زیادہ برا سمجھتے تھے۔ وہ عبارت آئندہ صفحات میں ان شاء اللہ تعالیٰ "معیارِ اہلبیت میں صحابہ رضی اللہ عنہ اور بعض علماءِ ہند میں اختلاف" کے عنوان کے تحت آئے گی۔

شاید یہاں کسی کے پیٹ میں مروڑ اُٹھے کہ یہ کھینچ تان کر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو محفوظ الاقوال بنایا گیا ہے تو ہم ایسے شخص کو کہتے ہیں کہ بخاری شریف میں سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے محفوظ الاقوال فرمایا ہے اور اُنہوں نے معاویہ اور اُس کے پیروکاروں کو باطل اور ضلالت پر قرار دیا تھا۔

امام حسین علیہ السلام کے ہاں مقامِ معاویہ

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سیدنا امام حسین علیہ السلام کا موقف بھی نقل کر دیا جائے۔ دورِ معاویہ میں مدینہ منورہ میں مختلف لوگ سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ سے ملاقات کرنے کے لیے آتے رہتے تھے، درآنحالیکہ وہاں کا گورنر مروان بن الحکم تھا، اُس نے خطرہ محسوس کیا تو معاویہ کو خط لکھ بھیجا۔ یہاں ہم اُس خط کو اہل حدیث عالم مولانا محمد اسحاق مدنی کے وضاحتی ترجمہ کے ساتھ نقل کر رہے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> "مروان نے مدینہ سے معاویہ کو خط لکھا کہ مجھے یہ ڈر ہے کہ حسین علیہ السلام بغاوت کریں گے اور مقابلہ بہت بڑا ہوگا۔ اس پر معاویہ نے امام حسین علیہ السلام کو خط لکھا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب تم کسی سے معاہدہ کرو تو پورا کرو۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ کوفہ کے لوگ تمہارے پاس آتے ہیں اور تجھے دعوت دیتے ہیں کہ تو ہمارے خلاف اٹھے۔ عراقیوں کو تم جانتے ہو کہ تمہارے باپ اور بڑے بھائی سے انہوں نے کیا سلوک کیا۔ حسین اللہ سے ڈر اور معاہدہ پر قائم رہ! پھر دھمکی دیتے ہوئے لکھا کہ اگر تم میرے خلاف کوئی چال چلو گے تو میں بھی چال چلوں گا۔
>
> سیدنا حسین علیہ السلام نے جواب دیتے ہوئے لکھا: تیرا خط ملا ہے، جو باتیں تم نے لکھی ہیں میں ان میں سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا، میں بھائی کے معاہدہ پر قائم ہوں اور نیکی کا راستہ اللہ تعالیٰ سجھاتا ہے۔ فی الحال تیرے ساتھ نہ میرا کوئی جنگ کا ارادہ ہے نہ خلاف اٹھنے کا مگر تیرے خلاف جہاد نہ کرنے کا کوئی عذر مجھے بارگاہ خداوندی

میں پیش کرنے کے لیے سمجھ میں نہیں آتا، اور یہ جو تم نے لکھا ہے کہ میں کسی فتنے میں پڑ جاؤں تو میرے علم کے مطابق اس سے بڑا فتنہ کوئی نہیں ہے کہ تیرے جیسا آدمی اس اُمت کا سربراہ بن گیا ہے''۔

(مقصد حسین ص ٤٧٤)

آخری الفاظ کی عربی ملاحظہ فرمائیں:

وَلَا أَعْلَمُ فِتْنَةً أَعْظَمُ مِنْ وَلَايَتِكَ أَمْرَ هٰذِهِ الْأُمَّةِ.

البدایۃ والنھایۃ مترجم میں اِس جملہ کا ترجمہ یوں ہے:

''مجھے معلوم ہے کہ اِس اُمت کی امارت پر آپ کے قابض ہونے سے بڑھ کر اور کوئی فتنہ نہیں''۔

(الطبقات الکبریٰ لابن سعد ج٦ ص ٤٢٣؛ تاریخ دمشق ج١٤ ص ٢٠٦؛ مختصر تاریخ دمشق ج٧ ص ١٣٧، ١٣٨؛ البدایة والنهایة، ط: قطر، ج٨ ص ٢٣٢، ومترجم اردو ج٨ ص ٢١٠؛ وط: بتحقیق محسن الترکي ج١١ ص ٥٠٠؛ سیر أعلام النبلاء ج٣ ص ٢٩٤؛ تهذیب الکمال للمزي ج٦ ص ٤١٣، ٤١٤؛ تذهیب تهذیب الکمال للذهبي ج٢ ص ٣٤٥، ٣٤٦)

ذرا ابن صخر کے اندازِ تکلم اور الفاظ میں تو غور فرمایئے، لختِ جگر مصطفیٰ اور ہر قسم کی رجس سے منزہ و مصفّٰی ہستی کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتا ہے:

فَإِنَّكَ مَتٰى تَكِدْنِي أَكِدْكَ.

''پس اگر تو نے میرے ساتھ مکر کیا تو میں بھی تیرے ساتھ مکر کروں گا''۔

سچ ہے کہ ''اَلْمَرْءُ يَقِيْسُ عَلٰى نَفْسِهٖ'' (انسان دوسرے کو خود پر قیاس کرتا ہے) اِس میں دو طرح کی زیادتی ہے: اول تو یہ کہ امام عالی مقام کی طرف مکر کی نسبت کی ہے، دوسری یہ کہ دھمکی دی ہے کہ میں بھی تیرے ساتھ مکر کروں گا۔ اگر امام پاک کی طرف سے معاویہ کے خلاف کسی قسم کی کوئی بات ہوتی بھی سہی تو یوں بھی خط لکھا جا سکتا تھا کہ ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کو مجھ سے کوئی شکایت ہے، اگر ایسی کوئی بات

ہے تو بتایئے میں ازالہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں‘‘ مگر ایسی امید اُن سے کی جاسکتی ہے جو ”أَنْزِلْ عَنْ مِنْبَرِ أَبِيْ“ کے الفاظ کو سن کر غضبناک ہونے کی بجائے خوش ہوئے تھے۔

بعض علماءِ ہند کا محلِ نظر استدلال

گذشتہ سطور میں سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے خطبہ سے ماخوذ تین اقتباسات میں سے پہلے اقتباس کا خلاصہ یہ ہے کہ معاویہ سیدنا امام حسن اور اُن کے والد گرامی علیہما السلام کے نزدیک خلافت کے لیے اہل نہیں تھا جبکہ سیدنا امام حسین علیہ السلام کے نزدیک معاویہ کی امارت سے بڑا فتنہ ہی کوئی نہیں تھا، اور اِس سے قبل آپ پڑھ چکے ہیں کہ سیدنا عمر، سیدنا عبداللہ بن عباس، ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ اور سیدنا عبدالرحمان بن غنم اشعری رضی اللہ عنہم معاویہ کو خلافت کے لیے اہل نہیں سمجھتے تھے، لہٰذا اس قدر تصریحاتِ اکابر کی موجودگی میں اگر کوئی شخص معاویہ کی اہلیت کا قول کرے تو وہ قابلِ اعتبار نہیں ہوگا۔ مثلاً بعض علماء نے لکھا ہے:

> ’’امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اگر خلافت کے اہل نہ ہوتے (تو) امام مجتبیٰ ہر گز اُنہیں تفویض نہ فرماتے، نہ اللہ و رسول اسے جائز رکھتے۔ واللہ تعالیٰ اعلم‘‘۔

(فتاوی رضویہ ج۲۹ ص۳۳۷)

یہ استدلال کیونکر قابلِ قبول ہوسکتا ہے جبکہ شریعت نے ہمیں اہل بیت کرام علیہم السلام کے دامنِ ہدایت کو تھامنے کی رغبت دی ہے اور فرمایا ہے کہ اگر تم اُن کے دامن کو تھامو گے تو ہر گز گمراہ نہیں ہوگے۔ سو جب اہل بیت کرام علیہم السلام اور بشمول سیدنا عمر بن الخطاب متعدد صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم نے معاویہ کو خلافت کے لیے اہل نہیں سمجھا تو ہمارے لیے اُن کا قول و فہم ہی باعث ہدایت ہے اور جو کچھ اُن کے قول و فہم سے متصادم ہے وہ ہندو پاک یا عرب و عجم کے کسی بھی عالم کا قول ہو تو محض مردود و باطل ہے۔

صلح میں امام حسن علیہ السلام کی مجبوریاں

انتہائی افسوس ناک بلکہ مضحکہ خیز بات ہے کہ بعض لوگ مجبوری اور پسند میں فرق نہیں کرتے۔ مجبوراً کسی چیز کو گوارا کرنے اور طبعاً کسی چیز کو اپنانے میں فرق نہ کیا جائے تو یقیناً فساد پیدا ہوتا ہے۔ سیدنا امام

حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے جو ایک نااہل شخص کو اقتدار سونپا گوارا کیا تھا اُس میں کئی مجبوریاں تھیں:

۱۔ اوّلاً یہ کہ اُن کے لشکر میں بے لوث لڑنے کے لیے اب وہ دم خم نہیں رہا تھا جو پہلے تھا۔ اِس کو امام پاک نے اِن الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

أَلَا وَإِنَّا لَكُمْ كَمَا كُنَّا ، وَلَسْتُمْ لَنَا كَمَا كُنْتُمْ.

''آگاہ رہو! ہم تو اب بھی تمہارے لیے ویسے ہی ہیں جیسے تھے مگر تم ہمارے لیے اب ویسے نہیں رہے جیسے پہلے تھے''۔

یہ اُس خطبہ سے ماخوذ جملہ ہے جو اِس سے قبل ''**اسد الغابة**'' وغیرہ سے نقل کیا گیا ہے، اُسی کے آخر میں یہ بھی ہے کہ قوم سے جب اُن کی مرضی پوچھی گئی تو اُنہوں نے جہاد پر حیات کو ترجیح دی، حالانکہ سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام جہاد کے خواہاں تھے اور اُنہیں معاویہ نے جس صلح کی پیش کش کی تھی وہ اُنہیں پسند نہیں تھی، وہ اُس میں عزت سمجھتے تھے اور نہ ہی انصاف۔

ایسی ہی صورتِ حال سے اُن کے بابا کریم سیدنا مولیٰ علی علیہ السلام بھی دوچار ہوئے تھے۔ جنگِ صفین میں جب لشکرِ شام ہزیمت کا شکار ہونے لگا تو اُس وقت عمرو بن العاص کی خدیعت ومکیدت لشکرِ شام کی نصرت کو آئی اور اُن کے کہنے پر قرآن مجید کو نیزوں پر بلند کیا گیا، اِس سے اُن کا مقصد یہ تھا کہ جنگ بند ہو جائے اور کوئی معاہدہ طے پا جائے، جسے بعد میں تحکیم کا نام دیا گیا۔ سیدنا علی علیہ السلام اُن کی چال کو بھانپ گئے تھے اِس لیے اُنہوں نے کھلے الفاظ میں منع کیا تھا اور فرمایا تھا کہ یہ دھوکہ دہی کی کوشش کی جارہی ہے، لہٰذا جنگ جاری رکھو مگر اُن کے لشکر کا ایک حصہ دھوکہ میں آگیا اور جنگ سے پیچھے ہٹ گیا تو مجبوراً تحکیم کو گوارا کرنا پڑا۔ اب اِس مجبوری کو اگر کوئی شخص مولیٰ علی علیہ السلام کی پسند قرار دے کر اِس سے کسی کی اہلیت کی دلیل اخذ کرنا شروع کر دے تو اُس کی عقل پر افسوس ہی کیا جاسکتا ہے؟

۲۔ ثانیاً یہ مجبوری تھی کہ صلح کی پیش کش معاویہ کی طرف سے تھی۔ ایسی صورتِ حال میں کبھی بھی اگر اسلام کے حقیقی نمائندے صلح کی پیش کش کو ٹھکرا دیں تو مخالفین اور خصوصاً منکرینِ اسلام کو غلط پروپیگنڈا کرنے کا موقع مل جاتا ہے، جبکہ معاشرہ میں اصل چیز اصولوں پر قائم رہتے ہوئے امن، اصلاح اور صلح کو یقینی

بنانا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کافر بھی اگر صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی جھک جاؤ، اگر چہ اُن کا ارادہ دھوکہ دہی کا ہی کیوں نہ ہو، جیسا کہ ہم اس سے قبل سورۃ الانفال کی آیات نقل کر چکے ہیں۔

معاویہ کے ساتھ صلح میں عزت نہیں

ثالثاً درجِ ذیل الفاظ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی مجبوری کو چیخ چیخ کر بیان کر رہے ہیں:

أَلَا وَإِنَّ مُعَاوِيَةَ دَعَانَا إِلىٰ أَمْرٍ لَيْسَ فِيْهِ عِزٌّ وَلَا نَصَفَةٌ.

''سنو! معاویہ نے ہمیں ایک پیش کش کی ہے جس میں عزت ہے اور نہ ہی انصاف''۔

اِس جملہ سے یہ حقیقت عیاں ہو رہی ہے کہ سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ نے مجبوراً صلح فرمائی تھی، اور وہ مجبوری تھی جانبین کے اہل اسلام کے خون کی حفاظت۔ خود سوچئے کہ امام پاک ایک طرف تو فرما رہے ہیں کہ جس بات کی طرف معاویہ بلا رہا ہے اُس میں عزت و انصاف نہیں ہے اور دوسری طرف اُنہوں نے وہ بات گوارا بھی کر لی اور مجبوراً مملکت معاویہ کے سپرد بھی کر دی تو اِس سے معاویہ کی اہلیت کیسے ثابت کی جا سکتی ہے؟

اکابر پرستی یا حق پرستی؟

ہر چند کہ ہندو پاک کا کوئی عالم امام مذہب ہے اور نہ ہی امام عقیدہ، مگر تمام علماء حق واجب التعظیم ہیں، لیکن تعظیم الگ چیز ہے اور اکابر پرستی الگ چیز ہے، اس لیے اعتدال پسند مسلمان اکابر پرست نہیں بلکہ حق پرست ہوتا ہے۔ سو جس مسئلہ میں دلائل اکابر کے موقف کے خلاف ہوں تو حق پسند شخص دلائل کی روشنی میں حق کو اپنا لیتا ہے اور اکابر کو تو نہیں لیکن قولِ اکابر کو چھوڑ دیتا ہے۔ سو اِسی اصول کے مطابق چونکہ بعض اکابر کا صلحِ امام حسن رضی اللہ عنہ کو معاویہ کی اہلیت کی دلیل بنانا باطل ہے اِس لیے اُن کے قول کو چھوڑ کر حق کو قبول کرنا ضروری ہے، کیونکہ ''اَلْحَقُّ أَحَقُّ أَنْ يُّتَّبَعَ'' (حق زیادہ حق رکھتا ہے کہ اُس کی اتباع کی جائے)۔

مضطر کے لیے ممنوعات کا استعمال مباح یا محبوب؟

بعض متاخرینِ ہند کا صلحِ امام حسن سے اہلیتِ معاویہ کا قول کرنا ایسے ہے جیسا کہ بعض علماء کا معاملۂ تحکیم سے معاویہ کی بغاوت کی نفی کرنا، حالانکہ جس طرح امام حسن رضی اللہ عنہ نے صلح مجبوراً کی تھی اسی طرح سیدنا علی رضی اللہ عنہ

نے تحکیم کو بھی مجبوراً گوارا کیا تھا، اور بالکل اسی طرح نبی کریم ﷺ نے بھی مشرکین مکہ کے ساتھ حدیبیہ کے مقام پر مجبوراً دس سالہ صلح کا معاہدہ کیا تھا، اور آپ نے اُسی موقع پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو پیش گوئی فرمادی تھی کہ تمہیں بھی ایسی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ چنانچہ امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

عَنْ عَلْقَمَةَ بْنِ قَيْسٍ، قَالَ: قُلْتُ لِعَلِيٍّ رضي الله عنه تَجْعَلُ بَيْنَكَ وَبَيْنَ ابْنِ آكِلَةِ الْأَكْبَادِ حَكَماً؟ قَالَ: إِنِّي كُنْتُ كَاتِبَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ يَوْمَ الْحُدَيْبِيَةِ، فَكُتِبَ هٰذَا مَا صَالَحَ عَلَيْهِ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ، وَسُهَيْلُ بْنُ عَمْرَ، فَقَالَ سُهَيْلٌ: لَوْ عَلِمْنَا أَنَّهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ مَا قَاتَلْنَاهُ، اُمْحُهَا، فَقُلْتُ: هُوَ وَاللّٰهِ رَسُوْلُ ﷺ وَإِنْ رَغِمَ أَنْفُكَ، لَا وَاللّٰهِ لَا أَمْحُوْهَا، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: أَرِنِي مَكَانَهَا، فَأَرَيْتُهُ فَمَحَاهَا، وَقَالَ: أَمَا إِنَّ لَكَ مِثْلُهَا وَسَتَأْتِيهَا وَأَنْتَ مُضْطَرٌّ.

''حضرت علقمہ بن قیس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے عرض کیا: آپ نے اپنے اور ''ابْنُ آكِلَةِ الْأَكْبَادِ'' (کلیجہ چبانے والی کے بیٹے) کے درمیان فیصل مقرر کر دیا ہے؟ اُنہوں نے فرمایا: حدیبیہ کی صلح میں، میں رسول اللہ ﷺ کا کاتب تھا، پس لکھا گیا: یہ صلح نامہ محمد رسول اللہ ﷺ اور سہیل بن عمرو کی طرف سے ہے تو سہیل نے کہا: اگر ہم ان کو رسول اللہ سمجھتے تو ان سے برسر پیکار کیوں ہوتے؟ اس (لفظ رسول اللہ) کو مٹا دو۔ میں نے کہا: خدا کی قسم! وہ اللہ کے رسول ہیں اگرچہ تمہیں ناگوار ہو، خدا کی قسم میں نہیں مٹاؤں گا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ان الفاظ کی جگہ مجھے دکھاؤ! میں نے آپ کو وہ جگہ دکھائی تو آپ نے اس کو مٹا دیا اور فرمایا: ایسا معاملہ تمہارے ساتھ بھی ہوگا اور عنقریب پیش آئے گا اور اُس وقت تم مجبور ہوگے''۔

(السنن الکبریٰ للنسائي ج۷ ص ۴۸۱، ۴۸۲ حدیث ۸۵۲۳ وط: ج۵ ص ۱۶۷ حدیث ۸۵۷۶؛ خصائص أمیر المؤمنین علي بن أبي طالب، بتحقیق الحویني ص ۱۵۲ حدیث ۱۸۶)

اس حدیث کی سند میں چھ رواۃ ہیں۔

۱۔ ''معاویہ صالح ابن الوزیر دمشقی: حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں: یہ سچا ہے۔

(تقریب التهذیب ص ۹۵۵)

۲۔ عبدالرحمان بن صالح ازدی: سچا تھا شیعہ (مقدمین کے مطابق محبّ اہل بیت) تھا۔

(تقریب التهذیب ص ۵۸۲)

۳۔ عمرو بن ھاشم الجَنْبی: یہ حدیث میں کمزور تھا۔

(تقریب التهذیب ص ۷۴۷)

۴۔ محمد بن اسحاق بن یسار: یہ امام المغازی ہیں، صدوق ہیں، مدلس ہیں اور ان پر تشیع اور قدریہ ہونے کی تہمت ہے۔

(تقریب التهذیب ص ۸۲۵)

حضرت محمد بن اسحاق بن یسار رحمہ اللہ کو محدث سفیان بن عیینہ اور حضرت شعبہ نے امیر المؤمنین فی الحدیث مانا ہے۔ اُن کے متعلق تفصیل کے لیے ہماری کتاب ''أنوار العرفان في أسماء القرآن'' صفحہ ۸۴۹ تا ۸۵۸۔ ملاحظہ فرمایئے۔

۵۔ محمد بن کعب القرظی: ثقہ عالم ہیں۔

(تقریب التهذیب ص ۸۹۱)

۶۔ علقمہ بن قیس کوفی: ثقہ، ثبت، فقیہ اور عابد تھے۔

(تقریب التهذیب ص ۶۸۹)

اگر کوئی شخص اس حدیث کو تسلیم کرنے میں متردد ہو تو ہم اُس کے سامنے ایسی صحیح السند حدیث پیش کر دیتے ہیں جس میں ذکر ہے کہ تحکیم میں سیدنا علی علیہ السلام کو امیر المومنین تسلیم نہیں کیا گیا تھا اور اُنہیں لفظ ''امیر المومنین'' اُسی طرح مٹانا پڑ گیا تھا جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لفظ ''مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ'' مٹانا پڑ گیا تھا۔ یعنی جس طرح قریش مکہ کے ساتھ معاہدۂ صلح لکھواتے وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا تھا

بعینہٖ ایسی ہی دشواریوں کا سامنا سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو بھی کرنا پڑ گیا تھا۔ اسی بنا پر اُن کے لشکر کے کچھ لوگ اُنہیں چھوڑ کر الگ ہو گئے تھے اور خوارج قرار پائے تھے، اُنہوں نے کہنا شروع کر دیا تھا کہ جب وہ امیر المومنین نہیں ہیں تو پھر امیر الکافرین ہیں۔ بالآخر سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اُن کے ساتھ مناظرہ کیا اور اُن کے دوسرے اعتراضات کو دفع کرنے کے ساتھ ساتھ لفظ امیر المومنین کو محو کرنے کی مجبوری کو بھی صلح حدیبیہ کی مثال سے واضح فرمایا تو اُن میں سے ہزاروں لوگوں نے اپنی غلطی سے رجوع کر لیا۔ چنانچہ محدثین کرام نے طویل حدیث کے ضمن میں خوارج کے اِس اعتراض کو بایں الفاظ نقل کیا ہے:

قَالُوْا: إِنَّهُ مَحٰى نَفْسَهُ مِنْ أَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ، فَإِنْ لَمْ يَكُنْ أَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ فَهُوَ أَمِيْرُ الْكَافِرِيْنَ.

''خوارج نے کہا: اُنہوں نے اپنی ذات سے امیر المومنین مٹا دیا ہے، پس اگر وہ امیر المومنین نہیں تو امیر الکافرین ہیں''۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اُن کے اِس اعتراض کا جواب یوں دیا تھا:

وَأَمَّا قَوْلُكُمْ: مَحٰى نَفْسَهُ مِنْ أَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ، فَإِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ دَعَا قُرَيْشًا يَوْمَ الْحُدَيْبِيَّةِ عَلٰى أَنْ يَكْتُبَ بَيْنَهُ وَبَيْنَهُمْ كِتَابًا، فَقَالَ: أُكْتُبْ! هٰذَا مَا قَاضٰى عَلَيْهِ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ، قَالُوْا: لَوْ كُنَّا نَعْلَمُ أَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ مَا صَدَدْنَاكَ عَنِ الْبَيْتِ، وَلَا قَاتَلْنَاكَ، وَلٰكِنِ اكْتُبْ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ، فَقَالَ: وَاللّٰهِ إِنِّي لَرَسُوْلُ اللّٰهِ حَقًّا وَإِنْ كَذَّبْتُمُوْنِيْ، أُكْتُبْ يَا عَلِيُّ! مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ، فَرَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ أَفْضَلُ مِنْ عَلِيٍّ رضی اللہ عنہ.

''رہ گیا تمہارا یہ قول کہ انہوں نے اپنی ذات سے امیر المومنین محو کر دیا ہے، تو (اِس کا جواب یہ ہے کہ) رسول اللہ ﷺ نے حدیبیہ کے دن قریش کو اِس بات کی دعوت دی کہ آپ کے اور اُن کے درمیان معاہدہ لکھا جائے۔ پس آپ نے فرمایا: لکھو! یہ محمد رسول اللہ کی جانب سے صلح نامہ ہے۔ قریش نے کہا: اگر ہم جانتے کہ آپ

اللہ کے رسول ہیں تو ہم آپ کو بیت اللہ سے روکتے اور نہ ہی آپ سے جنگ کرتے۔
آپ نے فرمایا: لکھو محمد بن عبداللہ۔ پھر فرمایا: اللہ کی قسم! میں بالیقین اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں اگرچہ تم مجھے جھٹلاتے ہو۔ اے علی! لکھ دو: محمد بن عبداللہ۔ پس رسول اللہ ﷺ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے افضل تھے"۔

(المصنف للإمام عبدالرزاق: كتاب الفرائض، باب ماجاء فى الحرورية، ج١٠ ص١٥٨، ١٥٩ حديث١٨٦٧٨؛ السنن الكبرىٰ للنسائي ج٧ص٤٧٩ حديث٨٥٢٢؛ المستدرك: كتاب قتال أهل البغي، مناظرةابن عباس مع الحرورية ج٢ص ١٥٠؛ المعجم الكبيرج١٠ ص٣١٢، ٣١٣ حديث١٠٥٩٨؛ السنن الكبرىٰ للبيهقي: كتاب قتال أهل البغي، باب لايبدأ الخوارج بالقتال حتى يسألوا مانقموا، ج٨ص١٧٩ وط: ج٨ص٣٠٩، ٣١٠ حديث ١٦٧٤٠؛ كتاب الأموال لأبي عبيد: محاجةابن عباس للحرورية في شان علي كاتب صلح الحديبية ج١ ص٢٦٦ حديث٤٦٤؛ كتاب الأموال لابن زنجويه: باب الصلح والمهادنة تكون بين المسلمين والمشركين إلىٰ مدة ص٣٩٦، ٣٩٧ حديث٦٥٥؛ جامع بيان العلم وفضله، لابن عبدالبر: باب المناظرة والمجادلة وإقامة الحجة ج١ ص٩٦٢ حديث١٨٣٤؛ حلية الأولياء لأبي نعيم: مناقب عبدالله بن عباس، ج١ ص٣١٩؛ الأحاديث المختارة: مسند عبدالله بن عباس ج١٠ ص٤١٣ حديث٤٣٧؛ مجمع الزوائد: كتاب قتال أهل البغي، باب ماجاء في ذى الثدية وأهل النهروان، ج١٣ ص٥٧٥، ٥٧٧ حديث١٠٥٠٣)

امام زرقانی رحمۃ اللہ علیہ "أَمَا إِنَّ لَکَ مِثْلَهَا وَسَتَأْتِيهَا وَأَنْتَ مُضْطَرٌّ" (ایسا معاملہ تمہارے ساتھ بھی ہوگا اور عنقریب پیش آئے گا اور اُس وقت تم مجبور ہوگے) کی تشریح میں لکھتے ہیں:

يُشِيرُ إِلَى مَا وَقَعَ لِعَلِيٍّ يَوْمَ الْحَكَمَيْنِ ، فَإِنَّهُ لَمَّا كَتَبَ الْكَاتِبُ: بِهٰذَا مَا صَالَحَ عَلَيْهِ عَلِيٌّ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ، أَرْسَلَ مُعَاوِيَةُ يَقُولُ: لَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ أَنَّهُ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ مَا قُلْتُهُ (مَاقَاتَلْتُهُ)، اُمْحُهَا وَاكْتُبِ ابْنُ أَبِي طَالِبٍ،

فَقَالَ عَلِيٌّ: اَللّٰهُ أَكْبَرُ مَثَلٌ بِمَثَلٍ ، اُمْحُهَا.

''یہ آپ ﷺ نے اُس واقعہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو تحکیم کے روز پیش آیا تھا، سو جب کاتب نے لکھا: یہ صلح نامہ امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کی جانب سے ہے۔ معاویہ نے آدمی بھیج کر کہا: اگر میں اُسے امیر المومنین سمجھتا تو اُس سے جنگ نہ کرتا، اِس لفظ کو مٹاؤ اور ابن ابی طالب لکھو۔ اِس پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ اکبر، یہ تو ہو بہو (صلح حدیبیہ کی طرح) معاملہ ہو گیا، اس کو محو کر دو''۔

(شرح الزرقانی علی المواهب ج۳ص۲۰۱)

شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔

(مدارج النبوۃ اردو ج۲ ص ۲۶۶، شبیر برادرز، لاہور)

سو جس طرح نبوی پیش گوئی کے مطابق سیدنا علی رضی اللہ عنہ باغیوں کے خلاف جنگ کرنے پھر تحکیم کو ماننے میں مجبور تھے، اسی طرح سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام اُن ہی ناگوار لوگوں کے ساتھ صلح کرنے پر مجبور ہوئے تھے۔ اربابِ دانش و بینش غور فرمائیں کہ نبی کریم ﷺ نے مشرکین کے ساتھ جو دس سالہ معاہدہ کیا تھا، جس کی وجہ سے مزید دس سال تک کعبہ معظمہ کے اصنام سے ملوث رہنے کا خدشہ بھی موجود تھا، کیا اُس معاہدہ کو آقائے کائنات ﷺ کی خوشنودی اور مشرکین مکہ کے پسندیدہ ہونے کی دلیل سمجھنا عقل مندی ہے؟ اگر نہیں تو نبی کریم ﷺ نے تو اُسی وقت ہی فرما دیا تھا کہ اے علی! عنقریب تجھے بھی ایسی ناگوار صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑے گا۔ پھر ساتھ ہی واضح الفاظ میں فرما دیا ''وَأَنْتَ مُضْطَرٌّ'' (آپ اُس وقت مضطر ہوں گے) ایمان سے بتلایئے کہ اگر کوئی کامل مومن اور متقی شخص مضطر ہونے کی حالت میں کسی حرام چیز کو استعمال کرنے پر مجبور ہو جائے تو کیا وہ چیز اُس کے استعمال کرنے کی وجہ سے پسندیدہ ہو جائے گی؟ حالتِ اضطرار میں تو مسلمان اگر مردار، بہتا خون، خنزیر کا گوشت اور معبودانِ باطلہ کے نام پر ذبح شدہ جانور تک کا گوشت کھالے تو قرآن مجید کے مطابق ''لَا إِثْمَ عَلَيْهِ'' (اُس پر کوئی گناہ نہیں) (البقرۃ: ۱۷۳)، لیکن کیا اس سے یہ دلیل حاصل کی جا سکتی ہے کہ ایک متقی شخص کے استعمال کرنے کی وجہ سے وہ اشیاء پسندیدہ ہو جائیں گی؟

اگر نہیں تو پھر جان لینا چاہیئے کہ جس طرح ماکولات ومشروبات کے مسائل میں کسی مومن کو حالت اضطرار سے گذرنا پڑتا ہے اسی طرح معاملات وغیرہ میں بھی اُسے حالتِ اضطرار سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

مولیٰ علی علیہ السلام سے سوتیلا سلوک، لمحہ فکریہ

اِس تفصیل سے واضح ہوا کہ معاویہ بن ابی سفیان نے مولیٰ المومنین علیہ السلام کو خلیفہ تسلیم نہیں کیا تھا، اُن کے نام کے ساتھ لفظ امیر المومنین لکھا جانا برداشت نہیں کیا تھا، اُن کے خلاف بغاوت کی، اُن پر سب وشتم کیا، اُنہیں اذیت پہنچائی اور اُن کے ساتھ جنگ کی لیکن حیرت ہے کہ اِس سب کچھ کے باوجود بعض لوگ ایسے شخص کو ''سیدنا'' وغیرہ الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ انصاف سے بتایئے! اگر کوئی شخص طاقت کے بل بوتے پر سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کا انکار کرتا، اُنہیں امیر المومنین نہ مانتا، اُن کے خلاف علَمِ بغاوت بلند کرتا، اُن پر سب وشتم کرتا اور اُنہیں اذیت پہنچاتا تو کیا اُسے بھی ''سیدنا'' (ہمارا آقا) کہا جاتا؟

شرائطِ صلح

سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام اور معاویہ کے درمیان طے پانے والی صلح کی جملہ شرائط کسی ایک کتاب میں یکجا نہیں ملتیں، کسی کتاب میں شرائط کا کچھ حصہ بیان کیا گیا ہے اور کسی میں کچھ، اور ایسا اِجمال یا اِکمال اکثر واقعات میں ہوتا ہے، جیسا کہ قرآن وسنت سے ایسی کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ بہرحال ہم آپ کے سامنے مختلف کتب سے شرائط کے اکثر جملے باحوالہ پیش کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔

خلافت پھر امام کو لوٹانا ہوگی

امام ابن عبد البر، امام ابن اثیر جزری، ابن عساکر، سبط ابن الجوزی، نووی، علامہ ذہبی، شعرانی اور سیوطی لکھتے ہیں، واللفظ لہ:

فَأَرْسَلَ إِلَيهِ الْحَسَنُ: يَبْذُلُ لَهُ تَسلِيمَ الْأَمرِ إِلَيهِ عَلىٰ أَنْ تَكُونَ لَهُ الْخِلَافَةُ مِنْ بَعْدِهِ ، وَعَلىٰ أَنْ لَا يَطْلُبَ أَحَدًا مِنْ أَهْلِ الْمَدِينَةِ وَالْحِجَازِ وَالْعِرَاقِ بِشَيْءٍ مِمَّا كَانَ أَيَّامَ أَبِيهِ.

''سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ نے معاویہ کو پیغام بھیجا کہ وہ اُسے معاملہ سپرد کرتے ہیں اِس شرط پر کہ اُس کے بعد خلافت اُن (امام حسن) کے لیے ہوگی اور یہ کہ اہلِ مدینہ، حجاز اور عراق میں سے کسی شخص سے کسی ایسی چیز کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا جو اُن کے بابا کے دور میں تھی''۔

(الاستیعاب ج۱ ص ۲۳۰، ۲۳۱؛ أسد الغابة ج۲ ص۱۸؛ تاریخ دمشق ج۱۳ ص ۲٦۱؛ مرآة الزمان ج۷ ص۹؛ تهذیب الأسماء واللغات ج۱ ص ۱۵۹؛ تاریخ الإسلام للذهبي ج٤ ص٥؛ الطبقات الکبریٰ للشعراني ج۱ ص ۵۱؛ تاریخ الخلفاء للسیوطي ص ۳۱۷)

جب شرائط میں یہ بات طے کی گئی تھی کہ معاویہ کے مرنے کے بعد خلافت پھر امام پاک کو لوٹائی جائے گی تو اِس سے تو امام پاک کی مجبوری واضح طور پر سمجھ آجاتی ہے، اس کے باوجود بعض علماء ہند کا لکھنا کہ امام پاک نے معاویہ کو پورے حجاز مقدس سے اختیار کیا تھا، کس قدر عجیب بات ہے۔

بعض معاصرین کی غلط فہمی

ہمارے بعض معاصرین کی فہم کے مطابق یہ شرط محلِ نظر ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''حضرت معاویہ اور امام حسن علیہ السلام کے درمیان صلح نامہ میں عام طور پر ایک شرط بہت مشہور ہے کہ حضرت معاویہ کے بعد حسن علیہ السلام خلیفہ ہوں گے لیکن یہ شرط مسعودی کی کتاب ''مروج الذہب''، دینوری کی اخبار الطوال، تاریخ یعقوبی، تاریخ طبری اور ابن اثیر کی اسد الغابہ اور کامل فی التاریخ سمیت کسی مستند تاریخ کی کتاب میں نہیں ملتی، البتہ علامہ ابن عبد البر نے الاستیعاب میں لکھا ہے کہ ''حضرت امام حسن علیہ السلام صرف معاویہ رضی اللہ عنہ کی ہی زندگی تک کے لیے ان کے حق میں دستبردار ہوئے تھے''۔ ان کا یہ بیان محلِ نظر محسوس ہوتا ہے کیونکہ حضرت امام حسن علیہ السلام کی شہادت کے فوراً بعد حضرت معاویہ اپنے بیٹے یزید کی بیعت لینے کے لیے مدینہ جا پہنچے اور امام حسین، عبداللہ بن زبیر اور عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ سمیت کسی صحابی نے اس واقعہ یا

شرط کا ذکر نہ کیا کہ آپ معاہدے کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ اگر معاہدے میں شرط ہوتی تو کم از کم یہ ذکر ضرور ہوتا کہ اگر امام حسن علیہ السلام کی شہادت ہوگئی ہے تو ان کے بھائی امام حسین علیہ السلام موجود ہیں، خلافت ان کا حق بنتا ہے، انہیں نامزد کیا جائے لیکن ان میں سے کسی ایک نے بھی ایسا نہ کہا۔ حضرت عبداللہ بن زبیر اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضرت معاویہ کے اس فعل کی سخت مزاحمت کی اور مخالفت میں بے شمار دلائل دیئے کہ اس طرح اپنے بیٹے کی بیعت لینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت نہیں اور نہ ہی یہ خلفاء راشدین کا طریقہ ہے۔ عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ قیصر و کسریٰ کا طریقہ ہے لیکن کسی نے بھی یہ دلیل نہیں دی کہ حسن علیہ السلام صرف تمہارے حق میں دستبردار ہوئے تھے۔ اس لیے یزید کو ولی عہد نہیں بنایا جا سکتا۔ اگر ان اکابرین کو اس قسم کی شرط کا علم ہوتا تو وہ دوسرے دلائل کے ساتھ اسے بھی یزید کی جانشینی کی مخالفت میں ضرور پیش کرتے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے بھی دلائل دیئے لیکن انہوں نے بھی یہ نہیں فرمایا کہ آپ نے میرے بھائی حضرت امام حسن علیہ السلام سے یہ طے کیا تھا کہ آپ کی خلافت کے بعد وہ خلیفہ ہوں گے۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ بوقتِ صلح اس قسم کی کوئی شرط طے نہیں پائی تھی''۔

(ریحانة النبي ﷺ، للدکتور محمد حسین آزاد، ص ۱۴۲)

نامعلوم اِس قدر طویل تبصرہ کے پیچھے ڈاکٹر آزاد صاحب کی غرض کیا ہے؟ اُن کی جو بھی غرض ہو ہمیں اُس سے کوئی سروکار نہیں، البتہ ہم اتنا عرض کیے دیتے ہیں کہ اُنہوں نے امام ابن عبدالبر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی نقل کو جو محلِ نظر کہا ہے، یہ اُن کے عدم تدبر کا نتیجہ ہے۔ اِس سے یہ تأثر ابھرتا ہے کہ امام ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ اِس روایت کی نقل میں منفرد ہیں، لہٰذا قابل اعتبار نہیں، حالانکہ ڈاکٹر صاحب نے اُن کے معارضہ میں جتنے اسماء ذکر کیے ہیں امام ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ اُن سب سے زیادہ معتبر ہیں، ماسوا امام ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ کے۔

پھر ڈاکٹر صاحب کا یہ استدلال بھی عجیب ہے کہ چونکہ اِن پانچ حضرات کی کتب میں اِس شرط کا ذکر نہیں ملتا لہٰذا یہ محلِ نظر ہے۔ کیا کسی بات کے اثبات کے لیے یہ ضروری ہے کہ اُس بات کا ڈاکٹر صاحب کے سامنے موجود کتب میں مذکور ہونا ضروری ہے؟ اگر ڈاکٹر صاحب کے ذکر کردہ پانچ علماء نے اپنی کتب میں اِس شرط کا ذکر نہیں کیا تو کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ اُن سے زیادہ علماء نے اِس شرط کا ذکر کیا ہے، جیسا کہ ہم مذکورہ بالا سطور میں ابن اثیر، ابن عساکر، سبط ابن الجوزی، نووی، ذہبی، شعرانی اور سیوطی کی کتب کے حوالے سے لکھ چکے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے "أسد الغابة" کے بارے میں بھی لکھ دیا ہے کہ اُس میں بھی اِس شرط کا ذکر نہیں ہے، حالانکہ اس میں یہ شرط مذکور ہے، اور اُس کے الفاظ یہ ہیں:

فَأَرْسَلَ إِلٰى مُعَاوِيَةَ يَبْذِلُ لَهُ تَسْلِيمُ الْأَمْرِ إِلَيْهِ ، عَلٰى أَنْ تَكُوْنَ لَهُ الْخِلَافَةُ بَعْدَهُ.

"پھر امام نے معاویہ کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ معاملہ اُس کے سپرد کرنے پر تیار ہیں، اِس شرط پر کہ خلافت اُس کے بعد اُن کے لیے ہوگی"۔

(أسد الغابة ج۲ ص۱۸)

اِس شرط کو حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی ذکر کیا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

وَأَعْطَاهُ عَهْدًا إِنْ حَدَثَ بِهِ حَدَثٌ وَالْحَسَنُ حَيٌّ لَيَجْعَلَنَّ هٰذَا الْأَمْرَ إِلَيْهِ.

"معاویہ نے امام حسن سے عہد کیا کہ اگر کوئی اچانک معاملہ پیش آگیا اور امام حسن [علیہ السلام] زندہ ہوں گے تو وہ ضرور یہ امر اُن کی طرف لوٹا دیں گے"۔

(الإصابة بتحقيق محسن التركي ج۲ ص ۵۴۱، ۵۴۲؛ تهذيب التهذيب ج۲ ص ۵۳)

حافظ رحمۃ اللہ علیہ بعض مقامات پر لکھتے ہیں:

وَذَكَرَ مُحَمَّدُ بْنُ قُدَامَةَ فِيْ كِتَابِ الْخَوَارِجِ بِسَنَدٍ قَوِيٍّ إِلٰى أَبِيْ بَصْرَةَ أَنَّهُ سَمِعَ الْحَسَنَ بْنَ عَلِيٍّ يَقُوْلُ فِيْ خُطْبَتِهِ عِنْدَ مُعَاوِيَةَ: إِنِّيْ اِشْتَرَطْتُ عَلٰى مُعَاوِيَةَ لِنَفْسِيَ الْخِلَافَةَ بَعْدَهُ.

''محمد بن قدامہ نے ''کتاب الخوارج'' میں ابو بصرہ تک سند قوی کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ اُنہوں نے امام حسن مجتبیٰ ؑ کو معاویہ کے پاس بیان کرتے ہوئے سنا: میں نے معاویہ پر شرط عائد کی ہے کہ خلافت اُن کے بعد میرے سپرد ہوگی''۔

(فتح الباري ج١٦ ص٥٣٢؛ موسوعة الحافظ ابن حجر العسقلاني ج٦ ص٣٣٧)

ڈاکٹر صاحب کا یہ استدلال بھی بے جان ہے کہ اگر یہ شرط طے کی گئی ہوتی تو کم از کم امام حسین، ابن زبیر اور ابن ابی بکر ؓ یزید کے ناجائز تقرر کے وقت معاویہ کو یاد تو کراتے۔ اِس سادگی پر قربان جائیے، جنابِ والا! معاویہ نے اور کون سی شرط پوری کی تھی کہ یہ حضرات اُسے یہ شرط یاد دلاتے؟ خود ڈاکٹر صاحب نے بھی لکھا ہے کہ معاویہ نے شرائط تسلیم تو کی تھیں لیکن کسی شرط کو پورا نہیں کیا تھا۔ چنانچہ وہ ایک مقام پر لکھتے ہیں:

''حضرت امام حسن علیہ السلام بھی طبعاً امن پسند اور صلح جو واقع ہوئے تھے اور مسلمانوں کے درمیان ہرگز کشت و خون کے خواہاں نہ تھے، اس لیے اُنہوں نے صلح کی شرائط لکھ کر ارسال فرما دیں جنہیں حضرت معاویہ ؓ نے من و عن تسلیم کر لیا''۔

(ريحانة النبي ﷺ، للدكتور محمد حسين آزاد، ص ١٥٠)

جبکہ دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

''حضرت معاویہ ؓ نے دستبرداری کے وقت جو شرائط اور وعدے وعید کیے تھے، وہ پورے نہ کیے اور اہل بصرہ نے بھی اپنی زمینوں سے خراج دینے سے معذرت کر لی''۔

(ريحانة النبي ﷺ، للدكتور محمد حسين آزاد، ص ١٥٠)

جب یہ تینوں حضرات پچھلے دس برسوں میں دیکھ چکے تھے کہ معاویہ نے امام حسن علیہ السلام کے ساتھ طے کردہ شرائط میں سے کوئی ایک شرط بھی پوری نہیں کی تو پھر وہ یہ شرط اُسے کیوں یاد کراتے؟ اُنہوں نے اِن شرائط کو یاد کرانے کی بجائے اُن موٹی اور واضح باتوں کو اُس کے سامنے رکھا جن کو وہ رد نہ کر سکے، اور وہ

یہ ہیں: نبوی طریقہ، صدیقی طریقہ اور فاروقی طریقہ۔

ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ جس شرط کا لکھا جانا اُنہیں محلِ نظر محسوس ہو رہا ہے وہ شرط لکھی گئی تھی، اور یہی وہ خاص شرط تھی جو ہمہ وقت معاویہ کو کھٹکتی رہتی تھی، یہی وجہ ہے کہ جب سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام ۵۰ھ میں زہر سے شہید کر دیے گئے تھے تو معاویہ نے سکھ کا سانس لیا تھا، اُن کی شہادت کو مصیبت نہیں سمجھا تھا اور اُس کے دربار میں کسی بدبخت نے امام پاک کے بارے میں کہا کہ وہ انگارہ تھے جنہیں اللہ نے بجھا دیا تو معاویہ اُس بدبخت پر ناراض نہیں ہوا تھا بلکہ اُلٹا اُس کو پیسے دیے تھے۔

دراصل ڈاکٹر صاحب سے اِس کتاب میں حق کا چہرہ دھندلا ہو گیا ہے، خدا جانے کہ اُن سے ایسا کیوں ہوا؟ مجھے اُن سے یہ توقع نہیں تھی۔ کچھ لوگوں کو تمام طبقات میں مقبول رہنے کی ٹھرک ہوتی ہے، لیکن اہل بیت کی محبت کا دم بھرنا اور پھر ہر طبقہ میں مقبول رہنے کی توقع کرنا ع

ایں خیال است و محال است و جنوں

معاویہ صلح پر اتنا خوش کیوں؟

امام ابن عبد البر اور سبط ابن الجوزی وغیرہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب معاویہ کے پاس صلح کی یہ شرائط پہنچیں تو وہ بہت خوش ہوئے، حتیٰ کہ الفاظ ہیں:

وَكَادَ أَنْ يَّطِيرَ فَرَحًا.

''قریب تھا کہ وہ خوشی سے اُڑنے لگتے''۔

(الاستیعاب ج۱ ص ۲۳۰، ۲۳۱؛ مرآۃ الزمان ج۷ ص۹)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی دست برداری پر معاویہ اِس قدر کیوں خوش ہوئے، کیا اِس لیے کہ خلافت ایک نا اہل سے اہل کی طرف منتقل ہو رہی تھی، یا اس لیے کہ دین کو زیادہ جاننے والے کی طرف منتقل ہو رہی تھی، یا اس لیے کہ دین کے زیادہ خیر خواہ کی طرف منتقل ہو رہی تھی، یا اِس لیے کہ بنو ہاشم سے بنو امیہ کی طرف منتقل ہو رہی تھی، آخر اِس قدر خوش ہونے کی وجہ کیا تھی؟

متبعین علی کو چھیڑا نہیں جائے گا

مذکورہ بالا عبارت میں یہ دوسری شرط تھی، اِس شرط پر امام حسن مجتبیٰ ؑ نے بطورِ خاص اِس لیے زور دیا کہ سیدنا علی ؑ سے تحکیم کے بعد ابن صخر نے سیدنا علی ؑ کے پیروکاروں کو ۳۷ھ سے ۴۰ھ کے درمیان مکہ، مدینہ اور یمن وغیرہ مقامات پر ناحق قتل کیا تھا، اُن کے اموال لوٹے تھے، اُن کے نابالغ بچوں تک کو چھریوں سے ذبح کیا تھا اور اُن کی خواتین کو لونڈیاں بنا کر بازار میں فروخت کے لیے کھڑا کیا تھا۔ تفصیل کے لیے "**الأحاديث الموضوعة في فضائل معاوية**" میں "بسر بن ابی ارطاۃ کے مظالم" کا ذکر پڑھیے۔ افسوس کی بات ہے کہ معاویہ بن ابی سفیان نے اِس شرط کو بھی دوسری شرائط کی طرح قبول تو کیا تھا مگر عملاً پورا نہیں کیا تھا۔ چنانچہ سیدنا حجر بن عدی، اُن کے رفقاء اور دوسرے متبعینِ مرتضیٰ ؑ پر جو مظالم ہوئے وہ سب صلح امام حسن کے بعد ڈھائے گئے تھے۔

کتاب وسنت پر عمل کرنا ہوگا

امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی جانب سے سب سے بڑی، جامع اور اہم شرط یہ تھی کہ اُنہوں نے معاویہ سے عہد لیا تھا کہ اُسے اُمورِ خلافت کتاب وسنت کے مطابق چلانا ہوں گے۔ چنانچہ علامہ ابن بطال اور دوسرے شارحین لکھتے ہیں:

> **وَقَالَ الْحَسَنُ: اتَّقِ اللّٰهَ يَا مُعَاوِيَةَ! عَلٰى أُمَّةِ مُحَمَّدٍ، لَا تُفْنِيهِمْ بِالسَّيْفِ عَلٰى طَلَبِ الدُّنْيَا وَغُرُوْرٍ فَانِيَةٍ زَائِلَةٍ، فَسَلَّمَ الْحَسَنُ الْأَمْرَ إِلٰى مُعَاوِيَةَ وَصَالَحَهُ وَبَايَعَهُ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ عَلٰى إِقَامَةِ كِتَابِ اللّٰهِ وَسُنَّةِ نَبِيِّهٖ.**
>
> "امام حسن ؑ نے فرمایا: معاویہ! اُمتِ محمد ﷺ کے معاملہ میں خدا کا خوف کر! اُنہیں دنیا طلبی اور فانی وزائل ہو جانے والے غرور کی خاطر فنا نہ کر! پھر امام حسن نے معاملہ معاویہ کے سپرد کر دیا، اُس سے مصالحت کر لی اور کتاب اللہ اور سنّتِ مصطفیٰ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قائم رکھنے کی شرط پر اُس کی بات سننے اور ماننے کی بیعت کر لی''۔

(شرح ابن بطال على البخاري ج٨ص٩٧؛التوضيح لابن الملقن ج١٧ص٧٧،٧٨؛عمدة القاري(السحار للطباعة والنشر)ج١٢ص٧٠١؛فتح الباري ج١٦ص٥٣٠؛حاشية التأودي ابن سودة على البخاري ج٦ص٣٧١؛الإذاعة لما كان ومايكون بين يدي الساعة ص٧٤)

معاویہ کسی کو اپنا ولی عہد نہیں بنائے گا

بعض کتب میں قرآن وسنت کے ساتھ ساتھ خلفاء راشدین کی سیرت پر چلنے کی شرط بھی مذکور ہے اور بالخصوص یہ بھی مذکور ہے کہ معاویہ اپنے بعد کسی کو از خود اپنا ولی عہد نہیں بنائے گا بلکہ اہل اسلام کی مجلسِ شوریٰ جس کو چاہے گی اُسی کو امت پر خلیفہ بنائے گی۔ چنانچہ تردید روافض میں شہرت یافتہ مصنف علامہ ابن حجر شافعی مکی اور علامہ ابن الصباغ مالکی مکی لکھتے ہیں:

هٰذَا مَا صَالَحَ عَلَيْهِ الْحَسَنُ بْنُ عَلِيٍّ رضی اللہ عنہ مُعَاوِيَةَ بْنَ أَبِيْ سُفْيَانَ ، صَالَحَهُ عَلٰى أَنْ يُسَلِمَ إِلَيْهِ وِلَايَةَ الْمُسْلِمِيْنَ عَلٰى أَنْ يَّعْمَلَ فِيْهِمْ بِكِتَابِ اللّٰهِ تَعَالٰى وَسُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم وَسِيْرَةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ ، وَلَيْسَ لِمُعَاوِيَةَ بْنِ أَبِيْ سُفْيَانَ أَنْ يَّعْهَدَ إِلٰى أَحَدٍ مِّنْ بَعْدِهٖ عَهْدًا ، بَلْ يَكُوْنُ الْأَمْرُ مِنْ بَعْدِهٖ شُوْرٰى بَيْنَ الْمُسْلِمِيْنَ.

''یہ صلح نامہ ہے جس پر حسن بن علی رضی اللہ عنہ نے معاویہ بن ابوسفیان کے ساتھ صلح کی ہے، اُنہوں نے اس بات پر اُن سے صلح کی ہے کہ وہ مسلمانوں کی حکومت اُنہیں سونپ دیں گے، اس شرط پر کہ وہ مسلمانوں میں کتابِ الٰہی، سنتِ نبوی اور ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کی سیرت کے مطابق عمل کریں گے، اور معاویہ بن ابوسفیان کو یہ اختیار نہیں ہوگا کہ وہ کسی سے اپنے بعد ولی عہدی کا معاہدہ کریں بلکہ یہ معاملہ اُن کے بعد مسلمانوں کی مجلس شوریٰ میں طے ہوگا''۔

(الصواعق المحرقة ص٣٩٨،٣٩٩،وط:ص٣٩٩؛الفصول المهمة في معرفة أحوال الأئمة

ص ۱۵٤ ،وط: ج۲ ص ۷۲۸، ۷۲۹)

اِس سے امام پاک کی دوراندیشی ظاہر ہوتی ہے کہ اگر امام پاک معاویہ سے پہلے ہی دنیا سے چلے جائیں تو پھر معاویہ پر لازم ہوگا کہ وہ معاملہ ٔ خلافت کو شوریٰ کے سپرد کرے۔

اِس سے بعض اُن نام نہاد حکماء امت کی بھی تردید ہوتی ہے جنہوں نے یزید کے ولی عہد بنائے جانے کو قرآن کے مطابق سنت انبیاء اور سنتِ ابی بکر لکھ مارا۔ اگر یہ معاملہ کتاب وسنت کے مطابق ہوتا تو سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ کتاب وسنت کے خلاف کیوں شرط طے کرتے؟ اور معاویہ جس کی شان میں "اَللّٰهُمَّ عَلِّمْ مُعَاوِيَةَ الْكِتَابَ" جیسی روایات بیان کی جاتی ہیں، وہ اِس قسم کی غلط شرط کو کیوں تسلیم کرتے جو قرآن مجید، گزشتہ انبیاء کے طریقے اور خلیفہ ٔ اول سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی سنت سے ثابت ہوتی؟ وہ تو برملا امام حسن کو ٹوکتے ہوئے کہتے: اے حسن بن علی! خدا کا خوف کیجئے، آپ ایسی شرط کیوں عائد کررہے ہیں جو کتاب وسنت کے خلاف ہے؟

خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے طریقے پر چلنا ہوگا

ابن حجر مکی کے کلام میں یہ شرط اِس اہمیت کی حامل ہے کہ اس کا ذکر الگ عنوان سے کیا جائے۔ کتاب وسنت پر چلنے کی شرط کے ساتھ ساتھ سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کا "وَسِيرَةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ" کا جملہ بھی باقاعدہ شامل رکھنا بڑی باریک بینی کی دلیل ہے، کیونکہ سب لوگ قرآن وسنت کے علوم سے بہرہ ور نہیں ہوتے لیکن اکثر لوگ پیشرو حکمرانوں کے اچھے اور برے طرزِ حکومت سے ضرور باخبر ہوتے ہیں۔

معاویہ کے بعد معاملہ شوریٰ طے کرے گی

مذکور الصدر شرط کی طرح شوریٰ والی شرط بھی اہمیت کی حامل ہے، لہٰذا اِس کا ذکر بھی الگ عنوان سے کررہا ہوں۔ سیدنا امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ نے اِن الفاظ میں اِس شرط کو معاہدہ میں شامل کیا تھا:

وَلَيْسَ لِمُعَاوِيَةَ بْنِ أَبِي سُفْيَانَ أَنْ يَّعْهَدَ إِلىٰ أَحَدٍ مِّنْ بَعْدِهٖ عَهْدًا ،

بَلْ يَكُوْنُ الْأَمْرُ مِنْ بَعْدِهٖ شُوْرٰى بَيْنَ الْمُسْلِمِيْنَ.

''اور معاویہ بن ابوسفیان کو یہ اختیار نہیں ہوگا کہ وہ کسی سے اپنے بعد ولی عہدی کا معاہدہ کریں بلکہ یہ معاملہ اُن کے بعد مسلمانوں کی مجلس شوریٰ میں طے ہوگا''۔

(الصواعق المحرقة ص۳۹۸، ۳۹۹، وط: ص۳۹۹؛ الفصول المهمة في معرفة أحوال الأئمة ص۱۵٤، وط: ج۲ ص۷۲۸، ۷۲۹)

اِس اہم شرط کی بھی دھجیاں اُڑائی گئی تھیں، جیسا کہ عنقریب تفصیل آئے گی۔

مولا علی علیہ السلام پر سب وشتم نہیں کیا جائے گا

جو لوگ اہلبیتِ معاویہ کے گیت گاتے نہیں تھکتے، اُنہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ جب سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے تحفّظِ خونِ مسلمین کی خاطر اقتدار معاویہ کو سپرد کرنا چاہا تو جہاں دوسری شرائط لکھی گئی تھیں وہیں اُس لائق وفائق اور ہادی ومہدی انسان کے ساتھ باقاعدہ ایک شرط یہ بھی طے کرنا ناگزیر سمجھا گیا تھا کہ وہ مولیٰ علی علیہ السلام پر سبّ وشتم سے باز آجائے گا۔ چنانچہ علامہ قلقشندی لکھتے ہیں:

وَكَانَ مَشْرُوْطُهٗ عَلَيْهِ أَنْ لَّا يَسُبَّ عَلِيًّا.

''اور اُس پر یہ شرط عائد کی گئی تھی کہ وہ سیدنا علی علیہ السلام کو برا نہیں کہے گا''۔

(مآثر الإنافة في معالم الخلافة ج۱ ص۱۰۸)

امام ابن اثیر جزری اور دوسرے حضرات لکھتے ہیں:

وَأَنْ لَّا يُشْتَمَ عَلِيٌّ، فَلَمْ يُجِبْهُ إِلَى الْكَفِّ عَنْ شَتْمِ عَلِيٍّ، فَطَلَبَ أَنْ لَّا يُشْتَمَ وَهُوَ يَسْمَعُ فَأَجَابَهٗ إِلٰى ذٰلِكَ ثُمَّ لَمْ يَفِ لَهٗ بِهٖ أَيْضًا.

''اور یہ کہ سیدنا علی علیہ السلام کو برا نہیں کہا جائے گا تو اُنہوں نے شتمِ علی سے باز رہنے کی شرط کو قبول نہ کیا۔ پھر امام صاحب نے فرمایا کہ جب وہ سن رہے ہوں تو اُنہیں برا نہ کہا جائے تو اِس بات کو معاویہ نے قبول کرلیا، پھر اِس کو بھی پورا نہ کیا''۔

(الكامل في التاريخ ج۳ ص٦؛ المختصر في أخبار البشر ج۱ ص۱۸۳؛ تاريخ دمشق ج۱۳

ص ٢٦٤ ؛العبر في أخبار من غبر للذهبي ج١ ص ٣٥ ،وط: ص٤٨ ؛البداية والنهاية ج١١ ص ١٣٢ ،١٣٣ ؛تاريخ ابن الوردي ج١ ص١٦٦)

سبّ وشتم سے باز آنے کی شرط کو تو کیا بادشاہ سلامت نے کسی بھی شرط کو پورا نہیں کیا تھا، جیسا کہ عنقریب اِس بات کی تصریح آرہی ہے۔

کچھ مالی شرائط

اکثر کتب میں اِس موقع پر بعض مالی شرائط کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ مثلاً حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

فَاشْتَرَطَ أَنْ يَّأْخُذَ مِنْ بَيْتِ مَالِ الْكُوْفَةِ خَمْسَةَ آلَافِ أَلْفِ دِرْهَمٍ ، وَأَنْ يَّكُوْنَ دَارُ أَبْجَرْدَ لَهُ ، وَأَنْ لَّا يُسَبُّ عَلِيٌّ وَهُوَ يَسْمَعُ ، فَإِذَا فَعَلَ ذٰلِكَ نَزَلَ عَنِ الْأَمْرِ لِمُعَاوِيَةَ ، وَيَحْقِنُ دِمَاءَ الْمُسْلِمِيْنَ.

''امام حسن علیہ السلام نے شرائط عائد فرمائیں کہ وہ کوفہ کے بیت المال سے پانچ لاکھ درہم لیں گے اور دارابجرد اُن کے لیے ہوگا اور یہ کہ جب وہ سن رہے ہوں تو سیدنا علی علیہ السلام کو سبّ وشتم نہیں کیا جائے گا، پس جب یہ شرائط قبول کی جائیں گی تو وہ معاویہ کے لیے اُتر جائیں گے اور مسلمانوں کے خون کو محفوظ بنائیں گے''۔

(البداية والنهاية ج١١ ص١٣٢، ١٣٣)

شرائطِ مذکورہ پر عمل کتنا ہوا؟

سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام اور معاویہ کے درمیان طے پانے والے معاہدہ کی جو موٹی موٹی شرائط اب تک ذکر کی گئیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ خلافت پھر امام حسن کو لوٹا دی جائے گی

۲۔ کتاب وسنت کے مطابق چلنا ہوگا

۳۔ خلفاءِ راشدین علیہم السلام کے طریقے پر چلنا ہوگا

۴۔ معاویہ کے بعد خلافت کا معاملہ شوریٰ طے کرے گی

۵۔ مولا علی علیہ السلام پر سب وشتم نہیں کیا جائے گا

۶۔ کچھ مالی شرائط

پہلی شرط کی دھجیاں کیسے اُڑائی گئیں؟

اِن میں سے کس شرط پر کتنا عمل ہوا؟ آیئے! خود ہی دیکھ لیجئے۔ پہلی شرط یہ تھی کہ خلافت پھر امام حسن کو لوٹا دی جائے گی اِس پر یوں عمل ہوا کہ موصوف نے اپنی موت سے دس گیارہ برس قبل ہی یزید کی ولی عہدی کے لیے کوششیں شروع کر دی تھیں۔ چنانچہ امام ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

وَكَانَ مُعَاوِيَةُ قَدْ أَشَارَ بِالْبَيْعَةِ إِلَىٰ يَزِيْدَ فِيْ حَيَاةِ الْحَسَنِ ، وَعَرَّضَ بِهَا وَلٰكِنَّهُ لَمْ يَكْشِفْهَا وَلَا عَزَمَ عَلَيْهَا إِلَّا بَعْدَ مَوْتِ الْحَسَنِ.

''معاویہ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی حیات میں ہی یزید کی بیعت کی طرف اشاروں سے کام لیتا تھا لیکن اُس نے اس پر عزم امام حسن علیہ السلام کی شہادت کے بعد کیا تھا''۔

(الاستیعاب ج۱ ص۲۴۳)

یاد رہے کہ امام ابن اثیر اور حافظ ابن کثیر نے امام حسن علیہ السلام کی شہادت ۴۹ھ میں لکھی ہے۔

(الکامل فی التاریخ ج۳ ص۵۸؛ البدایة والنهایة ج۸ ص۳۲)

صلح نامہ میں معاہدہ یہ طے پایا تھا کہ معاویہ اپنے بعد کسی کو اپنا ولی عہد مقرر نہیں کریں گے مگر اُنہوں نے اپنی وفات سے گیارہ بارہ سال قبل ہی اِس معاہدہ کی خلاف ورزی شروع کر دی تھی اور اِس پر کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ اُنہیں یزید کی ولی عہدی اس قدر محبوب تھی کہ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کو زہر سے شہید کیا گیا تو موصوف کو قلبی راحت حاصل ہوئی اور اُن کی اچانک شہادت کو مصیبت ہی نہ سمجھا، جیسا کہ ہم اس قبل سنن ابی داود وغیرہ سے صحیح حدیث نقل کر چکے ہیں۔

دوسری شرط کا حشر ونشر

دوسری شرط یہ تھی کہ کتاب وسنت کے مطابق چلنا ہوگا اِس کو پہلی شرط کی عدم تکمیل سے ہی جانا جاسکتا ہے۔ کتاب وسنت میں جس قدر عہد کی پاس داری پر زور دیا گیا ہے وہ اہل علم پر مخفی نہیں، تاہم اِس سلسلے میں کچھ تصریحات اِس بحث کے اختتام پر پیش کی جائیں گی۔ علاوہ ازیں موصوف کے دور میں سود، شراب، قتلِ ناحق، مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور یمن وغیرہ پر ناحق چڑھائی کی گئی اور مسلم خواتین تک کو لونڈی بنایا گیا۔ کیا یہ کتاب وسنت پر عمل ہے؟ بعض علماء کرام نے تو موصوف کو اِس سے قبل یعنی ۳۷ھ میں ہی قرآن وسنت کا تارک قرار دیا ہے، جیسا کہ کتابِ ھٰذا کے ابتدائی صفحات میں ملا علی قاری کی طویل عبارت گذر چکی ہے۔ مزید تفصیل کے لیے راقم الحروف کی کتاب "الأحاديث الموضوعة في فضائل معاوية" کا مطالعہ کیا جائے۔

تیسری شرط کا ستیاناس

شرطِ سوم یہ تھی کہ خلفاءِ راشدین ؓ کے طریقے پر چلنا ہوگا، اِس شرط کا ایسا ستیاناس کیا گیا کہ قیامت تک اُس کی نحوست جاری وساری رہے گی۔ خلفاء راشدین ؓ میں سے ہر ایک کی اولاد اُن کے وصال کے وقت عاقل، بالغ، صالح اور لائق موجود تھی مگر اُن میں سے کسی نے بھی اپنے لائق فرزند کو اپنا ولی عہد بنانا مناسب نہ سمجھا جبکہ موصوف اپنے شرابی، کبابی، زانی اور نالائق بیٹے کو اپنے زمانۂ صحت ہی میں اپنا ولی عہد بنا گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اوّلاً تو اہل اسلام کے سیاسی گروپ بنے اور پھر وہی سیاسی گروپ مذہب میں تبدیل ہوگئے، اور آج تک شیعہ، نواصب، خوارج اور روافض کا دنگا فساد اُسی ولی عہدی کی نحوست ہی کی وجہ سے چل رہا ہے اور قیامت تک چلے گا۔ اگر اہل تحقیق ودانش لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ سارے فرقے اور مذہبی دنگا فساد اُس دور سے لے کر تا حال جاری ہے تو پھر یہاں اُس فرمانِ نبوی ﷺ میں ایک مرتبہ پھر غور فرمالیجئے جو اِس سے قبل بھی ذکر ہو چکا ہے:

إِذَا وُسِّدَ الْأَمْرُ إِلیٰ غَيْرِ أَهْلِهٖ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ.

''جب معاملہ نالائق کو سونپ دیا جائے تو قیامت کا انتظار کرو''۔

(بخاري ص١٦ حديث٥٩)

خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کی سیرت پر چلنے کی شرط کیوں؟

امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کی سیرت پر عمل پیرا ہونے کی شرط کو جو لازم رکھا اُسی میں ساری خیر تھی اور معاویہ اُس سیرت سے بے خبر نہیں تھے مگر حیرت ہے کہ اُنہوں نے شرائط معاہدہ کو تسلیم کر لینے کے باوجود اُس سیرت پر عمل نہ کیا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی لکھتے ہیں:

''حضرت معاویہ خلافتِ خاصہ کے بعضے مقاصد جانتے تھے مگر اُن کو اجراء نہ کر سکے''۔

(إزالة الخفاء عن خلافة الخلفاء ج١ ص٥٧٤)

یعنی خلفاءِ راشدین رضی اللہ عنہم کی مکمل سیرت پر چلنا تو کجا اُنہوں نے بعض مقاصد پر بھی عمل نہ کیا۔ شاہ صاحب ایک اور مقام میں لکھتے ہیں:

لِأَنَّهُ كَانَ عَلٰى سِيْرَةِ الْمُلُوْكِ ، لَا عَلٰى سِيْرَةِ الْخُلَفَاءِ قَبْلَهُ.

''اس لیے کہ وہ بادشاہوں کے طریقے پر تھے، اپنے پیشرو خلفاء کرام رضی اللہ عنہم کے طریقہ پر نہیں تھے''۔

(حجة الله البالغة ج٢ ص٥٨١؛ وط: ج٢ ص٣٣١)

علامہ پرہاروی کی تضاد بیانی

اِس سلسلے میں علامہ عبدالعزیز پرہاروی کا یہ اعترافی کلام بھی قابلِ ذکر ہے، وہ اپنے ممدوح کے دفاع میں لکھتے ہیں:

وَأَمَّا مُعَاوِيَةُ فَهُوَ وَإِنْ لَمْ يَرْتَكِبْ مُنْكَرًا لٰكِنَّهُ تَوَسَّعَ فِي الْمُبَاحَاتِ وَلَمْ يَكُنْ فِيْ دَرَجَةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ فِيْ أَدَاءِ حُقُوْقِ الْخِلَافَةِ ، لٰكِنْ عَدَمُ الْمُسَاوَاةِ بِهِمْ لَايُوْجِبُ قَدْحًا فِيْهِ.

”رہے معاویہ تو وہ اگرچہ کسی برائی کے مرتکب نہیں ہوئے لیکن اُنہوں نے مباحات میں وسعت کردی تھی اور وہ حقوقِ خلافت کی ادائیگی میں خلفاء راشدین کے درجہ میں نہیں تھے، لیکن اُن کی خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے ساتھ عدم مساوات اُن کے بارے میں کسی قسم کے عیب کا موجب نہیں“۔

(النبراس علی شرح العقائد ص ۵۱۰)

کیا ”وَلَمْ يَكُنْ فِيْ دَرَجَةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ“ (وہ خلفاء راشدین کے درجہ میں نہیں تھے) کے الفاظ سے اُن کے لیے یا کسی بھی بادشاہ کے لیے تمام منکرات مباح ہو سکتے ہیں؟ پھر پرہاروی صاحب کا یہ جملہ ”وَإِنْ لَمْ يَرْتَكِبْ مُنْكَرًا“ (وہ اگرچہ کسی برائی کے مرتکب نہیں ہوئے) کس قدر خلاف واقعہ ہے؟ ذرا انصاف تو فرمایئے کہ اہل بیت کرام علیہم السلام پر سبّ وشتم کرنا، سیدنا حجر بن عدی اور اُن کے رفقاء رضی اللہ عنہم کو ناحق قتل کرنا، خلیفۂ راشد کے خلاف بغاوت کرنا، خطبہ عیدین کو نماز عید پر مقدم کرنا، امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیے ہوئے تمام وعدوں کو پس پشت ڈال دینا اور نظام انتخاب کو موروثیت میں تبدیل کرنا وغیرہ امور منکرات (برائیاں) نہیں تو کیا معروفات (بھلائیاں) ہیں؟

علامہ پرہاروی صاحب اور اُن جیسے دوسرے لوگوں سے پوچھا جائے کہ اگر کوئی غیر صحابی شخص خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے طرز پر حقوقِ خلافت ادا کرنے میں کامیاب ہو جائے تو کیا اُس کی ایسی کامیابی اُس کی فضیلت کا موجب ہوگی یا نہیں؟ اگر جواب ہاں میں ہو تو پھر کسی صحابی کہلانے والے شخص کا خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے طرزِ عمل پر پورا نہ اُترنا، یا اُن کی سیرت سے منحرف ہو کر کتاب وسنت کا تارک ہونا اُس کے لیے موجبِ عیب کیوں نہیں ہوگا؟

تعجب ہے کہ علامہ پرہاروی اور اُن کی مثل دوسرے لوگ ایک طرف تو معاویہ بن ابی سفیان کو نجباء، مجتہد، ھادی اور مھدی قرار دیتے ہیں اور اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان میں واردشدہ احادیث میں شامل کرتے ہیں، جیسا کہ اُنہوں نے لکھا ہے:

قَدْ صَرَّحَ عُلَمَاءُ الْحَدِيْثِ بِأَنَّ مُعَاوِيَةَ رضی اللہ عنہ مِنْ كِبَارِ الصَّحَابَةِ

وَنُجَبَائِهِمْ وَمُجْتَهِدِيْهِمْ ، وَلَوْسُلِّمَ أَنَّهُ صِغَارُهُمْ فَلَا شَكَّ فِيْ أَنَّهُ دَخَلَ فِيْ عُنْوَانِ الْأَحَادِيْثِ الصَّحِيْحَةِ الْوَارِدَةِ فِيْ تَشْرِيْفِ الصَّحَابَةِ ، بَلْ قَدْ وَرَدَ فِيْهِ بِخُصُوْصِهِ أَحَادِيْثُ كَقَوْلِهِ عَلَيْهِ الصَّلَاةِ وَالسَّلَامُ: اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ هَادِيًا مَهْدِيًّا وَاهْدِ بِهِ.

''علماء حدیث نے تصریح فرمائی ہے کہ معاویہ ﷺ کبار صحابہ کرام میں سے ہیں (وحشی، ابوسفیان اور بسر بن ابی ارطاۃ بھی طلقاء میں سے تھے، اگر اُنہیں سلطنت ملتی تو وہ بھی کبار صحابہ میں شمار کیے جا چکے ہوتے۔ فیضی) اور صحابہ کے نجباء اور مجتہدین میں سے ہیں۔ اگر اُنہیں اصاغر صحابہ کرام میں سے بھی تسلیم کیا جائے تب بھی اس بات میں کوئی شک نہیں کہ وہ اُن احادیث کے عموم میں شامل ہیں جو صحابہ کرام ﷺ کی عزت افزائی میں وارد ہوئیں، بلکہ اُن کی شان میں بالخصوص بھی احادیث نبویہ وارد ہوئی ہیں جیسا کہ آپ ﷺ کی یہ دعا: اے اللہ! اُس کو ہادی اور مہدی بنا دے اور اُس کے ذریعے دوسروں کو ہدایت دے''۔

(النبراس علی شرح العقائد ،ص ۵۵۰)

جبکہ دوسری طرف موصوف کہتے ہیں کہ اگر وہ حقوقِ خلافت کی ادائیگی میں خلفاء راشدین ﷺ کے مساوی نہیں ہو سکے تو یہ بات اُن کے بارے میں موجبِ عیب نہیں، کیونکہ وہ خلفاء راشدین ﷺ کے درجہ میں نہیں تھے۔

قارئین کرام خود انصاف فرمائیں کہ یہ کیسی تاویلات ہیں؟ یہ عاجز کچھ کہنے کی جسارت کرنے سے قاصر ہے، البتہ میرے ذہن میں اِس وقت شتر مرغ کی وہ کہانی گردش کر رہی ہے جو بچپن میں پڑھی تھی۔ **فَتَأَمَّلْ!**

نوٹ:

حدیث ترمذی: ''**اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ هَادِيًا مَهْدِيًّا وَاهْدِ بِهِ**'' موضوع ہے، تفصیل کے لیے راقم

الحروف کی کتاب "الأحاديث الموضوعة في فضائل معاوية" کا مطالعہ فرمائیے۔

خلیفہ اور ملک (بادشاہ) میں زمین و آسمان کا فرق

امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی بصیرت پر قربان، اُنہوں نے معاویہ کے ساتھ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کی سیرت پر چلنے کا معاہدہ لکھوا کر موصوف کو دنیا و آخرت میں جواب دہ بنا دیا ہے۔ امام پاک علیہ السلام پر اُن کی بصیرت کی بدولت روشن تھا کہ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے طرز پر چلنا معاویہ کے بس کا روگ ہی نہیں، اس لیے اُنہوں نے معاہدہ میں کتاب و سنت پر چلنے کی شرط کے ساتھ ساتھ یہ شرط بھی باقاعدہ لکھوالی تھی تاکہ اتمامِ حجت ہو جائے۔ اب جو لوگ ایک طرف تو معاویہ بن ابی سفیان کو خلیفہ کہتے ہیں اور جملہ صحابہ کے فضائل میں شریک مانتے ہیں اور دوسری طرف جب دیکھتے ہیں کہ وہ خلفاء راشدین کی سیرت پر نہیں چلے تو پھر کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ کوئی بات نہیں، کیونکہ وہ تو بادشاہ تھے۔ اُنہیں چاہیئے کہ وہ کوئی ایک بات کریں، اس لیے کہ بادشاہت اور خلافت میں انیس بیس کا فرق نہیں بلکہ زمین و آسمان سے بھی زیادہ فرق ہے۔ چنانچہ مولانا محمد قاسم نانوتوی صاحب لکھتے ہیں:

> "باقی رہے امیر معاویہ، ہر چند کہ اُن کو بظاہر تمکین میسر آئی، لیکن حقیقت میں وہ تمکینِ دین نہ تھی، تمکینِ مُلک و سلطنت تھی۔ چنانچہ واقفانِ فن سیر پر پوشیدہ نہیں کہ خلفائے اربعہ کے اطوار اور انداز اور امیر معاویہ کے اطوار و انداز میں زمین و آسمان کا فرق تھا، اُن کی گزران فقیرانہ اور زاہدانہ تھی اور امیر معاویہ کا طور ملوک کا سا تھا، اس لیے اہل سنت اُن کو باوجود یکہ صحابی سمجھتے ہیں خلفاء میں نہیں گنتے، ملوک میں شمار کرتے ہیں"۔

(هدية الشيعة ص ٦٦)

"زمین و آسمان کا فرق" سے کیا مراد ہے؟ یہ بات علامہ نانوتوی صاحب کی بعض دوسری تصانیف کے اقتباسات سے سمجھی جا سکتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "یہ سچ ہے کہ سنی اصحابِ اربعہ یعنی چار یار کو بترتیب معلوم جانشین حضرت سید المرسلین

صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ اجمعین سمجھتے ہیں اور خلیفۂ راشد اعتقاد کرتے ہیں، پر امیر معاویہ ؓ اور یزید پلید اور عبدالملک وغیرہ کو سنیوں میں کوئی بھی خلیفہ راشد نہیں سمجھتا"۔

(اجوبہ اربعین للنانوتوي ص ۱۸۵)

موصوف کچھ آگے چل کر لکھتے ہیں:

"بالجملہ اہل سنت خلیفہ سبھی کو کہہ دیا کرتے ہیں، اِس لفظ میں کچھ بزرگی نہیں، اس کے معنی فقط جانشین کے ہیں، سو تمہیں کہو کہ اِس میں کیا بزرگی ہے؟ اگر کسی نیک آدمی کی جگہ کوئی بدمعاش بیٹھ جائے تو اُس کو جانشین تو ضرور کہیں گے پر اُس میں کچھ بزرگی نہ نکلے گی، ہاں لفظ راشد بزرگی پر دلالت کرتا ہے۔ اِس صورت میں خلیفہ کی دو قسمیں ہوں گی: ایک خلیفہ راشد، یہ تو چار یار اور پانچویں چھ مہینے کے لیے حضرت امام حسن ؓ ہوگئے تھے۔ دوسرا خلیفہ غیر راشد، اور خلیفہ غیر راشد کو بادشاہ اور مَلِک بھی سنیوں کی اصطلاح میں کہتے ہیں۔ یزید اور عبدالملک وغیرہ سب اسی قسم کے ہیں، ہاں عمر بن عبدالعزیز البتہ مروانیوں میں سے خلیفۂ راشد ہوئے ہیں"۔

(اجوبہ اربعین للنانوتوي ص ۱۸۵)

علامہ نانوتوی صاحب کا مذکورہ بالا جملہ جو اِن الفاظ سے شروع ہو رہا ہے "اہل سنت خلیفہ سبھی کو کہہ دیا کرتے ہیں" انتہائی قابل توجہ ہیں۔ اُنہوں نے خوب فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص خلافتِ راشدہ کی طرح حکومت نہیں کر سکا یعنی خلیفۂ راشد نہیں بن سکا تو وہ خلیفہ نہیں بلکہ مَلِک اور بادشاہ ہے۔ لوگ اُس کو جو القاب دیتے رہیں اُس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ بہر حال ابن صخر خلیفہ تھے یا بادشاہ؟ وہ جو کچھ بھی تھے کتاب وسنت کا فقط اُن سے نہیں بلکہ ہر دور کے مسلمانوں سے ہر حال میں یہ تقاضا ہے کہ مسلمان کتاب وسنت اور انعام یافتہ طبقات کے طریقے پر چلیں، بلکہ سورۃ التوبۃ کی آیت نمبر سو (۱۰۰) کے مطابق جو لوگ مہاجرین وانصار ؓ کے بعد مسلمان ہوئے اُن پر بھی اور قیامت تک آنے والے تمام مسلمانوں پر بھی مہاجرین وانصار ؓ کی اتباع بطور شرط فرض کی گئی ہے، لہٰذا جو شخص حاکم ہو اُس کے لیے ایسی سیرت عامۃ الناس کی بنسبت زیادہ

لازم ہوتی ہے، کیونکہ "اَلنَّاسُ عَلیٰ دِیْنِ مُلُوْکِهِمْ" (لوگ بادشاہوں کے طریقے پر ہوتے ہیں) اور پھر جس نے معاہدہ کیا ہو اور معاہدہ کی شرائط میں باقاعدہ مرقوم شرط کو تسلیم کیا ہو کہ اُسے خلفاء راشدین ؓ کی سیرت پر چلنا ہوگا تو اُس پر اور بھی زیادہ ذمہ داری اور پابندی عائد ہو جاتی ہے، جبکہ معاویہ نے نہ صرف یہ کہ سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام سے وعدہ کیا تھا کہ وہ خلفاء راشدین ؓ کی سیرت پر چلے گا بلکہ لوگوں نے بھی اُس کی بیعت اِسی شرط پر کی تھی۔ چنانچہ محدث ابن ابی عاصم لکھتے ہیں:

قَالَ رَجَاءُ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَوْفٍ ، وَكَانَ النَّاسُ أَخَذُوا عَلَيْهِ حِيْنَ بَايَعُوْهُ أَنْ يَّسِيْرَ بِهِمْ سِيْرَةَ عُمَرَ.

"رجاء عبداللہ بن عوف سے نقل کرتے ہیں کہ لوگوں نے معاویہ کی بیعت کرتے ہوئے اُس سے عہد لیا تھا کہ وہ اُنہیں سیرت عمر ؓ پر چلائیں گے"۔

(الآحاد والمثاني لابن أبي عاصم ج ۱ ص ۳۷٦ حديث ۵۰۲)

لیکن وہ ایسے تمام معاہدات کے باوجود سیرتِ خلفاء راشدین ؓ سے منحرف ہی رہے۔

بعض نامور علماء کا تکلّف

بعض نامور اور قد آور علماء نے خلفاء راشدین ؓ کی سیرت سے انحراف کو معاویہ بن ابی سفیان کے لیے نرم بنانے کی کوشش کرتے ہوئے لکھا ہے:

"تاریخی حقائق اور خاص طور پر اُس پیچیدہ اور مبہم دَور کو سامنے رکھتے ہوئے جو حضرت عثمان ؓ کی شہادت کے بعد پیش آیا اور اسلامی معاشرہ پر اندرونی و بیرونی بدلتے ہوئے حالات کا جو ردِ عمل ہوا، اُن سب کا جائزہ لینے سے جو بات نظر آتی ہے، وہ یہ کہ حضرت معاویہ کو لوگوں کی نفسیات پہچاننے کا ملکہ اور عرصہ دراز تک حکومت کرنے کا جو تجربہ تھا، اُس نے اُن کو یقین دلایا کہ اُس وقت کے اسلامی معاشرہ کی قیادت اور وسیع اسلامی مملکت کی سربراہی (جس کے عناصر میں تنوع پیدا ہو چکا تھا اور جس کو چند در چند مسائل و مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا) خلافتِ راشدہ کے اُن خطوط

پر قائم نہیں رکھی جاسکتی تھی، جن پر خلفاء ثلاثہ ﷺ چلتے رہے، اور جن کو پوری طاقت سے نبھاتے رہے۔ حضرت معاویہؓ اس بات پر مطمئن ہوگئے کہ وقت کا تقاضا یہی ہے کہ اسلامی مملکت کو خطرات سے محفوظ رکھا جائے، امن وامان قائم رہے، غزوات وفتوحات کا سلسلہ جہاں تک جاری رہ سکتا ہے اُس کو جاری رکھا جائے اور اس کی خاطر اگر ایک شخصی موروثی مگر عادل حکومت قائم ہو جائے تو کوئی حرج نہیں ہے، حکومت اسلامی تعلیمات کے تابع ہو مگر اُس میں لچک ہو اور شریعت کا پاس واحترام بھی امکانی حد تک قائم رہے، حکومت کے انتظامیہ اور حکومت چلانے کے طریقے اور لوگوں سے معاملت کرنے کے اُصول میں توسّع سے کام لیا جائے۔ اگر ضرورت وحالات اس کے متقاضی ہیں تو اس میں کوئی نقصان نہیں ہے، مملکت تو دائرۂ اسلام سے باہر نہیں جائے گی (جس کی نوعیت اب ایک بڑی سلطنت کی ہو چکی ہے، اور وہ مختلف نسلوں، تہذیبوں اور مذاہب کے ماننے والے عناصر پر مشتمل ہے) ہوشیاری اور لچک کے ساتھ معاملات سلجھائے جائیں اور جو مشکلات سامنے آئیں اُن کو حل کرنے میں حکمتِ عملی اور مصلحتِ وقت سے مدد لی جائے، وقت ومقام کے اختلاف کو پیش نظر رکھا جائے، لہٰذا اُنہوں نے اپنی حکومت ایک مسلمان فوجی وانتظامی سربراہ کی حیثیت سے قائم کرلی۔

رسول اللہ ﷺ نے اس کی پیش گوئی بھی فرمادی تھی:

خلافة النبوة ثلاثون سنة ثم يعطي الله الملك (أو ملكه) من يشاء .

خلافت علی منہاج النبوۃ تیس (۳۰) سال رہے گی اس کے بعد اللہ ملک جس کو چاہے گا دے دے گا، ایک روایت میں ہے: اپنا ملک جس کو چاہے گا دے دے گا۔

حضرت معاویہ کو خود بھی اس کا دعویٰ نہ تھا کہ اُن کی حکومت خلفاء ثلاثہ (حضرات ابوبکر وعمر وعثمان ﷺ) کی خلافت کی طرح خلافتِ راشدہ ہے، وہ صفائی کے ساتھ فرماتے تھے کہ وہ ایک حاکم اور والیٔ سلطنت ہیں، البتہ اُن کے بعد جو حکّام اور والیانِ سلطنت

آئیں گے اُن کے طرزِ عمل کو دیکھ کر اُن کی قدر آئے گی اور کھلا فرق محسوس ہوگا''۔

(المرتضیٰ ص ۳۱۷،۳۱۸)

اربابِ عقل وفکر سے التماس ہے کہ وہ پہلے علامہ سید ابوالحسن علی ندوی کی اِس عبارت میں غور فرمائیں کہ کس طرح اُنہوں نے معاویہ بن ابی سفیان کی حکومت کے لیے "اَلنُّکْتَةُ بَعْدَ الْوُقُوْعِ" کے طور پر خلافتِ راشدہ سے انحراف کو جواز فراہم کرنے کی کوشش کی ہے؟ پھر وہ ندوی صاحب کی بعض کتب سے بنوامیہ ہی کے بعض حکمرانوں کی جائز مدح وثنا پر مبنی کلام میں بھی غور فرمائیں اور خود ہی انصاف فرمائیں کہ اُس وقت جب اسلامی مملکت مزید وسیع ہوگئی تھی اور حالات مزید بگڑ چکے تھے مگر تمام تر بگاڑ کے باوجود بنو اُمیہ ہی کے ایک فرد نے فقط ڈھائی برس میں خلافتِ راشدہ کا وہ دور لوٹا دیا تھا جس کو معاویہ بن ابی سفیان جیسے کہنہ مشق اور ماہر نفسیات قائم ہی نہیں رکھ سکے تھے۔ آیئے ذرا غور سے علامہ ندوی کی تحریر کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمایئے! وہ لکھتے ہیں:

> ''عمر بن عبدالعزیزؒ نے زمامِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی بلاتاخیر اُن چند عمّالِ حکومت کو معزول کیا جو سخت ظالم اور ناخدا ترس تھے۔ اُن کے سامنے شاہی تزک واحتشام اور جانشینی کا جو سامان پیش کیا گیا اس کو بیت المال میں داخل کیا، اور اُسی گھڑی سے اُن کی سیرت یکسر بدل گئی، اب وہ (اپنے پیش رو) سلیمان کے جانشین نہ تھے بلکہ امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے جانشین تھے، جواری اور باندیوں کو تحقیق کے بعد اُن کے خاندانوں اور شہروں کو واپس کر دیا، مظالم کا تصفیہ کیا، اور اپنی مجلس کو جس نے کسریٰ وقیصر کے دربار کی حیثیت اختیار کر لی تھی، سنت اور خلافتِ راشدہ کے نمونہ پر سادہ اور مطابق سنت بنا دیا، اپنی جاگیر مسلمانوں کو واپس کر دی، بیوی کا زیور بیت المال میں داخل کیا، اُنہوں نے ایسی زاہدانہ زندگی اختیار کی جس کی نظیر بادشاہوں میں تو کیا مل سکتی ہے، درویشوں اور فقراء میں بھی ملنی مشکل ہے''۔

موصوف ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں:

''اس زاہدانہ زندگی اور تقویٰ واحتیاط کے ماسوا اُنہوں نے حکومت کی روح بدل دی، پہلا اور بنیادی انقلاب یہ تھا کہ اُنہوں نے حکومت کا نقطۂ نظر بدلا، اُس وقت حکومت محاصل وخراج وصول کرنے اور صَرف کرنے کا ایک انتظامی ادارہ تھا، جس کو جمہور کے اخلاق وعقائد، سیرت وتربیت اور ضلالت وہدایت سے کچھ بحث نہ تھی، اِسی نقطہ کے گرد اس کا سارا نظام گردش کرتا تھا، اُنہوں نے اپنے اِس مشہور تاریخی فقرے سے کہ:

محمد ﷺ دنیا میں ہادی بنا کر بھیجے گئے تھے، تحصیل دار بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے۔ حکومت کا مزاج اور نقطۂ نظر ہی تبدیل کردیا، اور اس کو دنیاوی حکومت کے بجائے خلافتِ نبوت بنادیا''۔

(تاریخ دعوت وعزیمت ج۱ ص ۳۵،۳۷؛ رجال الفکر والدعوۃ ج۱ ص ۷۰،۷۴)

قارئین کرام سے گذارش ہے کہ علامہ ابوالحسن ندوی کی دونوں کتابوں کے اقتباسات کو بار بار پڑھیے اور موازنہ کیجیے کہ کتنا فرق ہے؟ اگر کسی شخص کو زیادہ فرق محسوس نہ ہو تو وہ اتنا ہی سمجھ لے کہ معاویہ بن ابی سفیان کو خلافتِ راشدہ کے فوراً بعد حکومت ملی تو اُنہوں نے اُس کو خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کی بجائے دنیوی حکومت بنا دیا اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو معاویہ اور اُن کے بعد والے حکمرانوں کی بگڑی ہوئی دنیوی اور کسریٰ وقیصر کی طرز پر چلنے والی حکومت ملی تو اُنہوں نے اس کو فقط اڑھائی سال کے عرصہ میں پھر سے خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کی طرز پر چلا دیا۔

علامہ سید ابوالحسن علی ندوی ایک معتدل، منجھے ہوئے اور مدبّر قلم کار تھے مگر افسوس کہ اُنہوں نے خلافتِ راشدہ کے منافی ایک دنیوی سلطنت کو جواز فراہم کرنے کی ناجائز کوشش میں مبتلا ہو کر اپنے مقام ومرتبہ کا خیال نہ کیا۔

خلیفہ اور بادشاہ کے لیے الگ الگ قانون؟

معاویہ بن ابی سفیان نے جو خلافتِ راشدہ سے عملاً انحراف کیا اور اُس کو علامہ ابوالحسن علی ندویؒ نے

جواز فراہم کرنے کی جو ناجائز کوشش کی، کیا اُس سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ معاویہ یا کسی بادشاہ سے اس کی افراط وتفریط پر اِس لیے حساب نہیں لیا جائے گا کہ وہ خلیفہ نہیں بلکہ بادشاہ تھے، اور کیا معاویہ نے امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام سے کیے گئے معاہدہ کی جو پاسداری نہ کی، اُس کا بھی فقط اس لیے حساب نہیں ہوگا کہ وہ تو بادشاہ تھے؟

- اِس وعدہ خلافی کی وجہ سے جو بھیانک حالات پیدا ہوئے اور جن کے اثرات تاحال جاری ہیں، کیا علامہ ندویؒ وغیرہ کی تقاریر وتحاریر سے اُس کی تلافی ہوسکتی ہے؟
- کیا اِس قسم کی تقریر وتحریر کو پیش کر کے علاّم الغیوب جل جلالہ کی بارگاہ سے جان چھوٹ جائے گی؟
- یہ جو قرآن مجید میں ہے:

وَأَوْفُوْا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا.

''اور پورا کیا کرو اپنے عہد کو، بے شک وعدوں کے بارے میں پوچھا جائے گا''۔

(بني إسرائيل: ٣٤)

کیا اِس مطلق سوال سے بادشاہ مستثنیٰ ہوگا اور کوئی بادشاہ یہ کہہ کر جان چھڑا سکے گا کہ وہ تو محض حاکم اور والیٔ سلطنت تھا اور خلیفہ نہیں تھا، لہٰذا اُس سے باز پرس کیسی؟

- فرض کیا اگر کوئی شخص کاتب وحی رہا ہو اور اُس نے دوسری آیات کے ساتھ ساتھ مذکورہ آیت کی کتابت بھی کی ہو تو بتلائیے! وہ ایسے سوالات سے مستثنیٰ ہوگا یا وہ دوسروں کی بنسبت زیادہ جواب دہ ہوگا؟
- کیا قیامت کے دن ''خلافة النبوة ثلاثون سنة'' وغیرہ احادیث پیش کر کے وعدہ خلافی کے سوال سے استثنا مل جائے گا؟

کیا تقدیر کا بہانہ چلے گا؟

سید ابوالحسن علی ندوی نے جو ''خِلَافَةُ النُّبُوَّةِ ثَلَاثُوْنَ سَنَةً'' حدیث پیش فرمائی ہے، کیا معاویہ بن ابی سفیان نے اسی حدیث کو مدنظر رکھتے ہوئے خلافت علی منہاج النبوۃ کا رُخ موروثی سلطنت کی طرف موڑا تھا؟ اگر کہا جائے کہ ہاں تو پھر سوال ہوگا کہ اگر از خود موڑا تھا تو یہ بہت بڑا جرم ہے اور اگر حالات ہی ایسے

ہو گئے تھے تو کیا اُنہوں نے مزاحمت کی تھی؟ اگر نہیں کی تھی تو پھر بھی بڑا جرم ہے، اور قیامت کے دن قطعاً کسی بھی شخص کا کسی بھی جرم پر تقدیر کا بہانہ نہیں چلے گا۔ بندے کا اُس کے اعمال پر ہی محاسبہ ہوگا۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

وَقُلِ اعْمَلُوا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُه وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَسَتُرَدُّوْنَ إِلٰى عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ.

''اور فرمایئے! عمل کرتے رہو، پس دیکھے گا اللہ تعالیٰ اور اُس کا رسول اور تمام مومنین تمہارے عمل کو، اور لوٹائے جاؤ گے تم اُس کی طرف جو جاننے والا ہے ہر پوشیدہ اور ظاہر کا، پس وہ آگاہ کر دے گا تمہیں اُس سے جو تم کیا کرتے تھے''۔

(التوبۃ: ۱۰۵)

مومنین عمل کو دیکھتے ہیں اور دیکھتے رہیں گے، وہ تقدیر کو نہیں دیکھ سکتے۔ کسی بندے کو خود معلوم ہی نہیں ہوتا کہ آئندہ لمحہ میں اُس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے، البتہ وہ اپنے عزم کے ساتھ جو کر گذرتا ہے اُسی پر وہ جوابدہ ہوگا۔ اِس لیے بندہ تقدیر کا نہیں اعمال کا پابند ہے۔ اس حقیقت کو علامہ ندوی کے ممدوح مفکرِ اسلام علامہ ڈاکٹر محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے بہت عمدہ انداز میں سمجھایا ہے، وہ فرماتے ہیں ۔

پابندیٔ تقدیر کہ پابندیٔ احکام؟
یہ مسئلہ مشکل نہیں، اے مردِ خردمند
اک آن میں سو بار بدل جاتی ہے تقدیر
ہے اس کا مقلد ابھی ناخوش، ابھی خورسند
تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

(ضربِ کلیم ص ٦٤؛ کلیاتِ اقبال اردو ص ٥٢٦)

شوریٰ کی شرط کا کیا حشر ہوا؟

سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے چوتھی شرط یہ لکھوائی تھی معاویہ کے بعد خلافت کا معاملہ شوریٰ طے کرے گی۔ اِس شرط کا جو ستیاناس کیا گیا وہ مت پوچھئے! موصوف نے اپنی وفات سے دس گیارہ سال قبل ہی یزید پلید کی ولی عہدی کے لیے کوششیں شروع کردی تھیں۔ ارباب عقد و حل خصوصاً حرمین شریفین کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی سے بھی اِس سلسلے میں کوئی مشورہ نہ کیا اور جو لوگ شام میں موصوف کے مقرب و درباری تھے، اُن سے مصنوعی طور پر مشورہ چاہا تو چونکہ وہ موصوف کی دلی مراد و پسند کو بھانپ گئے تھے، اِس لیے اُن میں سے بعض عقل مندوں نے کہا: اگر سچ بولیں تو آپ کا ڈر ہے اور جھوٹ بولیں تو خدا کا خوف ہے۔ چنانچہ ثقہ رواۃ امام حسن بصری رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ اُنہوں نے فرمایا:

ذَكَرُوا عِنْدَ مُعَاوِيَةَ شَيْئًا ، فَتَكَلَّمُوا ، وَالْأَحْنَفُ سَاكِتٌ ، فَقَالَ مُعَاوِيَةُ: تَكَلَّمْ يَا أَبَا بَحْرٍ! فَقَالَ: أَخَافُ اللّٰهَ إِنْ كَذَبْتُ وَأَخَافُكُمْ إِنْ صَدَقْتُ.

"لوگوں نے معاویہ کے ہاں کسی چیز کا ذکر کیا تو اُس میں خوب بحث کی مگر احنف بن قیس خاموش رہے، اس پر معاویہ نے اُنہیں کہا: اے ابو بحر! تم بھی کچھ بولو۔ اُنہوں نے فرمایا: اگر میں جھوٹ بولوں تو خدا کا ڈر ہے اور اگر سچ بولوں تو تمہارا ڈر ہے"۔

(الطبقات الكبرى لابن سعد ج۹ ص ۹٤؛ المنتظم ج٦ ص ۹۳،۹٤؛ تاريخ دمشق ج۲٤ ص ۳۲۷؛ عيون الأخبار ج۲ ص ۱۸۰؛ تهذيب الكمال ج۱ ص ٤۷۹؛ سير أعلام النبلاء ج٤ ص ۹۲؛ تاريخ الإسلام للذهبي ج٥ ص ۳٥۱؛ تذهيب تهذيب الكمال للذهبي ج ۱ ص ۲۹۱؛ كنز الدرر لابن أيبك ج٤ ص ٤٥؛ تاريخ اسلام للندوي حصه سوم ص ۲۹٤)

جو بات مذکورہ کتب میں "شَيْئًا" (کسی چیز) کے لفظ سے مبہم آئی ہے اُسی بات کو امام ابن المبرد، امام ابن اثیر جزری، علامہ ابن عبد ربہ اندلسی اور حافظ ابن کثیر نے کھول کر بیان کر دیا ہے۔ ہم اُس عبارت کا ترجمہ مولانا محمد شفیع اوکاڑوی کی کتاب سے پیش کر رہے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''حضرت امیر معاویہ نے احنف بن قیس سے جو ابھی تک خاموش تھے فرمایا: ابو البحر! تم کیا کہتے ہو؟ اُنہوں نے کہا: اگر ہم سچ کہیں تو آپ لوگوں کا ڈر ہے اور جھوٹ کہیں تو خدا سے خوف آتا ہے۔ امیر المومنین! آپ یزید کے لیل ونہار، ظاہر وباطن اور خلوت وجلوت سے خوب واقف ہیں، اگر آپ اس کو اللہ تعالیٰ اور امت کے لیے واقعی پسندیدہ وبہتر خیال کرتے ہیں تو اس کے لیے کسی سے مشورہ لینے کی ضرورت نہیں اور اگر آپ اس کے متعلق ایسی رائے اور خیال نہیں رکھتے تو راہی آخرت ہوتے ہوئے اس معاملہ کو توشۂ دنیا بنا کر اِس کے حوالے نہ کرتے جایئے۔ ویسے ہمارا کام تو یہی ہے کہ ہم کہہ دیں ''سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا'' کہ ہم نے سنا اور مانا''۔

(إمام پاك اوريزيد پليد للأوكاروي ص٣٦؛ الكامل فى التاريخ ج٣ص١٠١؛الكامل فى اللغة للمبرد ج١ ص٩٨؛ العقد الفريد ج١ ص٥٦،وج٤ ص١١١، وج٥ ص١١٧،١١٨؛ البداية والنهاية ج٨ص٨٠،مكتبة المعارف؛القول السديد في حكم يزيد للسراج أحمد سعيدي ص١٠٧)

مشورہ کی بجائے دھمکی اور کذب بیانی

ابن صخر نے حضرات عبدالرحمان بن ابی بکر، ابن عمر اور ابن زبیر رضی اللہ عنہم سے مشورہ نہیں کیا تھا بلکہ اُنہیں فقط اپنے فیصلہ سے آگاہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ بھی یزید کی بیعت کریں۔ بخاری اور دوسری کتب حدیث میں تو یہاں تک مذکور ہے کہ مسجد نبوی شریف کے منبر پر کھڑے ہو کر مروان ملعون ابن ملعون نے ابن صخر کی جانب سے یزید کی ولی عہدی کا اعلان کر دیا تو اِس پر سیدنا عبدالرحمان بن ابی بکر رضی اللہ عنہما نے اعتراض کیا اور فرمایا کہ یہ ہرقلی (کسریٰ کی) سنت ہے کہ باپ کے بعد بیٹے کو مقرر کر دیا جائے۔ اِس پر مروان ملعون نے کہا تھا: ''خُذُوْهُ'' (اِس کو دبوچ لو) یہ سنتے ہی سیدنا عبدالرحمان بن ابی بکر رضی اللہ عنہ دوڑ کر اپنی بہن ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ میں پناہ گزین ہوئے اور پھر ام المومنین رضی اللہ عنہا اور مروان کے درمیان مکالمہ ہوا، جس میں اماں پاک نے مروان کو فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روشنی میں ملعون ابن

ملعون قرار دیا۔ اِس ساری تفصیل میں آپ کو کہیں بھی یہ بات نہیں ملے گی کہ یزید یا کسی کی ولی عہدی اور خلافت کے لیے مشورہ کیا گیا ہو۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور دوسرے متعدد حضرات نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ جب اِن حضرات نے بیعتِ یزید کے مطالبہ کو مسترد کر دیا تو ابن صخر نے ان پر اپنا سپاہی کھڑا کر دیا اور اُس کو کہا کہ اب میں ایک اعلان کرنے والا ہوں، اِن میں سے کوئی بھی شخص میرے کسی جملہ کو مسترد کرنے کی کوشش کرے تو اُس کی گردن اُڑا دینا۔ پھر کھڑے ہو کر اپنی طرف سے ہی جھوٹا اعلان کر دیا کہ اِن بزرگوں نے یزید کی ولی عہدی کی بیعت کر لی ہے۔ چنانچہ شیخ محقق اور دوسرے محدثین کرام لکھتے ہیں:

> ''اس کے بعد امیر معاویہؓ نے منبر پر چڑھ کر حمد وثناء کے بعد کہا: میں نے کجرو اشخاص کی یہ باتیں سنی ہیں کہ ابن ابوبکرؓ، ابن عمرؓ اور ابن زبیر کسی قیمت پر یزید کی خلافت کی بیعت نہیں کریں گے، حالانکہ اِن حضرات نے برضا ورغبت یزید کی بیعت کر لی ہے۔ لوگوں نے باہم کہنا شروع کیا کہ ابنِ ابوبکر، ابن عمر اور ابنِ زبیر نے بیعت کر لی، حالانکہ یہ ہر سہ حضرات قسمیہ کہتے رہے کہ ہم میں سے کسی نے یزید کی بیعت نہیں کی ہے اور کیفیت یہ کہ لوگ ہاں اور نہیں یعنی مثبت ومنفی اقوال زبان پر لاتے رہے، اور امیر معاویہ مدینہ سے روانہ ہو کر مملکتِ شام واپس چلے گئے''۔

(ماثبت بالسنة عن أعمال السنة، مترجم اردو: مومن کے ماہ وسال ص۳۷، ۳۸؛ تاریخ خليفة بن خياط ص۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶؛ الأوائل لأبي هلال العسكري ص۲۳۵، ۲۳۶؛ تاريخ الإسلام للذهبي ج٤ ص۱٤۸، ۱۵۲؛ تاريخ الخلفاء للسيوطي ص۳۲٦، ۳۲۷؛ سير الصحابة للندوي ص۷۱؛ القول السديد في حكم يزيد للسراج أحمد سعيدي ص۹۳)

یہ واقعہ کافی طویل ہے اور اِس کو تین سندوں سے روایت کیا گیا ہے، اس کی ایک سند میں نعمان بن راشد ہے، اس کو ابن حبان نے ثقہ کہا ہے اور ایک قول کے مطابق ابن معین نے بھی ثقہ کہا ہے لیکن اکثر علماء کے نزدیک یہ ضعیف ہے تاہم اِس پر وضع اور کذب کا الزام نہیں ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ یہ تھا بھی

بنوامیہ کا غلام۔

(تهذيب التهذيب ملخصا ج٦ ص ٥٦١، ٥٦٢)

یہاں یہ بات یادرکھنا چاہیئے کہ ابن راشد کے بارے میں توثیق وتضعیف دونوں اقوال ملتے ہیں، گویا یہ مختلف فیہ راوی ہیں، اور محدثین نے لکھا ہے کہ جب کوئی راوی مختلف فیہ ہو تو اُس کی روایت کردہ حدیث قابل اعتبار ہوتی ہے بلکہ بعض اُس پر حدیثِ حسن کا حکم بھی لگاتے ہیں۔ چنانچہ امام منذری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

فَأَقُولُ: إِذَا كَانَ رُوَاةُ إِسْنَادِ الْحَدِيْثِ ثِقَاةٌ وَفِيْهِمْ مَنْ اُخْتُلِفَ فِيْهِ: إِسْنَادُهُ حَسَنٌ أَوْ مُسْتَقِيمٌ أَوْ لَا بَأْسَ بِهِ.

"جب سندِ حدیث کے تمام راوی ثقہ ہوں اور اُن میں کوئی مختلف فیہ راوی ہو تو میں کہتا ہوں: اس کی سند حسن یا مستقیم ہے یا اس میں کوئی حرج نہیں"۔

(الترغيب والترهيب للمنذري ج١ ص ٤)

اسی کے قریب امام زیلعی نے بھی طلق بن علی پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

وَالْحَدِيْثُ مُخْتَلَفٌ فِيْهِ، فَيَنْبَغِي أَنْ يُقَالَ فِيْهِ: حَسَنٌ، وَلَا يُحْكَمُ بِصِحَّتِهِ.

"اور یہ حدیث مختلف فیہ ہے، لہٰذا مناسب ہے کہ اس کے بارے میں کہا جائے: حسن ہے اور اس پر صحت کا حکم نہ لگایا جائے"۔

(نصب الراية لأحاديث الهداية ج١ ص ٦٢؛ قواعد في علوم الحديث للظفر أحمد عثماني التهانوي [موضّحًا] ص ٧٢)

یہ تو تھی اِس واقعہ کی اُس سند پر گفتگو جس میں نعمان بن راشد مختلف فیہ راوی ہے، یہ واقعہ اس کے علاوہ ایسی دو سندوں سے منقول ہے جس میں یہ راوی نہیں ہے۔ چنانچہ محدث خلیفہ بن خیاط کے ہاں اس کی ایک سند یہ ہے:

وَهَبُ بْنُ جَرِيْرٍ قَالَ: حَدَّثَنِيْ جُوَيْرِيَةُ بْنُ أَسْمَاءَ.

(تاريخ خليفة بن خياط ص ٢١٥)

اول الذکر کے بارے میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے بطورِ خلاصہ لکھا ہے:

ثِقَةٌ مِنَ التَّاسِعَةِ.

''نویں طبقہ کا ثقہ راوی ہے''۔

(تقريب التهذيب ص١٠٤٣)

اور ثانی الذکر کے بارے میں لکھا ہے:

صَدُوْقٌ مِنَ السَّابِعَةِ.

''ساتویں طبقہ کا ہمیشہ سچ بولنے والا آدمی ہے''۔

(تقريب التهذيب ص ٢٠٥)

محدث ابو ہلال العسکری نے اس واقعہ کو حسبِ ذیل سند کے ساتھ قلم بند کیا ہے:

أَخْبَرَنَا أَبُوْ أَحْمَدَ عَنِ الْجَوْهَرِيِّ ، عَنْ أَبِيْ زَيْدَ ، عَنْ سَعِيْدِ بْنِ عَامِرٍ ، عَنْ جورية[جُوَيْرِيَةَ]ابْنِ أَسْمَاءَ.

''ہمیں ابواحمد نے الجوہری سے حدیث بیان کی، اُنہوں نے ابوزید سے، اُنہوں نے سعید بن عامر سے اور اُنہوں نے جویریہ بن اسماء سے روایت کیا ہے''۔

(الأوائل لأبي هلال العسكري ص ٢٣٥)

یہ کل پانچ راوی ہیں:

۱۔ ابواحمد: ان کا مکمل تعارف یہ ہے: محمد بن عبداللہ بن زبیر بن عمر بن درہم اسدی الزبیری الکوفی۔ اِن سے روایت کرنے والوں میں جوہری کا نام بھی آتا ہے۔

(تهذيب التهذيب ٥ ص ٦٦٥)

حافظ صاحب ان کے متعلق تمام اقوال کا نتیجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ثِقَةٌ ثَبْتٌ ، إِلَّا أَنَّهُ قَدْ يَخْطِيءُ فِيْ حَدِيْثِ الثَّوْرِيِّ.

''ثقہ اور ثبت ہیں، الا یہ کہ ثوری سے حدیث کی روایت میں کبھی غلطی کر جاتے ہیں''۔

(تقريب التهذيب ص ۸٦١)

خیال رہے کہ زیر بحث سند میں ثوری نہیں ہے، لہٰذا اِس سند میں ''قَدْ يَخْطِيءُ'' کا خدشہ نہ رہا۔

۲۔ دوسرے راوی الجوہری ہیں۔ ان کا پورا نام یہ ہے: عبداللہ بن اسحاق الجوہری ابو محمد بصری، اِن سے روایت کرنے والوں میں ابو زید الہروی کا نام بھی آتا ہے۔ حافظ رحمہ اللہ ان کے متعلق لکھتے ہیں:

ثِقَةٌ حَافِظٌ.

''ثقہ حافظ ہیں''۔

(تقريب التهذيب ص ٤٩١)

۳۔ تیسرے راوی ابو زید ہیں۔ ان کا پورا نام یہ ہے: سعید بن ربیع حرشی عامری ابو زید ھروی بصری۔ یہ صحیحین کے راوی ہیں، حافظ ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

ثِقَةٌ مِنْ صِغَارِ التَّاسِعَةِ.

''ثقہ ہیں، نویں طبقہ کے کم عمر لوگوں میں سے ہیں''۔

(تقريب التهذيب ص ۳۷۷)

۴۔ چوتھے راوی سعید بن عامر ضبعی ابو محمد بصری ہیں۔ حافظ ان کے متعلق لکھتے ہیں:

ثِقَةٌ صَالِحٌ ، وَقَالَ أَبُوْ حَاتِمٍ رُبَمَا وَهَمَ.

''ثقہ صالح ہیں اور ابو حاتم نے کہا: بعض مرتبہ وہم کا شکار بھی ہوتے تھے''۔

(تقريب التهذيب ص ۳۸۱)

یحییٰ بن معین نے کہا ہے:

الثِّقَةُ الْمَأْمُوْنَ. ''ثقہ محفوظ ہیں''۔

(تهذيب التهذيب ج۳ص ٦٥٩)

اِس سند کے پانچویں راوی جویریہ بن اسماء ہیں، یہ بخاری اور مسلم کے راوی ہیں اور مذکورہ بالا راوی سعید بن عامر کے ماموں ہیں۔ ان کے بارے میں پہلے لکھا جاچکا ہے کہ یہ صدوق ہیں۔

شاہی لغت میں رضا ور غبت کا مفہوم

یاد رہے کہ اِس روایت میں ہے کہ اوّلین سلطانِ اسلام نے مذکورہ بالا حضرات کے بیعت نہ کرنے کے باوجود اُن کی طرف سے ازخود جو اعلانِ بیعت کیا اور اُس کو برضا ور غبت کا نام دیا، اُس برضا ور غبت کی اصل حقیقت کیا تھی؟ اِس کو امام ابن اثیر جزری نے کھول کھول کر بیان کردیا ہے۔ ہم اُن کی عبارت کا ترجمہ غزالیٔ زماں علامہ سید احمد سعید شاہ کاظمی ملتانی رحمۃ اللہ علیہ کے تلمیذ و مرید سراجِ اہل سنت علامہ سراج احمد سعیدی کی کتاب سے نقل کررہے ہیں۔ وہ شام و عراق وغیرہ اور حجازِ مقدس میں بیعتِ یزید کے لیے معاویہ بن ابی سفیان کی کوششوں کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

> ''حضرت عبداللہ بن زبیر (رضی اللہ عنہما) نے (معاویہ کو) جواب میں کہا: آپ تین کاموں میں ایک کام کیجئے: یا تو نبی ﷺ کی طرح کسی کو جانشین نہ بنایئے، لوگ خود اس طرح کسی کو اپنا خلیفہ بنالیں گے جس طرح اُنہوں نے حضرت ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کو بنایا تھا۔ یا پھر وہ طریقہ اختیار کیجئے جو حضرت ابوبکر (رضی اللہ عنہ) نے کیا کہ اپنی جانشینی کے لیے حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) جیسے شخص کو مقرر کیا جس سے اُن کا دُور پرے کا رشتہ بھی نہیں تھا۔ یا پھر وہ طریقہ اختیار کیجئے جو حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے کیا کہ چھ آدمیوں کی شوریٰ تجویز کی اور اُس میں اُن کی اولاد میں سے کوئی شامل نہ تھا۔ حضرت معاویہ نے باقی حضرات سے پوچھا: آپ لوگ کیا کہتے ہیں؟ اُنہوں نے کہا: ہم بھی وہی کہتے ہیں جو ابن زبیر نے کہا ہے۔ اِس پر حضرت معاویہ نے کہا:
>
> اب تک میں تم لوگوں سے درگذر کرتا رہا ہوں، اب میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر تم میں سے کسی نے میری بات کے جواب میں ایک لفظ کہا تو دوسری بات اُس کی زبان سے نکلنے کی نوبت نہ آئے گی تلوار اُس کے سر پر پہلے پڑ چکی ہوگی۔ پھر اپنے

باڈی گارڈ کے افسر کو بلا کر حکم دیا کہ ان میں سے ہر ایک پر ایک ایک آدمی مقرر کر دو اور اُسے تاکید کر دو کہ اِن میں سے جو بھی میری بات کی تردید یا تائید میں زبان کھولے اس کا سر قلم کر دے۔ اس کے بعد وہ اُنہیں لیے ہوئے مسجد میں آئے اور اعلان کیا کہ یہ مسلمانوں کے سردار اور بہترین لوگ ہیں جن کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کیا جاتا، یزید کی ولی عہدی پر راضی ہیں اور اِنہوں نے بیعت کر لی ہے، لہٰذا تم لوگ بھی بیعت کر لو"۔

(القول السديد في حكم يزيدص١٠٨، ١٠٩؛ الكامل فى التاريخ ج٣ص١٠٣؛ العقد الفريد ج٥ص١٢٠؛ البداية والنهاية ج٨ص٨٠؛ إمام پاك اوريزيد پليد، للاوكاروي ص٣٨)

یاد رہے کہ تلوار کے سائے تلے بیعتِ یزید کے اِس اعلان کا ذکر اُن دو روایتوں میں بھی ہے جن کے ایک ایک راوی کی ثقاہت وصداقت پر ہم ابھی ابھی کلام کر چکے ہیں۔

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے اِس واقعہ کو اختصار کے ساتھ بیان کرنے کے بعد لکھا ہے:

"غرض کسی نہ کسی طرح ۵۶ھ میں امیر معاویہؓ نے یزید کی بیعت لے کر نظامِ خلافت کا خاتمہ کر دیا"۔

(سير الصحابة ج٤ ص٧٢)

دراصل نظامِ خلافت کا خاتمہ تو صلح سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے دن ہی ہو گیا تھا اور جبر و تسلط اور ملک عضوض کا آغاز ہو چکا تھا، تاہم شاہ معین الدین احمد ندوی کی تحریر سے نظامِ خلافت کو شوریٰ سے موروثیت میں بدلنے والے شخص کا تعین ہو گیا اور واضح ہو گیا کہ نظامِ شوریٰ کی سنت کو تبدیل کرنے والا اوّل شخص کون تھا۔ اِس حقیقت کو حدیث پاک میں یوں بیان فرمایا گیا ہے:

أَوَّلُ مَنْ يُغَيِّرُ سُنَّتِي رَجُلٌ مِنْ بَنِي أُمَيَّةَ.

"اول شخص جو میری سنت کو تبدیل کرے گا بنو امیہ سے ہو گا"۔

(الأوائل لابن أبي عاصم ص٧٧ حديث٦٣؛ المصنف لابن أبي شيبة ج١٩ ص٥٥٤، ٥٥٥

حدیث ۳۷۰۲۷؛صحیح الجامع الصغیر للألباني ص ٥٠٤ حدیث ۲۵۸۲؛جمع الجوامع للسیوطي ج۳ص ۲۵۵ حدیث ۸۸۱۹؛تاریخ دمشق ج٦٥ ص ۲٥۰؛إتحاف الخیرة المهرة ج ٦ ص ٤٠٨ حدیث ٦١٦٠)

سلفی عالم ناصر الدین البانی ''مِنْ أَعْلَامِ نُبُوَّتِهِ ﷺ الْغَيْبِيَّةِ'' (نبی کریم ﷺ کا غیبی خبریں دینا) کا عنوان قائم کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

وَلَعَلَّ الْمُرَادَ بِالْحَدِيْثِ تَغْيِيْرُ نِظَامِ اِخْتِيَارِ الْخِلَافَةِ وَجَعْلِهِ وِرَاثَةً.

''شاید اس حدیث سے مراد انتخابِ خلافت کو بدلنا اور اُسے موروثی بنانا ہے''۔

(السلسلة الأحادیث الصحیحة للألباني ج٤ ص ۳۲۹،۳۳۰ حدیث ۱۷٤۹)

مشورہ تو کیا کتاب وسنت ہی مسترد

یاد رکھئے کہ سیدنا امام حسین اور دوسرے صحابہ کرامؓ کے مشورہ کو جو معاویہ بن ابی سفیان نے مسترد کیا تو اُس سے بہت کچھ مسترد ہو گیا۔ آیئے صحابہ کرامؓ اور معاویہ بن ابی سفیان کے مابین جو مکالمہ ہوا اُسے مفتی محمد شفیع عثمانی صاحب کے الفاظ میں ایک مرتبہ پھر پڑھئے۔ وہ اجتماعی طور پر ''حضرت معاویہؓ کو صحیح مشورہ کا'' عنوان قائم کر کے لکھتے ہیں:

> ''اس کے بعد حضرت حسین بن علیؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ وغیرہ خود جا کر حضرت معاویہؓ سے ملے اور اُن سے کہا کہ آپ کے لیے یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ آپ اپنے بیٹے یزید کے لیے بیعت پر اصرار کریں۔ ہم آپ کے سامنے تین صورتیں رکھتے ہیں جو آپ کے پیشروؤں کی سنت ہے:
>
> ۱۔ آپ وہ کام کریں جو رسول اللہ ﷺ نے کیا کہ اپنے بعد کے لیے کسی کو متعین نہیں فرمایا بلکہ مسلمانوں کی رائے عامہ پر چھوڑ دیا۔
>
> ۲۔ یا وہ کام کریں جو حضرت ابو بکرؓ نے کیا کہ ایک ایسے شخص کا نام پیش کیا جو نہ ان کے خاندان کا ہے نہ ان کا کوئی رشتہ دار ہے اور اس کی اہلیت پر بھی سب مسلمان

متفق ہیں۔

۳۔ یا وہ صورت اختیار کریں جو حضرت عمرؓ نے کی کہ اپنے بعد معاملہ چھ آدمیوں پر دائر کر دیا۔

اس کے سوا ہم کوئی چوتھی صورت نہیں سمجھتے نہ قبول کرنے کے لیے تیار ہیں۔

حضرت معاویہؓ کو اپنی اس رائے پر اصرار رہا کہ اب تو یزید کے ہاتھ (پر) بیعت مکمل ہو چکی ہے، اس کی مخالفت آپ کو جائز نہیں ہے"۔

(شهيد كربلا للمفتي محمد شفيع عثماني ص ١٧؛ العقد الفريد ج ٥ ص ١٢٠)

جو برسر اقتدار، جائز و ناجائز پر اُسی کا اختیار

مفتی صاحب کے آخری جملہ میں غور فرمایئے!

"حضرت معاویہؓ کو اپنی اس رائے پر اصرار رہا کہ اب تو یزید کے ہاتھ (پر) بیعت مکمل ہو چکی ہے، اس کی مخالفت آپ کو جائز نہیں ہے"۔

شاباش! اِس کو کہتے ہیں اقتدار، کیا جائز ہے اور کیا ناجائز ہے؟ اِس کا علم جتنا برسر اقتدار شخص کو ہو سکتا ہے کسی دوسرے کو نہیں ہو سکتا۔ ہر دور میں یہ تماشا دیکھا جا سکتا ہے کہ جائز و ناجائز پر اُس کا سکہ چلتا ہے جو منصب پر براجمان ہو۔ حسین بن علی، ابن ابی بکر، ابن عمر اور ابن زبیرؓ جو انتخابِ خلیفہ کی تین صورتوں کو جائز اور چوتھی صورت کو ناجائز کہتے ہیں، اِن کو کیا خبر کہ جائز کیا ہوتا ہے اور ناجائز کیا۔ تسلیم کہ یہ تمام حضرات اسلام، علم، عمل اور تقویٰ میں مقدم تھے اور یہ بھی تسلیم کہ معاویہ طلیق ابن طلیق تھا اور مجبوراً اسلام لایا تھا لیکن اِس شاہی حقیقت سے کس کو انکار کی مجال کہ "جو برسر اقتدار، جائز و ناجائز پر اُسی کا اختیار، باقی سب افکار بیکار"۔ اپنے بچپن میں غالباً مثنوی کے حوالے سے اپنے بعض بزرگوں سے یہ حکایت سنی تھی کہ:

"بیل، دنبے اور اُونٹ کی دوستی تھی، ایک مرتبے چلتے چلتے یہ تینوں دور نکل گئے اور بھوک سے نڈھال ہو گئے تھے۔ چند قدم آگے گئے تو اچانک اُن کی نگاہ پڑی کہ پک ڈنڈی پر تھوڑی سی ہری بھری گھاس پڑی تھی۔ تینوں گردن جھکا کر گھاس کو گھور گھور

کر دیکھنے لگے، گھاس اتنی کم تھی کہ اگر تینوں کھاتے تو کسی کا گذارہ نہ ہوتا۔ ان میں سے کسی نے کہا: بھائی قرعہ ڈالو، جس کے نام کا قرعہ نکل آیا گھاس کھانے کا حق دار وہی ہوگا۔ دنبے نے کہا: نہیں بلکہ جس کی عمر زیادہ ہو اِس گھاس کو کھانے کا زیادہ حق دار اُسی کو سمجھنا چاہیئے۔ بیل نے کہا: اگر تم نے لمبی عمر کی بات کی ہے تو بتاؤ تمہاری عمر کتنی ہے؟ دنبے نے کہا: ہم دو بھائی تھے: ایک سیدنا اسماعیل علیہ السلام کے فدیہ میں ذبح ہو گیا اور دوسرا میں ہوں۔ اِس پر بیل نے کہا: پھر تو تو ہمارا بچونگڑا ہے۔ اُس نے کہا: وہ کیسے؟ بیل نے کہا: جب سیدنا آدم علیہ السلام ہل چلاتے تھے تو ہم دو بھائی تھے، ایک فوت ہو گیا اور دوسرا میں ہوں۔ یہ سنتے ہی اونٹ نے گھاس کو اُوپر اُٹھالیا اور کہا: جس کی ٹانگیں بڑی، جس کا پیٹ بڑا، جس کی کوہان بڑی اور جس کی گردن بڑی تو عمر بھی اُسی کی بڑی۔ آؤ پہنچ سکتے ہو تو کھاؤ!"۔

یہ حکایت سنانے کے بعد وہ بزرگ سرائیکی زبان میں ایک منظوم کلام بھی پڑھتے تھے۔ سرائیکی داں حضرات کے ذوق کے لیے اُسے پیش کر کے دوسرے حضرات کی آسانی کے لیے اُس کا مفہوم عرض کر رہا ہوں۔ وہ فرماتے تھے۔

مُڈی فقیر دی اے، فنکار کھادی ویندے
غریب روندا بیٹھے، غدار کھادی ویندے
شام وسحر دا جھیڑا، تکرار کھادی ویندے
یاری دا وقت کتھے؟ یار کھادی ویندے

اِس کا مفہوم یہ ہے:

حق فقیر کا ہے، فنکار کھا رہا ہے
غریب رو رہا ہے، غدار کھا رہا ہے
صبح وشام کا جھگڑا، تکرار کھا رہا ہے

یاری کا وقت کہاں؟ یار کھا رہا ہے

حاکم کے "جائز" سے کتنے "جائز" ناجائز

مفتی محمد شفیع عثمانی صاحب نے اپنی عبارت میں تین نمبر قائم کیے ہیں:

- پہلے نمبر میں غور فرمائیں تو رسول اللہ ﷺ کی سنت مسترد ہوتی نظر آتی ہے۔
- مشہور آیت ﴿وَمَا اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ﴾ [الحشر: ۷] سے عملی روگردانی بھی ثابت ہو رہی ہے۔
- دوسرے اور تیسرے نمبر کے فقرے میں مزید غور فرمائیں تو شیخین کریمین رضی اللہ عنہما کی سنت مسترد ہوتی نظر آ رہی ہے۔
- "فَعَلَیْکُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ" (تم پر میری اور خلفاء راشدین کی سنت لازم ہے) سے عملی روگردانی نظر آ رہی ہے۔
- "اقْتَدُوْا بِالَّذِیْنَ مِنْ بَعْدِيْ أَبِيْ بَکْرٍ وَعُمَرَ" (میرے بعد ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی اقتدا کرنا) سے انحراف نظر آ رہا ہے۔
- اِسی انحراف کی وجہ سے قرآن مجید کی اِس آیت ﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ (التوبة: ۱۰۰) سے بھی روگردانی ہو رہی ہے۔
- ضابطۂ الٰہی ﴿اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَهْلِهَا﴾ [النساء: ۵۸] کی خلاف ورزی ثابت ہو رہی ہے۔
- قرآن و اہل بیت کے تمسک پر جو زور دیا گیا ہے اُس سے روگردانی نظر آ رہی ہے، کیونکہ ۳۷ھ میں موصوف کو سیدنا علی علیہ السلام نے کتاب و سنت کی طرف بلایا، ۴۱ھ میں امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے مسئلۂ خلافت کو مجلسِ شوریٰ میں لے جانے کا عہد لیا اور ۵۶ھ میں امام حسین علیہ السلام نے بھی اِسی بات پر زور دیا لیکن موصوف نے اِن تینوں ہستیوں کے حکم کو پس پشت ڈال دیا، جو کہ درحقیقت فرمانِ نبوی کو پس پشت ڈالنا ہے، کیونکہ

"اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ، الخ" کو فرمانِ نبوی ہے۔

بتایئے! مقتدر شخص کے "جائز" کے مقابلہ میں کتنے "جائز" ناجائز ہوئے؟ بہرحال چونکہ ابن ابی بکر، ابن عمر، ابن زبیر اور ابن علی ﷺ ایسے لکیر کے فقیر تھے کہ اُنہیں دورِ خلافت راشدہ کے جائز وناجائز کے علاوہ کچھ پتا ہی نہیں تھا، اِس لیے وہ دربارِ شاہی میں بھی اُسی پرانے جائز وناجائز کو لے کر بیٹھ گئے۔ کاش! وہ شاہی جائز وناجائز سے واقف ہوتے تو ان سے اتنی بڑی غلطی نہ ہوتی!

تقررِ یزید میں بعض حکماء امت کی فکر

انتہائی افسوس کی بات ہے کہ یزید پلید کے اِس تقرر میں معاویہ نے جو قرآن، حدیث اور خلفاء راشدین ﷺ کی سنت سے انحراف کیا اور صائب الرائے اصحاب کے مشورہ کو مسترد کر کے جبر وموروثیت کی بنیاد ڈالی، اُس کو ہمارے بعض بریلویوں نے قرآن اور سنتِ انبیاء علیہم السلام کی پیروی بنا ڈالا۔ چنانچہ ایک حکیم الامت صاحب لکھتے ہیں:

> "پہلے خلیفہ کا دوسرے کو اپنی زندگی میں خلیفہ کرنا درست ہے۔ خلافت کے چند طریق ہیں۔ رائے عامہ سے خلیفہ بننا جیسے صدیق اکبر ﷺ کی خلافت۔ پہلے خلیفہ کے انتخاب سے خلافت جیسے عمر فاروق ﷺ کی خلافت کہ صدیق اکبر ﷺ خود اپنی حیات شریف میں آپ کو خلیفہ بنا گئے۔ خاص اہل حل وعقد کے انتخاب سے خلافت جیسے خلافتِ عثمانی ومرتضوی۔ اگر امیر معاویہ ﷺ اِس انتخاب کی وجہ سے قصوروار ہیں تو حضرت ابوبکر صدیق ﷺ پر بھی یہی اعتراض آئے گا۔
>
> اپنے بیٹے کو اپنا جانشین کرنا کسی آیت یا حدیث کی رو سے ممنوع نہیں، اگر ممنوع ہے تو وہ آیت یا حدیث پیش کرو۔ آج عام طور پر صوفیاء مشائخ سلاطین اپنی اولاد کو گدی نشین اپنا جانشین بناجاتے ہیں، کیا ان مشائخ صوفیاء کرام کو فاسق کہو گے؟ غرضیکہ اپنی اولاد کو اپنا جانشین کرنا کسی آیت وحدیث کی رو سے جرم نہیں۔ اس سے پہلے امام حسن ﷺ حضرت علی ﷺ کے خلیفہ بن چکے تھے، بیٹے کا خلیفہ بننا حضرت حسن ﷺ

سے شروع ہوا۔

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے دعا کی کہ مولیٰ میرے بھائی ہارون (علیہ السلام) کو میرا وزیر بنادے:

وَاجْعَلْ لِيْ وَزِيْرًا مِنْ أَهْلِيْ ، هَارُوْنَ أَخِيْ ،اُشْدُدْ بِهٖ أَزْرِيْ،وَأَشْرِكْهُ فِيْ أَمْرِيْ.

اور میرے لیے میرے گھر والوں میں سے ایک وزیر کردے، یعنی میرے بھائی ہارون علیہ السلام کو، اُن سے میری کمر مضبوط کرا اور اُنہیں میرے کام میں شریک فرمادے۔

آپ کی یہ دعا قبول فرمائی گئی، رب نے آپ پر ناراضی نہ فرمائی کہ تم اپنوں کے لیے کوشش کیوں کرتے ہو۔

زکریا علیہ السلام نے رب العالمین سے فرزند مانگا اور دعا کی کہ وہ میرا بیٹا میرا جانشین ہو۔ یہ دعا قبول ہوئی، رب فرماتا ہے:

فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا. يَرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ.

پس مجھے اپنی طرف سے ایک وارث دے جو میرا اور آل یعقوب علیہ السلام کا وارث ہو۔

غرضیکہ اپنے فرزند اپنے بھائی اپنے اہلِ قرابت کو اپنا نائب کرنا نہ حرام ہے نہ مکروہ بلکہ اس کی کوشش کرنا اس کی دعا کرنا انبیاء سے ثابت ہے''۔

(امیر معاویه رضی الله عنه،مفتي أحمد يارخان نعيمي،ص ۸۱،۸۳)

بعض حکماءِ امت کی تردید میں عباراتِ علماء

ہمارے بعض بریلوی حکماءِ امت نے جو اپنی فکرِ عمیق پیش فرمائی ہے، ایسے باریک نکتوں اور گہری تاویلات پر فقط وکلاءِ طلقاء کو ہی ملکہ حاصل ہوتا ہے، جبکہ اُن کے برعکس جو علماء خالی خولی فکرِ اسلام اور غمِ اہل اسلام کے جذبہ سے سرشار ہوتے ہیں وہ ایسی نکتہ آفرینیوں سے محروم رہتے ہیں۔ آیئے! محض خالی خولی

جذبۂ اسلام کے حامل مگر بعض طلقاء کی عظمتوں کی معرفت سے محروم چند علماء کرام کی فکر ملاحظہ فرمائیں۔

مشہور فقیہ و فلسفی ابنِ رشد کی فکرِ اسلام

حکومتِ معاویہ اور اُس کے برے اثرات کو بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر فرح انطون نے مشہور فقیہ و فلسفی امام ابوالولید محمد بن احمد المعروف ابن رشد قرطبی مالکی رحمۃ اللہ علیہ متوفّٰی ۵۲۰ھ کا نظریہ نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

وَمِنْ رَأْيِ ابْنِ رُشْدٍ أَنَّ الْحَاكِمَ الظَّالِمَ هُوَالَّذِيْ يَحْكُمُ الشَّعْبَ مِنْ أَجْلِ نَفْسِهٖ لَامِنْ أَجْلِ الشَّعْبِ ، وَإِنَّ مِنْ شَرِّ الظَّالِمِ ظُلْمَ رِجَالِ الدِّيْنِ، وَإِنَّ أَحْوَالَ الْعَرَبِ فِيْ عَهْدِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ كَانَتْ عَلٰى غَايَةٍ مِنَ الصَّلَاحِ ، فَكَأَنَّمَا وَصَفَ أَفْلَاطُوْنُ حُكُوْمَتَهُمْ لَمَّا وَصَفَ فِيْ جَمْهُوْرِيَّتِهٖ الْحُكُوْمَةَ الْجَمْهُوْرِيَةَ الصَّحِيْحَةَ الَّتِيْ يَجِبُ أَنْ تَكُوْنَ مِثَالًا لِجَمِيْعِ الْحُكُوْمَاتِ ، وَلٰكِنْ مُعَاوِيَةَ هَدَمَ ذٰلِكَ الْبِنَاءَ الْجَلِيْلَ الْقَدِيْمَ ، وَأَقَامَ مَكَانَهٗ دَوْلَةَ بَنِيْ أُمَيَّةَ وَسُلْطَانَهَا الشَّدِيْدَ ، فَفَتَحَ بِذٰلِكَ بَابًا لِلْفِتَنِ الَّتِيْ لَا تَزُوْلُ إِلَى الآنَ قَائِمَةً قَاعِدَةً حَتّٰى فِيْ بِلَادِنَا هٰذِهِ الْأُنْدُلُسِ.

’’ابن رشد کے نظریہ کے مطابق ظالم حاکم وہ ہے جو پبلک پر اپنی خاطر حکومت کرتا ہے نہ کہ پبلک کی خاطر، اور ظالموں میں سے سب سے بدترین فساد دین کے مدعیوں کا فساد ہوتا ہے، بلاشبہ عرب کے حالات خلفاء راشدین ؓ کے دور میں بہت اچھے تھے، گویا کہ افلاطون نے اپنی کتاب جمہوریت میں جب تعریف کی تو اُن کی حکومت کی تعریف کی، وہ ایسی صحیح جمہوری حکومت تھی جس کو تمام حکومتوں کے لیے نمونہ (ماڈل) بنانا واجب ہے، لیکن معاویہ نے اُس قدیم و عظیم الشان بنیاد کو منہدم کر دیا اور اُس (اِسلامی خلافت راشدہ) کی جگہ سخت اُموی حکومت قائم کر دی، پس اُنہوں نے اُس حکومت کے ذریعے ایسے مسلسل فتنوں کا دروازہ کھول دیا جو تا حال (۵۲۰ھ

تک) جاری ہیں حتیٰ کہ ہمارے اِن شہروں اندلس وغیرہ میں بھی پہنچ چکے ہیں''۔

(فلسفة ابن رشد ص۳٦)

راقم الحروف کہتا ہے: بلکہ ہمارے دور ۱۴۴۰ھ تک بھی وہ فتنے مسلسل جاری ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی فکرِ اسلام

مولانا ابوالکلام آزادؒ کی ''اسلام اور جمہوریت'' کے نام سے ایک تصنیف ہے، اُس میں اُنہوں نے شریعتِ اسلامی کی روشنی میں حقیقی جمہوریت کے خدوخال واضح فرمائے ہیں اور حق یہ ہے کہ انتہائی اختصار کے باوجود حق ادا کر دیا ہے، اُن کا کلام ہی گواہی دیتا ہے کہ وہ واقعۃً ابوالکلام تھے۔ وہ ایک مقام پر یزید پلید کی جبری ولی عہدی کی مذمت بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''خلافتِ راشدہ کے بعد بنوامیہ کا دورِ فتن و بدعات شروع ہوتا ہے، جنہوں نے نظامِ حکومتِ اسلامی کی بنیادیں متزلزل کر دیں''۔

(اسلام اور جمہوریت ص۳٦)

ایک اور مقام پر علامہ موصوف نے کتب عقائد وکلام سے مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کتب کے مصنفین نے مسئلہ خلافت وامامتِ کبریٰ کو اُس طرح بیان نہیں کیا جیسا کہ اُس کو بیان کرنے کا حق تھا۔ اِس کے بعد اُنہوں نے یہ عنوان قائم کیا ہے: ''بنوامیہ کی بدباطنی وظلم'' پھر لکھا ہے:

''لیکن اِس اغماض سے نفسِ مسئلہ کی تضعیف صحیح نہ ہوگی، بلکہ دراصل یہ حالت بھی مثل اور بہت سی حالتوں کے، نتیجہ ہے بنی امیہ کے اُس تسلط اور احاطہ مستبدہ (شوریٰ سے انحراف) کا جس کے اثر سے ہمارے ہر فن کا لٹریچر متاثر ہوا اور بدقسمتی سے عقائد وکلام کے تو بہت سے گوشے ہیں جن سے اس کی صدائے بازگشت آج تک آرہی ہے۔ بنی امیہ کی سب سے پہلی بدعت اور اسلام ومسلمین پر اُن کا اوّلین ظلم یہ تھا کہ نظامِ حکومتِ اسلامیہ کا تختہ یکسر اُلٹ دیا اور خلافتِ راشدہ جمہوریہ صحیحہ کی جگہ مستبدہ مُلکِ عضوض کی بنیاد ڈالی۔ یہ انقلاب بہت شدید تھا اور بہت مشکل تھا کہ مُلک کو اس پر راضی

کیا جائے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ابھی موجود تھے اور خلافتِ راشدہ کے واقعات بچے بچے کی زبان پر تھے، اس لیے اُس احساسِ اسلامی کو مٹانے کے لیے تلوار سے کام لیا گیا اور جس نے قوت حق ومعروف سے زبان کھولی، اس کو زورِ شمشیر وخنجر سے چپ کرایا گیا۔ رفتہ رفتہ احساس منقلب اور خیالات پلٹنے لگے اور حقیقت روز بروز مستور ومحجوب ہوتی گئی"۔

(اسلام اور جمہوریت ص ٤٠، ٤١)

خلافتِ راشدہ کے فوراً بعد جو کاٹنے والی حکومت قائم ہوئی، اُس میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے پر سیدنا حجر بن عدی اور اُن کے رفقاء رضی اللہ عنہم کا جو حشر کیا گیا، اگر آپ اُسے مدنظر رکھیں گے تو مولانا ابوالکلام کے کلام کی حقانیت کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔

علامہ ابوالکلام ایک اور مقام پر سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی زبانی خلیفۂ برحق کے اوصاف اور عوام کے سامنے اُس کے جوابدہ ہونے وغیرہ امور کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"اللہ بنی اُمیہ سے انصاف کرے، جنہوں نے اسلام کی اُس مقدس تصویرِ مساوات کو اپنی کثافتِ اغراض ونفس سے ملوث کر دیا اور اُس کی بڑھتی ہوئی قوتیں عین دورِ عروج میں پامالِ مفاسد واستبداد ہو کر رہ گئیں "ضَلُّوْا فَأَضَلُّوْا ، فَوَيْلٌ لَّهُمْ وَ لِأَتْبَاعِهِمْ" (وہ گمراہ ہوئے تو لوگوں کو بھی گمراہ کیا، پس اُن کے لیے اور اُن کے پیروکاروں کے لیے ہلاکت ہے)"۔

(اسلام اور جمہوریت ص ٥٠)

خیال رہے کہ جن لوگوں کو مولانا ابوالکلام آزاد نے گمراہ کہا ہے، اُنہیں سیدنا علی المرتضیٰ علیہ السلام نے خلافت سنبھالنے کے آغاز میں مُضِلِّیْن (گمراہ کن) کہا تھا اور سیدنا خزیمہ بن ثابت اور سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہم نے بھی جنگ صفین میں اُنہیں گمراہ قرار دیا تھا، جیسا کہ ہم اپنی کتاب "شرح خصائص علي رضی اللہ عنہ" اور "الأحاديث الموضوعة في فضائل معاوية" میں باحوالہ لکھ چکے ہیں۔ خود اِسی کتاب میں بھی

مختصراً لکھا جا چکا ہے۔

شیخ ابوزہرہ مصری کی فکرِ اسلام

شیخ ابوزہرہ مصری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

”معاویہ بن ابوسفیان نے جن حرکتوں کا ارتکاب کیا ہے وہ بہت ہیں، اُنہوں نے اسلام کے نظام حیات میں سے شوریٰ کو نکال دیا، اُنہوں نے اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد بنا دیا، اور اِس طرح امرِ خلافت کو ایک فاسق وفاجر بادشاہ کے سپرد کر دیا، اُن کا اِدعا یہ تھا کہ یزید کو ولی عہد بنا کر وہ سنتِ ابوبکرؓ پر عمل کر رہے ہیں، کیونکہ اُنہوں نے بھی اپنے بعد عمرؓ بن الخطاب کو ولی عہد بنایا تھا، لیکن معاویہ اور ابوبکرؓ کے اِس اقدام میں بڑا واضح فرق ہے۔ یہ عمر جنہیں ابوبکرؓ نے ولی عہد بنایا تھا وہ تھے جن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

اللہ نے عمرؓ کے قلب ولسان پر حق لکھ دیا ہے۔

جبکہ یزید وہ تھا جو محرمات کے ارتکاب سے بھی پرہیز نہیں کرتا تھا۔ دراصل ابوبکرؓ نے وزراءِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سے ایک کو ولی عہد بنایا تھا، جس سے اُن کی کوئی ذاتی قرابت نہیں تھی، اور عمرؓ وہ تھے جن کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا:

جس راستے میں عمر چلتے ہیں وہاں شیطان داخل نہیں ہوتا۔

لیکن معاویہ کے ولی عہد کے بارے میں تاریخ نے جو کچھ کہا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ اسی بارے میں حضرت حسن بصری نے فرمایا تھا: معاویہ میں چار برائیاں ایسی ہیں کہ اگر اُن میں سے صرف ایک بھی ہوتی تو تب بھی وہ ہلاک کرنے کے لیے کافی تھی۔

۱۔ اُمتِ اسلامیہ پر خروج یہاں تک کہ حقِ مشورہ چھین کر اُس پر مسلط ہو جانا

۲۔ استخلافِ یزید، یعنی یزید جیسے شخص کو اپنا جانشین بنایا جو شرابی تھا، نشہ میں دُھت

رہتا تھا، ریشمی لباس پہنتا تھا، طنبورہ بجاتا تھا''۔

(الإمام الصادق ﷺ لأبي زهرة مصري ص ۱۷۰)

شیخ ابوزہرہ مصری رحمۃ اللہ علیہ کے کلام سے بریلوی حکیم الامت کے خیالات کی کافی تردید ہوچکی ہے، لیکن شیخ کے کلام سے جو یہ تأثر اُبھرتا ہے کہ معاویہ کی یہ حرکت اِس لیے ناپسندیدہ تھی کہ جس یزید کو اُنہوں نے اپنا ولی عہد بنایا تھا وہ برا آدمی تھا۔ میں کہتا ہوں: اگر یزید خبیث مکمل متقی اور پرہیزگار بھی ہوتا تو تب بھی معاویہ کا بحیثیتِ باپ اُس کو ولی عہد بنانا جائز نہ ہوتا، کیونکہ خلفاء اربعہ ﷺ بھی صاحبانِ اولاد تھے مگر اُن میں سے کسی نے بھی اپنی اولاد کو اپنا جانشین نہیں بنایا تھا، اور اُمت پر خلفاء راشدین ﷺ کی سنت کو لازمی فرمایا گیا ہے، بلکہ قرآن مجید نے تو اکثر مہاجرین وانصار ﷺ کی اتباع بھی لازم فرمائی ہے اور چاروں خلفاء ﷺ جہاں خلفاء راشدین تھے وہیں مہاجر بھی تھے۔

کیا فکرِ صدیق اور فکرِ طلیق برابر ہیں؟

شیخ ابوزہرہ مصری رحمۃ اللہ علیہ کے کلام میں یہ بات بہت اچھی ہے کہ سنت ابی بکر ﷺ کو دلیل بنانے والو! اگر بقولِ تمہارے سیدنا ابوبکر ﷺ نے اپنا ولی عہد بنایا تھا تو دیکھو تو سہی کہ کس کو بنایا تھا؟ ایک طرف اُن کے پسند فرمودہ ولی عہد میں وہ خوبیاں تھیں جو زبانِ نبوی پر جاری ہوئیں تو دوسری طرف وہ اُن کے بیٹے یا رشتہ دار بھی تو نہیں تھے؟ اِس پر راقم الحروف کہتا ہے کہ اِس کے ساتھ ساتھ یہ بھی تو دیکھا جائے کہ سیدنا عمر ﷺ کو پسند فرمانے والا خود کون تھا؟ وہ ابوبکر ﷺ تھے جو غیر اہل بیت کرام میں سب سے بڑے صدیق تھے۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ بعض لوگ طلیق کی پسند کو صدیق کی پسند پر قیاس کرتے ہیں۔ کیا ایسے لوگوں کے پاس غور وفکر کے لیے اتنی عقل بھی نہیں تھی کہ اُنہیں صدیق ﷺ اور طلیق کی فکر، نیت اور اقدام میں فرق نظر آتا؟ کیا ایسے لوگوں کے نزدیک سب کچھ راہِ الٰہی میں لٹانے والے اور یکے از مؤلفۃ القلوب (پیسے کے ذریعے مائل بہ اسلام کیے جانے والے) شخص کی سوچ، نیت، فکر اور ہمت برابر ہیں؟ صدیق اور طلیق کی فکر یکساں، عمر ﷺ ایسے مدبر کو خلیفہ بنانے کا مشورہ دے جانا اور یزید پلید کو ولی عہد نامزد کر کے مسلط کر جانا کیا یہ دونوں عمل برابر ہیں؟ واہ حکیم الامت واہ!

کیا خلیفہ اول نے بلا مشورہ اپنا ولی عہد بنایا تھا؟

خیال رہے کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے باقاعدہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی جانشینی کا حکم نہیں فرمایا تھا بلکہ اُنہوں نے تو اپنی عمر کے آخری ایام میں اُن کی خلافت کے لیے ایک رائے پیش فرمائی تھی، اور اُس میں بھی اُن کے مدنظر محض خطاب کا بیٹا عمر نہیں تھا بلکہ وہ احادیث نبویہ تھیں جو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی شان میں وارد ہوئیں، جن میں سے بعض کا ذکر شیخ ابوزہرہ کی تحریر میں آچکا ہے، جبکہ ابویزید نے یزید پلید کی ولی عہدی کا عمل اپنے مرنے سے تقریباً دس برس قبل شروع کر دیا تھا۔ بتایئے! ابویزید کے مدنظر یزید خبیث کی شان میں کون سی احادیث نبویہ تھیں؟

بعض طلقاء کے اقدام کو صدیق وفاروق رضی اللہ عنہما ایسی بے غرض ہستیوں کے اقدامات پر قیاس کرنے والوں کو شرم کرنا چاہیے۔ یہ وہ ہستیاں تھیں جن کی نگاہِ انتخاب محض انسان کی طرف نہیں جاتی تھی بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کی طرف جاتی تھی، مثلاً ایک مرتبہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

> ’’اگر میرا آخری وقت آگیا اور اُس وقت ابوعبیدہ زندہ ہوا تو میں اُس کو خلیفہ بنا دوں گا، پھر اگر اللہ تعالیٰ نے مجھ سے پوچھا کہ تو نے اُس کو امت محمدیہ پر کیوں خلیفہ بنایا تو میں عرض کروں گا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا تھا کہ ہر نبی کا ایک امین ہوتا ہے اور میرا امین ابوعبیدہ بن الجراح ہے‘‘۔

(الرياض النضرة ، باب في مناقب أبي عبيدة، ج٤ ص٣٤٩)

ایسا ہی اظہار خیال وہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی فرماتے تھے، اِس کی تفصیل ہماری کتاب ’’**شرح أسنى المطالب في مناقب علي بن أبي طالب** رضی اللہ عنہ‘‘ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ خود فرمایئے! سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے مدنظر محض سیدنا ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی شخصیت تھی یا سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد تھا؟ پھر اِسی تناظر میں انصاف وایمان سے بتایئے کہ یزید کی تقرری کے وقت اُس کے باپ کے مدنظر کیا تھا؟؟؟

لیکن ایسی سب احادیث کے باوجود بھی سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو بلا مشورہ، جبراً اور رشوت وغیرہ کے ذریعے اپنا ولی عہد نہیں بنایا تھا بلکہ اُنہوں نے بھرپور طریقے سے مشورہ کیا تھا۔ چنانچہ

مولانا ثناء اللہ امرتسری لکھتے ہیں:

''جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے محسوس فرمایا کہ وقت قریب ہے تو مدینہ اور اس کے قرب وجوار کے اربابِ بست وکشاد کی رائے معلوم کرنا شروع کیا، معتمد صحابہ سے مشورہ فرمایا، اس کے بعد ایک تحریری اعلان کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام پیش فرمایا، یہ نامزدگی خلیفۂ اول رضی اللہ عنہ کی کئی دنوں کی محنت کا نتیجہ تھی، علالت کے ایام میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا یہ بہترین مشغلہ رہا، یہ نامزدگی کئی دنوں کے گہرے غور وخوض اور اربابِ حل وعقد کے مخلصانہ مشوروں کا نتیجہ تھی۔ اسے انتخاب کہیے یا نامزدگی لیکن اس کے پیچھے شوریٰ کی مقدس قوتیں پنہاں تھیں اور اس مقدس شورائی نامزدگی سے امت کو بے حد فائدہ پہنچا۔ تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نامزدگی کے لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بچوں اور عورتوں تک کی رائے دریافت فرمائی''۔

(فتاوی ثنائیه ج۲ ص۵۸٦)

حافظ ابن عساکر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سوانح میں اور امام سیوطی سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حالات میں ''**فصل في مرضه ووفاته، ووصيته واستخلافه عمر**'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

''جب سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ بیمار ہوئے تو کھڑکی سے لوگوں کی طرف متوجہ ہوکر فرمایا: لوگو! میں نے تمہارے ساتھ ایک عہد کیا ہے کیا تم اُس پر راضی ہو؟ لوگوں نے کھڑے ہوکر کہا: ہم راضی ہیں، اِس پر سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر وہ حضرت عمر نہ ہوں تو پھر ہم راضی نہیں ہیں۔ اُنہوں نے فرمایا: وہ عمر ہی ہیں''۔

(تاريخ دمشق ج٤٤ ص٢٥٣؛ تاريخ الخلفاء للسيوطي ص ١٧٠)

ابن عساکر کی ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

وَاللّٰهِ مَا آلَيْتُ، وَلَا تَوَلَّيْتُ مِنْ جُهْدِ رَأْيٍ، وَلَا وَالَيْتُ قَرَابَةً.

''اللہ کی قسم! میں نے اِس سلسلے میں کوئی سستی کی ہے، نہ اپنی رائے ٹھونسی ہے اور نہ ہی

میں نے رشتہ داری کے طور پر ولی عہد بنایا ہے"۔

(تاریخ دمشق ج٤٤ ص٢٥٣)

حتیٰ کہ ایک روایت میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں کہ خلیفۂ اول نے اپنی آخری بیماری کے ایام میں لوگوں کو فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے میری بیعت کے متعلق تمہاری قسموں کو آزاد کر دیا ہے، میرے ساتھ تمہارے عہد کو ختم کر دیا ہے اور تمہارا معاملہ تم پر لوٹا دیا ہے، لہٰذا تم جس کو چاہو اپنا امیر بنالو، سو اگر تم میری حیات میں کوئی امیر مقرر کر لو تو یہ بہت مناسب ہوگا تا کہ تم میرے بعد اختلاف میں نہ پڑو۔ پس لوگوں نے اِس معاملہ میں گفتگو شروع کی اور اُن کی مجلس سے چلے گئے، لیکن جب وہ کسی رائے پر مستقیم نہ ہو سکے تو دوبارہ اُن کی طرف لوٹ آئے اور کہنے لگے: اے رسول اللہ کے خلیفہ! آپ بھی کوئی رائے دیں۔ فرمایا: شاید تم میری رائے سے اختلاف کرو؟ انہوں نے کہا: نہیں کریں گے۔ فرمایا: کیا پھر تم اللہ تعالیٰ سے وعدہ کرتے ہو کہ تم راضی رہو گے؟ اُنہوں نے عرض کیا: ہاں۔ فرمایا:

فَامْهِلُوْنِيْ اَنْظُرُ لِلّٰهِ وَلِدِيْنِهٖ وَلِعِبَادِهٖ.

پھر مجھے مہلت دو تا کہ میں اللہ تعالیٰ، اُس کے دین اور اُس کے بندوں کے لیے غور وفکر کرلوں"۔

(تاریخ دمشق ج٤٤ ص٢٤٨)

مولانا ابوالکلام آزاد ایک مقام پر انتخابِ خلیفہ کے طریقے بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"اِن تصریحات میں تم دیکھتے ہو کہ انتخابِ خلیفہ کے لیے انتخابِ عام ومشورہ اہل حل وعقد کے ساتھ خلیفہ سابق کی تعیین کو بھی ایک شکلِ صحیح قرار دیا ہے۔ دراصل اس میں حضرت عمرؓ کے انتخاب کی مثال پیش نظر ہے، لیکن غور کیجئے تو حضرت عمرؓ کے لیے گو حضرت ابوبکرؓ نے تحریک کی لیکن اُس پر تمام اربابِ حل وعقد اور پھر

عامۃ المسلمین نے پسندیدگی کا اظہار کیا، اس لیے وہ بھی تعیینِ شخصی نہیں بلکہ بمنزلہ انتخابِ عام کے تھا"۔

(اسلام اور جمہوریت ص ۴۱)

قارئین کرام! خود ہی انصاف فرمائیں کہ جو لوگ یزید کی غیر اسلامی، غیر شرعی اور غیر جمہوری ولی عہدی میں عملِ طلیق کو عملِ صدیق رضی اللہ عنہ کے مشابہ قرار دینے کی ناکام کوشش میں مبتلا ہیں اُن کا شمار عقل، علم، انصاف اور دیانت کے کس کھاتے میں ہوسکتا ہے؟ آپ بھی سوچ کر بتایئے گا لیکن اِس مشابہت کو بعض دردمندانِ اُمتِ مسلمہ نے کیا نام دیا ہے، درجِ ذیل سطور میں ذرا اُس میں بھی غور فرمالیجئے۔

مولانا حامد انصاری غازی کی فکرِ اسلام

مولانا محمد قاسم نانوتوی صاحب کے نواسے، قاری محمد طیب صاحب کے داماد فاضل دارالعلوم دیوبند مولانا حامد انصاری غازی لکھتے ہیں:

"اسلام میں پہلی نظیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امت کے اختیار کو باقی رکھا اور اپنے اختیار سے نامزدگی نہیں فرمائی۔ یہ نظیر امت کے لیے پہلی شے ہے، اس کو ہر حال میں باقی رکھنے پر زور دینا قانونِ سنت کا اولین منشاء ہے۔

دوسری طرف صدیقِ اکبر کا تعامل ہے، انہوں نے عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا نام تجویز کیا، اس تجویز کو ولایتِ عہد یا ولی عہدی قرار دینا ایک غیر قانونی جسارت ہے۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک نام کی جگہ چند نام تجویز کیے، لیکن یہ دونوں تجویزیں شخصی اختیار سے زیادہ امت کے اختیار پر مبنی تھیں، مطلق ولی عہدی سے ہم آہنگ نہ تھیں۔

اس قسم کی تجویز ثانوی درجہ میں قانونی حیثیت رکھتی ہے، مگر یہ اہمیت چند لازمی شرائط کے ساتھ مشروط ہے۔

پہلی شرط یہ کہ جو شخص نامزد کیا جائے وہ پیشرو امام کی پشتینی اولاد نہ ہو، خلافت راشدہ کے چاروں دَور اس پر گواہ ہیں۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے سامنے ان کے صاحبزادے کا

نام تھا مگر تجویز نہیں کیا۔ فاروق اعظمؓ نے جب شوریٰ کا حکم دیا تو ایک گوشہ سے عبداللہ بن عمر کا نام پیش ہوا مگر اُنہوں نے تصریح کردی کہ حکومت میں اُن کا کوئی حصہ نہیں، بعد کے دو انتخاب بھی اسی اصول پر مبنی تھے۔

حضرت معاویہؓ نے اپنے اثر، قوت اور تدبیر سے یزید کی ولی عہدی کو منظور کرایا اس انتخاب کے خون آشام نتائج یہ کہتے ہیں کہ یہ تقرر امت کے لیے دلیل نہیں ہوسکتا۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ حضرت معاویہ یورپین شہنشاہوں کے پڑوس میں مسلمانوں کا اقتدار قائم کررہے تھے۔ ان کا یہ قول بھی دماغ میں رہنا چاہیئے ہم نے شہنشاہیت اور سلطنت پر قناعت کرلی ہے اس قول کے بعد راہ صاف ہوجاتی ہے۔ ایک ایسی عالمگیر قوم جو انسانیت کو نبوت، قانونِ رحمت اور خلافت راشدہ کے طرز پر منظم کرنا چاہتی ہے شہنشاہیت پر قناعت نہیں کرسکتی۔ بعد کے زمانہ میں بنی امیہ اور بنی عباس کے اقتدار میں اسلام کے لیے جو پرجوش کارنامے انجام پاگئے اُس سے انکار کیے بغیر ولی عہدی کے رواج کو جائز تسلیم نہیں کیا جاسکتا''۔

(اسلام کا نظام حکومت ص ۲۵۲، ۲۵۳)

موصوف ایک اور مقام میں لکھتے ہیں:

''آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے گیارہ سال تک امامتِ کبریٰ کی پیغمبرانہ ذمہ داریوں کو پورا کیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد صدیق اکبر نے دو برس، فاروقِ اعظم نے دس برس، عثمان غنی نے گیارہ برس، علی المرتضٰی نے چھ برس۔ امامت شوریٰ اور خلافتِ راشدہ کو زندہ رکھا۔ تاریخ عالم کے یہ چاروں بڑے اصحاب صاحبِ اولاد تھے مگر انہوں نے خدا کی حکومت کی حکم برداری میں شاہی تاج وتخت کو نگاہِ غلط سے بھی نہ دیکھا۔

آخر اسلامی تاریخ کا سب سے زیادہ مکروہ واقعہ رونما ہوا۔ یہ روشنی جلد تاریکی سے بدل گئی اور فرمان ''لَا نَـرِثُ وَلَا نُوْرِثُ'' کے خلاف امارتِ شوریٰ کی جگہ پھر

مطلق العنان شاہی نے لے لی۔ دِن ڈوب گیا پھر رات آئی، وہی جو ہر جو بادشاہوں کے تاج سے بھی زیادہ قیمتی تھا مٹی ہو گیا۔ وہ لوگ جو خدا کے حکم پر تیر کی طرح گئے، بجلی کی طرح گرے اور قیصر و کسریٰ کے تاج چھین کر ہوا کی طرح واپس آئے، اُن کے جانشین رومیوں کے ایک چھوٹے سے پایۂ تخت (دمشق) میں پہنچ کر قیصر کی شہنشاہیت کا شکار ہو گئے''۔

(اسلام کا نظام حکومت ص ٤٥٦)

مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی فکرِ اسلام

اِس سے قبل مفتی محمد شفیع عثمانی صاحب کا جو طویل کلام نقل کیا گیا ہے، یہاں اُسے بھی مدنظر رکھا جائے۔ نیز یہاں فاضل دیوبند علامہ سعید احمد اکبر آبادی کے درجِ ذیل کلام میں غور و فکر کرنا بھی بہت مفید ثابت ہوگا، اُن کے کلام میں دردِ اسلام کے ساتھ ساتھ مشورہ سے انحراف کی وجہ سے اُمت جس دائمی نحوست کا شکار ہوئی، اُس کا ذکر اُنہوں نے انتہائی کرب و اضطراب کے ساتھ کیا ہے۔ چنانچہ وہ ''یزید کے لیے بیعت لینا'' عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

''یہ واقعہ اپنی حیثیت میں معمولی سا واقعہ ہے لیکن اس سے اس بات پر روشنی پڑتی ہے کہ اسلام کے اجتماعی نظام کو اُس کی اصل شکل و صورت سے منتقل کر کے کسی دوسری اور غیر واقعی شکل سے متشکل کر دینے کے باعث تدریجی طور پر ذہنیت میں اور طرزِ فکر و خیال میں کیسی کچھ تبدیلیاں پیدا ہو جاتیں ہیں اور وہ رفتہ رفتہ کس طرح بنیادوں کو ہی متزلزل کر دینے کا باعث بن سکتی ہیں، چنانچہ اس طرزِ حکومت کا سب سے زیادہ المناک نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان ہمیشہ کے لیے خلافت کے تصور سے ہی محروم ہو گئے۔ جمہور کا حقِ انتخاب، اربابِ حل وعقد کی اس باب میں مشاورت اور اس خدمت جلیلہ کے لیے امت کے کسی صالح اور موزوں ترین فرد کی تلاش و جستجو، یہ سب باتیں ایسی خواب و خیال ہو گئیں کہ آج تک اسلام کی چشمِ تمنا پھر اُسی نظارۂ روح پرور کی باز

دید کے انتظار میں نرگس کی طرح وا ہے، مگر وہ منظر لوٹ کر نہیں آتا اور سالوں بلکہ قرنوں کے ایسے تاریک پردے درمیان میں حائل ہو گئے ہیں کہ نگاہِ اشتیاق رہ رہ کے ماضی کے اُن نقوشِ جمال وعظمت کی طرف اٹھتی ہے مگر دیکھ نہیں سکتی۔

امیر معاویہؓ نے اپنی زندگی میں ہی اپنے بیٹے یزید کے لیے بیعتِ خلافت لے کر اُس طرزِ حکوت کو ایسا استوار کر دیا کہ آج تک اُس کی بنیادیں قائم ہیں۔ اُس وقت صحابہ میں اور اُن کے علاوہ تابعین میں بعض ایسے افراد موجود تھے کہ حضرت معاویہ اُن میں سے حضرت عمرؓ کی طرح چند حضرات کا یا حضرت ابوبکرؓ کی طرح کسی ایک شخص کا انتخاب فرما کر بطورِ وصیت اُن کے حق میں خلافت کی سفارش کر جاتے تو بے شبہ وہ فساد پیدا نہ ہوتا جو یزید کو خلیفہ بنانے سے پیدا ہوا اور جس کے باعث بادشاہت محض ایک خاندانی ورثہ ہو کر رہ گئی۔ خلیفہ کے لفظ میں دینی اقتدار کا مفہوم بھی شامل تھا، اس لیے بنو امیہ نے اُس لقب کو ترک نہیں کیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ خلافت تو اب ختم ہو چکی تھی اور یہ جو کچھ بھی تھا ایک فریب اصطلاح سے زیادہ اور کوئی وقعت نہیں رکھتا تھا۔

امیر معاویہؓ نے جس طرح حکومت بجبر حاصل کی تھی اسی طرح یزید کی بیعتِ خلافت بھی بجبر لی گئی، جو حضرات اس کو دل سے پسند نہیں کرتے تھے ان کو بھی بیعت کے لیے ہاتھ بڑھا دینا ہی پڑا، ملوکیت یا شخصی حکومت کا سب سے زیادہ بُرا اثر یہ ہوتا ہے کہ عوام میں حریتِ فکر اور آزادیٔ بیان کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور قہر و غلبہ اور استبداد و تشدد کی فراوانی ہو جاتی ہے، بنو اُمیہ میں ملوکیت کے یہ تمام جراثیم پائے جاتے تھے"۔

(مسلمانوں کا عُروج وزوال ص ۵۲، ۵۳)

مولانا محمد اسماعیل روپڑی کی فکرِ اسلام

اہل حدیث عالم مولانا محمد اسماعیل روپڑی لکھتے ہیں:

"خلفاء راشدین خلیفہ کے انتخاب میں بہت محتاط تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کے

انتخاب میں تو احادیث نبوی کے اشارات و کنایات سے کام لیا گیا اور حضرت عمرؓ
کی نسبت بھی قریباً یہی چیز کام آئی، بعدہ شوریٰ سے انتخاب ہوتا رہا لیکن یزید کی
امارت کے متعلق اِس اصول کی پابندی نہ کی گئی"۔

(شهید کربلا ص ۱۱)

مولانا شبلی نعمانی کی فکرِ اسلام

مولانا اسماعیل روپڑی کا مختصر اور نرم الفاظ میں یہ لکھنا کہ یزید کی امارت کے متعلق اِس اصول کی پابندی نہ کی گئی بہت گہرا جملہ ہے، کیونکہ سفہاء تو نہیں مگر عقل مند خوب جانتے ہیں کہ اصول کی پابندی نہ کرنے کا انجام انتہائی بھیانک ہوتا ہے، اِس اصول کی پابندی نہ کرنے سے اسلام کو کتنا نقصان پہنچا؟ اِس کو انتہائی مختصر مگر جامع الفاظ میں مولانا شبلی نعمانی نے یوں بیان کیا ہے:

"یزید تخت نشین ہوا، اور یہی اسلام کے سیاسی، مذہبی، اخلاقی اور روحانی اِدبار و نکبت
کی اوّلین شب ہے"۔

(سيرة النبي للشبلي نعماني ج۲ حصه سوم ص۳۹۸)

"اِدْبَار" کا معنیٰ ہے اقبال اور نیک بختی کا پشت پھیر جانا اور "نَکْبَةٌ" کا معنی ہے راہِ مستقیم سے ہٹنا۔ مولانا شبلی نعمانی نے چار لحاظ سے اِدبارِ اسلام کی بات کی ہے: سیاسی، مذہبی، اخلاقی اور روحانی۔ یزید کی تخت نشینی سے اِن چاروں کے اِدبار و نکبت کا آغاز ہو گیا تھا۔ اب یہ ہر عقل مند خود ہی غور کر سکتا ہے کہ اِس اِدبار و نکبت کا اصل سبب کون تھا؟ اگر یزید از خود تخت نشین ہوا تو پھر تو اِدبارِ اسلام کے جرم کا تمام تر بوجھ اُسی پر ہوگا اور اگر وہ کسی اور کی مدد سے تخت پر پہنچا تو پھر وہ سارا بوجھ اُسی مددگار پر آئے گا، لہٰذا معلوم کیا جانا چاہیئے کہ تقریباً ۵۰ھ سے لے کر ۶۰ھ تک یزید کو تخت تک پہنچانے کے لیے کون پاپڑ بیلتا رہا اور رشوت، دھونس و دھمکی وغیرہ کے ذریعے کون راہ ہموار کرتا رہا؟

اسلام میں استبداد کا آغاز کب ہوا؟

اہل حدیث عالم شیخ ثناء اللہ امرتسری اسلام میں مشورہ کی اہمیت پر بحث کے دوران لکھتے ہیں:

''اسلام میں شوریٰ کی اہمیت قرآن وسنت سے ظاہر ہے، ابتداءً اُمرائے بنوامیہ نے استبدادی حکومت کی داغ بیل ڈالی، اور خلافت موروثی ہوگئی، اُس وقت علماء نے اس کی مخالفت کی، استبداداور وراثت کو ناپسند کیا، لیکن عباسی حکومت میں یہ استبداد بڑھا اور پرانا ہوگیا کہ علماء کی زبانیں بند ہوگئیں، اور عام طور پر یہی سمجھا جانے لگا کہ اسلام میں آمریت اور ملوکیت ہے، شوریٰ اور رائے عامہ کی اہمیت ذہنوں سے ناپید ہو گئی، '' فَصَارَتْ بَلِيَّةً ، فَإِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ '' ، اور آج تک ذہن اس غلطی میں مبتلا ہے کہ اسلام کے نظام میں ملوکیت اور شخصی اقتدار کو اہمیت حاصل ہے''۔

(فتاوی ثنائیہ ج۲ ص ۵۸۹)

بنوامیہ کی حکومت غیر اسلامی تھی

قرآن وسنت میں جو مشورہ کی اہمیت بیان کی گئی ہے وہ محتاجِ بیان نہیں ہے، اُس کو پس پشت ڈال کر ''اِسْتِبْدَادْ'' کی داغ بیل بنوامیہ نے ڈالی، ''اِسْتِبْدَادْ'' کا معنیٰ ہے خود غرض ہونا اور اپنی ذات کو دوسروں پر ترجیح دینا۔ علماء اسلام نے ''اِسْتِبْدَادْ'' کو ''اِسْتِشَارْ'' (مشورہ حاصل کرنا) کے مقابل بیان کیا ہے، اور ظاہر ہے کہ ''استبداد'' کا اسلام میں کوئی تصور نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حقیقت شناس اور اسلام کا درد رکھنے والے علماء اسلام نے بنوامیہ کی حکومت کو غیر اسلامی حکومت قرار دینے میں کوئی تأمل نہیں کیا۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:

''بنی امیہ کی حکومت ایک غیر شرعی حکومت تھی، کوئی حکومت جس کی بنیاد جبر وشخصیت پر ہو کبھی بھی اسلامی حکومت نہیں ہوسکتی۔ اُنہوں نے اسلام، روحِ حریت وجمہوریت کو غارت کیا اور مشورہ واجتماعِ امت کی جگہ محض غلبۂ جابرانہ اور مکر وخدع پر

اپنی شخصی حکومت کی بنیاد رکھی، اُن کا نظامِ حکومت شریعتِ الٰہیہ نہ تھا“۔

(شہادت حسین للأبی الکلام آزاد ص۵۸)

﴿وَ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوىٰ﴾ کی شان والی ہستی قطعاً مشورہ کی محتاج نہیں تھی لیکن اُن کے رب جل جلالہ نے اُنہیں بھی مشورہ کا حکم فرمایا۔ مشورہ کی اہمیت کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ قرآن مجید میں ایک سورت کا نام ہی ”الشُّـوْرٰی“ ہے۔ اسلام میں مشورہ کی اِس حد تک اہمیت ہے کہ اگر خدانخواستہ مشورہ کے بعد اٹھایا جانے والا قدم غلط بھی ہو جائے تو پھر بھی وہ بلا مشورہ اقدام سے زیادہ پسندیدہ ہوتا ہے۔ چنانچہ شیخ شہاب الدین عمر النویری لکھتے ہیں:

اَلْخَطَأُ مَعَ الْاِسْتِشَارَةِ أَحْمَدُ مِنَ الْإِصَابَةِ مَعَ الْإِسْتِبْدَادِ.

”مشورہ حاصل کرنے کے بعد خطا کھانا استبداد سے (بغیر مشورہ کے) بھلائی پر رہنے سے زیادہ قابلِ تعریف ہے“۔

(نهاية الأرب في فنون الأدب: الباب السابع، من الفن الثاني في المشورة وإعمال الرأي والاستبداد، ج٦ ص٦٤)

بابُ دارِ الحکمۃ سیدنا علی علیہ السلام سے بھی یہ حقیقت اِسی طرح منقول ہے، چنانچہ یہی عالم دین ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں:

وَقَالَ عَلِيُّ بْنُ أَبِي طَالِبٍ عليه السلام: نِعْمَ الْمُوَازَرَةُ الْمُشَاوَرَةُ، وَبِئْسَ الْإِسْتِعْدَادُ الْإِسْتِبْدَادُ.

”سیدنا علی بن ابی طالب علیہ السلام نے فرمایا: بہترین وزارت مشاورت ہے اور بری استعداد استبداد (مشورہ سے روگردانی) ہے“۔

(نهاية الأرب في فنون الأدب ج٦ ص٦٤)

جب استبداد (مشورہ نہ کرنے) کے ساتھ بھلائی کو پالینا بھی قابل تعریف نہیں ہے تو پھر جہاں ہو ہی استبداد اور اُس کا نتیجہ بھی خون آشام حالات، ظلم اور فساد پر مبنی ہو تو پھر وہ کتنا قابل مذمت ہوگا؟ مذکورہ بالا

استبداد کے نتیجہ میں موروثیت وملوکیت کا آغاز ہوا، پھر اُس کی نحوست سے اہل اسلام کے دِلوں سے مشورہ کی اہمیت ناپید ہوئی۔ خود انصاف فرمایئے! یہ سب کچھ جرم، ظلم اور گناہ ہے یا نہیں؟ اور اگر یہ جرم وگناہ ہے تو پھر اسلام میں اِس کے موجد کے بارے میں شیخ ثناء اللہ امرتسری کے کلام میں وضاحت آچکی ہے کہ وہ کون تھا۔ سو جب اسلام میں اِس استبداد اور خودغرضی کی ابتدا کرنے والا شخص واضح ہوگیا تو پھر کسی بھی برائی کے موجد کے بارے میں سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد بھی سن لیجئے:

مَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً سَيِّئَةً كَانَ عَلَيْهِ وِزْرُهَا وَوِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ بَعْدِهِ مِنْ غَيْرِ أَنْ يُنْقَصَ مِنْ أَوْزَارِهِمْ شَيْءٌ.

''جس شخص نے اسلام میں کوئی برا طریقہ نکالا اُس کا وبال اُسی پر ہوگا اور جنہوں نے اُس کے بعد اُس پر عمل کیا اُن کا وبال بھی اُس پر ہوگا، اِس کے بغیر کہ بعد والوں کے وبال میں کچھ کمی کی جائے''۔

(صحیح مسلم: کتاب الزکاۃ، باب الحث علی الصدقة ولو بشق تمرة أو کلمة طیبة، ص ٤٥١ حدیث ١٠١٧)

جو لوگ اِس حدیث کو صحیح مانتے ہوں تو اُن سے عرض ہے کہ اگر کوئی شخص قرشی ہونے، اُموی ہونے، کاتبِ وحی ہونے، جرنیلِ اسلام ہونے، جلیل القدر ہونے، صحابی ہونے اور ھادی ومھدی ہونے کی بنا پر اِس ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مستثنیٰ ہو تو از راہ کرم وہ استثنائی صورت ضرور سامنے لایئے۔

یہاں شیخ ثناء اللہ امرتسری کے گذشتہ الفاظ میں ایک مرتبہ پھر غور فرمالیجئے:

''آج تک ذہن اُس غلطی میں مبتلا ہے کہ اسلام کے نظام میں ملوکیت اور شخصی اقتدار کو اہمیت حاصل ہے''۔

شیخ نے بالکل صحیح کہا ہے، مسلم قوم کے لاشعور میں یہی بات بیٹھ چکی ہے، یہی وجہ ہے کہ عرب ہو یا عجم بالعموم ہر جگہ آزادی رائے پر قدغن ہے، چنانچہ عرب میں کوئی اختلافِ رائے کا اظہار کرے تو اُسے غدار قرار دے کر دنیا بدر کر دیا جاتا ہے اور عجم میں ایسا کرنے والے انسان کو ملک بدر ہونا پڑتا ہے، لیکن تعجب ہے

کہ اِس قسم کے استبداد پر غیر مسلم ممالک میں تو احتجاج ہوتا ہے مگر مسلم ممالک کی پبلک کے حلقوم سے صدائے احتجاج ہی بلند نہیں ہوتی۔ یقیناً ایسی ہی صورتِ حال کے لیے مفکر اسلام رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہوگا:

تھا جو ناخوب، بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

(ضربِ کلیم :زیر عنوان: ،تن به تقدیر ص ۱٦)

بنوامیہ خصوصاً ابن صخر کے استبداد، مشورہ سے استبعاد اور آزادی اظہارِ رائے پر قدغن وغیرہ امور پر میرے سامنے اِس وقت تمام مکاتب فکر کی مزید آراء بھی موجود ہیں، اُن سب کو یہاں قلم بند کرنا طوالت کا باعث ہوگا، ان شاء اللہ تعالیٰ ایسی تمام عبارات کو ہم اپنی کتاب **"سیدنا إمام الحسین علیہ السلام"** میں جمع کریں گے۔ یہاں ہم آپ کو علماء اسلام کی مذکورہ بالا مختلف عبارات میں فرق اور اُس کی وجوہ میں غور وفکر کرنے کی زحمت دیتے ہیں۔

عباراتِ علماء میں فرق اور اُس کی وجہ

اربابِ دانش سے گذارش ہے کہ پہلے تو سطورِ بالا میں درج شدہ تمام حضرات کی عبارات کو بغور اور باربار پڑھیں اور ان میں فرق تلاش فرمائیں اور پھر اس فرق کی وجہ بھی تلاش فرمائیں۔

مجھ عاجز کی فہم کے مطابق اِس فرق کی وجہ یہ ہے کہ جو علماءِ اسلام (خواہ اُن کا تعلق کسی بھی مکتبِ فکر سے ہو) اہلِ اسلام کی ترقی اور تنزلی کے اسباب وعلل پر گفتگو فرماتے ہیں وہ دوٹوک انداز میں بیان کردیتے ہیں کہ اسلام کو کب، کیوں اور کس سے نقصان پہنچا، اُن کے برعکس جو علماء روافض وشیعہ کی تردید میں یا دفاعِ معاویہ میں لکھتے ہیں تو وہ اسلام کو پس پشت ڈالتے ہوئے محض شخصیات کے دفاع کے جذبہ کی رو میں اس قدر آگے نکل جاتے ہیں کہ موروثیت وملوکیت کو جواز فراہم کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔ یوں تو ایسے غیر معتدل لکھاری ہر مکتبِ فکر میں موجود ہیں مگر یہاں یہ عاجز اپنے ہی مکتبِ فکر کے بعض حکماء امت کی مثال پیش کرچکا ہے کہ جس حکومت اور ولی عہدی کو دوسرے مکاتب فکر کے اکثر علماء نے استبداد، خون آشام، مکروہ، اندھیری رات، قیصریت، اسلام کی بنیادیں متزلزل کرنے والی، جمہور کے انتخابِ حق کی نفی کرنے

والی، مجلس شوریٰ کی بیخ کنی کرنے والی، فساد، خاندانی ورثہ، جبر، ملوکیت، شخصی حکومت، حریت فکر کی دشمن، آزادیٔ بیان پر قدغن، قہر، غلبہ اور باعث تشدد قرار دیا، اُسے ہمارے بریلوی حکیم الامت نے فقط شخصی دفاع میں قرآن کے مطابق اور سنتِ انبیاء ثابت کرنے کی ناکام کوشش کرڈالی۔

حکیم الامت کی فکرِ ملوکیت

سطورِ بالا میں ہم نے متعدد علماء اسلام کی آراء نقل کردی ہیں، اب ہم انصاف کی امید رکھتے ہوئے قارئین کرام کی عدالت میں مقدمہ لے جاتے ہیں کہ وہ یوم محشر کو مدنظر رکھتے ہوئے انصاف فرمائیں کہ کس کا موقف حق ہے، آیا وکلاءِ اسلام کا موقف حق ہے یا وکلاءِ طلقاء کا؟ راقم الحروف اپنے اندر یہ جرأت نہیں رکھتا کہ اِن میں سے کسی کو حق کی نمائندگی کرنے والا اور دوسرے کو باطل کی نمائندگی کرنے والا کہہ سکے، البتہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہر ایک نے اپنی اپنی تصنیف کا حق ادا کردیا ہے۔ ہمارے حکیم الامت چونکہ ایک عظیم بادشاہ ابنِ آکلۃ الاکباد کے دفاع میں لکھ رہے تھے اِس لیے اُنہوں نے اپنے موضوع کا حق ادا کردیا ہے، اور دوسرے حضرات چونکہ نظامِ اسلام اور مسلمانوں کے عروج وزوال کے اسباب وعلل پر لکھ رہے تھے اِس لیے اُنہوں نے بھی اپنے موضوع کا حق ادا کردیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ بادشاہ کا دفاع کرنے والے نے بھی حق ادا کردیا ہے اور اسلام کا دفاع کرنے والوں نے بھی حق ادا کردیا ہے۔

ویسے ہمارے حکیم الامت کی حکمت بروقت کام کرتی تھی، اُن کی حکمت میں کتاب وسنت کو ضرورت کے مطابق ڈھالنے کی مکمل صلاحیت تھی۔ چنانچہ اُنہوں نے "کنز الایمان" کے حاشیہ **"نور العرفان"** میں اور اسی طرح اپنی ایک اور کتاب **"شان حبیب الرحمان من آیات القرآن"** میں نبی کریم ﷺ کے کسی بھی سالے کے لیے خال المومنین ہونے کی نفی کی ہے لیکن جب اُنہوں نے امیر شام کے دفاع میں **"امیر معاویہ ﷛"** نامی (۱) رسالہ لکھا تو اُن کی حکمت یکایک بیدار ہوگئی اور اُنہوں نے اُس میں حسبِ ضرورت معاویہ بن صخر کو خال المومنین لکھ دیا۔

---

(۱) اِس کتاب کا اصل نام ہے "امیر معاویہ پر ایک نظر" جیسا کہ خود مفتی احمد یار نعیمی صاحب نے سورۃ الانفال کی آیت نمبر ۵ کی تفسیر میں حاشیہ نمبر ۴ میں لکھا ہے۔ نامعلوم بعد کے لوگوں نے نام میں ترمیم کیوں کی؟

حکیم الامت کی انوکھی حکمت

سطورِ بالا میں راقم الحروف نے جو اپنے مکتبِ فکر کے حکیم الامت اور اُن کے مقابلہ میں دوسرے حضرات کے اقتباسات نقل کیے ہیں، امید ہے کہ اُن کے مابین محاکمہ اور موازنہ اکثر قارئین کرام نے اپنے اپنے ذہن میں کرلیا ہوگا، لیکن جو لوگ مجھ ناکارہ کی طرح محاکمہ اور موازنہ کی قوت نہ رکھتے ہوں تو اُن کی خدمت میں عرض ہے کہ وہ مذاہب اربعہ پر کلام کرنے والے مشہور فقیہ و فلسفی امام ابن رشد کے اُس کلام میں ہی غور فرمالیں جو ہم عباراتِ علماء کے آغاز میں نقل کرچکے ہیں۔

یہاں ہم قارئین کرام کو اپنے حکیم الامت صاحب کی ایک اور حکمت بالغہ میں غور وفکر کی زحمت دینا چاہیں گے۔ پیچھے لکھا جاچکا ہے کہ حکیم الامت نے اپنی کتاب ''امیر معاویہ'' کے صفحہ نمبر ۸۱، ۸۳ پر یزید کی ولی عہدی کو قرآن، حدیث اور خلفاء راشدین ﷺ کی سنت کی مانند ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے، جبکہ وہ اپنی اسی کتاب میں دو صفحے آگے چل کر ایک ضروری نوٹ کے ضمن میں یوں بھی لکھتے ہیں:

> ''جب امیر معاویہ ﷺ کا وقت وفات قریب آیا تو یزید نے پوچھا کہ ابا جان! آپ کے بعد خلیفہ کون ہوگا تو آپ نے کہا کہ خلیفہ تو تُو ہی بنے گا مگر جو کچھ میں کہتا ہوں اُسے غور سے سن۔ کوئی کام امام حسین ﷺ کے مشورہ کے بغیر نہ کرنا (یعنی وہ تیرے وزیر اعظم ہیں) اُنہیں کھلائے بغیر نہ کھانا اُنہیں پلائے بغیر نہ پینا، سب سے پہلے اُن پر خرچ کرنا پھر کسی اور پر، پہلے اُنہیں پہنانا پھر خود پہننا۔ میں تجھے امام حسین ﷺ، اُن کے گھر والوں، اُن کے کنبے بلکہ سارے بنی ہاشم کے لیے اچھے سلوک کی وصیت کرتا ہوں۔
>
> اے بیٹے! خلافت میں ہمارا حق نہیں، وہ امام حسین ﷺ، اُن کے والد اور اُن کے اہل بیت کا حق ہے، تو چند روز خلیفہ رہنا پھر جب امام حسین ﷺ پورے کمال کو پہنچ جاویں تو پھر وہی خلیفہ ہوں گے یا جسے وہ چاہیں تاکہ خلافت اپنی جگہ پہنچ جائے۔ ہم سب امام حسین ﷺ اور اُن کے نانا کے غلام ہیں، اُنہیں ناراض نہ کرنا ورنہ تجھ پر اللہ

اور رسول ﷺ ناراض ہوں گے اور پھر تیری شفاعت کون کرے گا"۔

(امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ص ۸۵،۸۶ مکتبہ إسلامیہ، میاں مارکیٹ، بیسمنٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاھور)

حکیم الامت کی یہ حکمت مجھ ایسے غریب اہل سنت کی سمجھ سے بالاتر ہے، شاید اِس کو کوئی امیر اہل سنت سمجھے اور پھر آگے سمجھا سکے، یا پھر حکیم الامت کی سطح کے دوسرے حکماءِ اہلِ سنت ہی سمجھ اور سمجھا سکیں گے، البتہ میں اپنی طرح کے غیر حکماءِ اہلِ سنت قارئین کرام کے لیے عرض کیے دیتا ہوں کہ سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ جو معاویہ یا ہمارے حکیم الامت کے بقول ابھی کمال کو نہیں پہنچے تھے وہ یزید پلید سے عمر میں ۲۳ یا ۲۴ برس بڑے تھے، کیونکہ اُن کی ولادت ۳ ہجری میں ہوئی تھی۔

(البدایۃ والنہایۃ ج ۱۱ ص ۴۷۳)

جبکہ یزید ۲۵، ۲۶، یا ۲۷ ہجری میں پیدا ہوا تھا۔

(البدایۃ والنہایۃ ج ۱۱ ص ۶۳۷)

اگر آپ امام پاک اور یزید پلید دونوں کے سالِ پیدائش میں غور و فکر کریں گے تو آپ کو ہمارے حکیم الامت کی حکمت کا اعتراف کرنا ہی پڑے گا، کیونکہ جب یزید اپنے باپ کا جانشین ہوا تھا تو اُس وقت اُس کی عمر 36 یا 37 برس تھی اور وہ اِس عمر میں کمال کو پہنچ چکا تھا جبکہ ہمارے امام سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی عمر مبارک 54 برس تھی اور وہ معاویہ اور ہمارے حکیم الامت کے مطابق ابھی کمال کو نہیں پہنچے تھے۔ اِس کو یوں سمجھئے کہ جس طرح آج پی پی اور "ن" کے بچے 30 یا 35 برس کی عمر میں کمال کو پہنچ کر ولی عہد بن چکے ہیں جبکہ ابھی تک چوہدری اعتزاز احسن صاحب (جن کی عمر تادم تحریر [2019ء] 73 برس ہے) اور راجہ ظفر الحق صاحب (جن کی عمر بوقتِ تحریر 83 برس ہے) وغیرہ کمال کو نہیں پہنچ سکے۔ صرف یہی نہیں بلکہ جنہوں نے اقتدار پر اپنے پنجے گاڑ لیے ہیں، اُن کے نزدیک اُن کے بچوں کے علاوہ ملک کے باقی تمام اہل علم وار بابِ دانش خواہ اُن کی عمر کتنا ہی ہو لیکن وہ کمال کو پہنچے ہیں اور نہ ہی پہنچ سکتے ہیں، الا یہ کہ کوئی صحیح انقلاب آجائے۔

یہاں سے اربابِ فہم و دانش بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ آخر کیوں عرب و عجم کے بعض اسلامی ممالک کے

سربراہان اُن ملاؤں کو سپورٹ کرتے ہیں جو معاویہ اور بنوامیہ کے گیت گاتے ہیں۔ فَتَدَبَّرُوْا!

حاکم اگر صحابی ہو تو مواخذہ سے مستثنیٰ ہوتا ہے؟

یاد رکھنا چاہیئے کہ اہل بیت کرام علیہم السلام اور حق پرست علماء کرام میں سے جس نے بھی معاویہ کی افراط وتفریط اور خلافِ شریعت معاملات پر طعن وتشنیع کی ہے تو محض اسلام کی خاطر کی ہے، شیعیت وسنیت کی خاطر نہیں کی، کیونکہ معاویہ بن صخر شیعیت وسنیت کے مابین حد فاصل نہیں ہیں؟ وہ تو محض طلقاء میں سے ایک فرد تھے، جو لوگ اُنہیں صحابی مانتے ہیں اُنہیں یہ دھیان نہیں رہتا کہ وہ بیس سال تک بادشاہ بھی تو رہے، ورنہ طلقاء تو دوسرے لوگ بھی تھے، لہٰذا غور کرنا چاہیئے کہ دوسرے طلقاء کی بنسبت اُن کا منفی ذکر زیادہ کیوں ہوتا ہے؟ اگر وہ صحابی بھی تھے تو جتنا طویل عرصہ وہ اقتدار میں رہے اتنا کوئی دوسرا شخص نہیں رہا، سو اگر صحابہ، تابعین اور اکابرین اسلام نے اُنہیں موردِ طعن بنایا ہے تو فقط اُن کی اُس افراط وتفریط کی وجہ سے بنایا ہے جو کتاب وسنت کے خلاف تھی، جس کو امام ابن رشد نے انہدامِ خلافتِ راشدہ سے، علامہ ابوالکلام آزاد نے غیر اسلامی حکومت سے، علامہ حامد انصاری غازی نے مطلق العنانی سے اور علامہ سعید احمد اکبر آبادی نے شخصی حکومت، موروثی حکومت، جبر، قہر اور فساد واستبداد سے تعبیر کیا ہے۔

خود ہی سوچیئے کہ اگر کوئی شخص اُن کی شاہانہ افراط وتفریط، منافی کتاب وسنت معاملات اور خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے تعامل کے خلاف امور پر طعن کرے تو اُسے صحابیت پر حملہ سمجھنا کہاں کی عقل مندی ہے؟ شاہانہ اور غیر عادلانہ معاملات پر طعن کو صحابیت پر طعن سمجھنا تو ایسا ہے جیسا کہ پاکستان کے کرپٹ علماء کے خلاف بولنے کو اسلام کے خلاف بولنے کے مترادف سمجھا جاتا ہے، کرپٹ حکمرانوں کے خلاف آواز بلند کرنے کو جمہوریت کے خلاف سازش سمجھا جاتا ہے اور بادشاہت اور سعودی حکومت کے خلاف آوازِ حق بلند کرنے کو حرمین شریفین کے خلاف سازش سمجھا جاتا ہے۔ ذرا اپنی مکمل عقل وعلم کو بروئے کار لاتے ہوئے ایمان سے بتایئے کہ کیا کوئی صحابی کہا جانے والا شخص کتاب وسنت کے اوامر ونواہی سے بالا اور عنداللہ اور عندالناس جوابدہی سے مبراء ہو سکتا ہے؟ اگر نہیں اور ہرگز نہیں تو پھر کتاب وسنت کے منافی اقدامات پر آواز بلند کرنے کو ایک بادشاہ کے خلاف آواز بلند کرنے کی بجائے صحابی کے خلاف آواز بلند کرنا کیوں تصور کیا

جاتا ہے؟ اور پھر دیدہ دلیری یہ کہ کہا جاتا ہے کہ یہ صحابہ کرام ﷺ کے خلاف آواز اُٹھائی گئی ہے، لہٰذا یہ صحابہ کرام کی گستاخی ہے۔ تنہا کوئی طلیق اور جائر حاکم صحابہ کرام کیسے ہوگیا؟ کیا تنہا کسی کرپٹ ملاں پر طعن و تشنیع کو تمام علماء کرام پر طعن کہا جاسکتا ہے؟

نبوت کے علاوہ کوئی چیز گناہ پروف نہیں

بلاشبہ جن وانس کے لیے صحابیت شرف وعظمت کا ایک عظیم ٹائٹل ہے مگر گناہ پروف کوئی چیز نہیں۔ صحابیت کا ٹائٹل انسان کو ارتداد، شراب نوشی، زنا، بغاوت، بدعت، ضلالت، حسد، عناد، ظلم، جور، فساد، سبّ وشتم اور قتلِ ناحق وغیرہ اعمال سے محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ چنانچہ امام سعد الدین تفتازانی سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے اعترافاً لکھتے ہیں:

يَعْنِيْ أَنَّ مَا وَقَعَ بَيْنَ الصَّحَابَةِ مِنَ الْمُحَارَبَاتِ وَالْمُشَاجَرَاتِ عَلٰى الْوَجْهِ الْمَسْطُوْرِ فِيْ كُتُبِ التَّوَارِيْخِ ، وَالْمَذْكُوْرِ عَلٰى أَلْسِنَةِ الثِّقَاةِ يَدُلُّ بِظَاهِرِهٖ عَلٰى أَنَّ بَعْضَهُمْ قَدْ حَادَ عَنْ طَرِيْقِ الْحَقِّ ، وَبَلَغَ حَدَّ الظُّلْمِ وَالْفِسْقِ. وَكَانَ الْبَاعِثُ لَهُ الْحِقْدَ وَالْعِنَادَ ، وَالْحَسَدَ وَاللِّدَادَ ، وَطَلَبَ الْمَالِ وَالرِّيَاسَةِ وَالْمَيْلَ إِلَى اللَّذَّاتِ وَالشَّهَوَاتِ. إِذْ لَيْسَ كُلُّ صَحَابِيٍّ مَعْصُوْمًا ، وَلَا كُلُّ مَنْ لَقِيَ النَّبِيَّ ﷺ بِالْخَيْرِ مَوْسُوْمًا.

''یعنی صحابہ کے مابین جو مشاجرات اور جنگیں ہوئیں جیسا کہ تاریخ میں مرقوم اور ثقہ حضرات کی زبانوں پر مذکور ہے، یہ سب کچھ اپنے ظاہر سے دلالت کر رہا ہے کہ بعض صحابہ راہِ حق سے ہٹ گئے تھے اور ظلم وفسق کی حد کو پہنچ گئے تھے، اور اس کا سبب کینہ، عناد، حسد، سخت جھگڑالو پن، مال اور ریاست کی طلب اور لذتوں اور شہوتوں کی طرف میلان تھا، کیونکہ ہر ایک صحابی معصوم ہے اور نہ ہی نبی کریم ﷺ سے ملاقات کرنے والا ہر شخص خیر سے موسوم ہے''۔

(شرح المقاصد ج۵ ص ۳۱۰، ۳۱۱، مطبعة عالم الكتب، بيروت)

سیدنا امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ کا تدبر

جب خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم نے خود کو جوابدہی اور مواخذہ سے مبراء نہیں سمجھا تھا تو پھر اگر کوئی صحابی خلیفہ نہیں بلکہ فقط بادشاہ ہو تو وہ کیونکر مبراء ہو سکتا ہے؟ سو جب کتاب وسنت کے اوامر ونواہی سے کوئی مبراء نہیں ہے تو جوابدہی اور مواخذہ سے بھی کوئی مبراء نہیں ہو سکتا، یہی وجہ ہے کہ سیدنا امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ نے اُمورِ حکومت معاویہ کو سونپتے ہوئے شرائط طے فرمائیں کہ اُسے کتاب وسنت پر قائم رہنا ہوگا اور وہ مسلمانوں کی مجلس شوریٰ کے بغیر اپنے بعد کسی کو ولی عہد نہیں بنائے گا۔ ظاہر ہے کہ جب معاہدہ میں یہ شرائط لکھی گئیں تو اب اُن پر پہرہ بھی دیا جائے گا کہ پوری کی گئیں یا نہیں؟ اگر پوری کی گئیں تو قیامت تک مدحت ورنہ قیامت تک مذمت۔ اِس لحاظ سے یہ سیدنا امام حسن علیہ السلام کی دور اندیشی، اعلیٰ فراست اور مخصوص فہم کی دلیل ہے۔

اب آپ ہی بتلایئے کہ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی عائد فرمودہ شرائط کو معاویہ کا اُن کے روبرو تسلیم کرنا اور بعد میں اُنہیں پورا نہ کرنا، کیا کتاب وسنت کی خلاف ورزی نہیں؟ اگر خلاف ورزی ہے تو کیا اُس خلاف ورزی پر فقط اِس لیے کلام نہیں کیا جا سکتا کہ جس بادشاہ سے وہ خلاف ورزی ہوئی وہ صحابی تھا؟ کیا کتاب وسنت میں ایسی کوئی تصریح ہے کہ اگر کوئی صحابی حاکم ہو تو کسی بھی قسم کی افراط وتفریط پر اُس کا مواخذہ ہوگا اور نہ ہی وہ دنیا میں جواب دہ ہوگا اور نہ ہی اُس کی افراط وتفریط پر لب کشائی جائز ہوگی؟

بادشاہ پھر اعتراضات ومواخذہ سے مستثنیٰ؟

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے تو خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کو بھی اعتراضات ومواخذہ سے مستثنیٰ نہیں سمجھا تھا جبکہ کچھ احمق لوگ باشاہوں کو بھی اعتراضات ومواخذہ سے مستثنیٰ سمجھتے ہیں، اور یہ کھلی گمراہی ہے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ جس قدر بھی فقہاء اور علماء اسلام نے معاویہ کی افراط وتفریط پر کلام کیا ہے، اُس کلام کا رُخ فقط معاویہ کی بادشاہت واقتدار کی طرف ہے۔ اگر وہ اقتدار نہ سنبھالتے تو اُن کا منفی ذکر تو کجا مثبت ذکر بھی نہ ہوتا، اور وہ دوسرے طلقاء کی مانند طاق نسیاں میں پڑے ہوتے۔ آپ اپنے ہی دور میں غور وفکر کر کے دیکھ لیجئے! جو علماءِ کرام سیاست میں آتے ہیں تو اُن کا چرچہ منفی ہو یا مثبت اُن علماء سے زیادہ ہوتا ہے جو سیاست سے دور

رہتے ہیں۔ الیکٹرانک یا پرنٹ میڈیا پر تبصرے، کارٹون اور ڈمی وغیرہ فقط اُن علماء کی بنتی ہے جو کلی یا جزوی اقتدار کے مزے لوٹتے ہیں۔ سو خود ہی بتلایئے کہ اگر کوئی عالم دین سیاست میں آ کر بالواسطہ یا بلاواسطہ ناجائز طریقے سے فوائدِ مالیہ حاصل کرے اور اُس پر دیدہ ور حضرات تبصرہ کریں تو ایسے کسی بھی تبصرہ کو اسلام کے خلاف سازش یا تنہا اُس عالم کے خلاف آواز بلند کرنے کو تمام علماء اسلام کی تنقیص یا توہین قرار دینا کہاں کا انصاف ہے؟ سو جب کسی ایک عالم دین کی بے اعتدالیوں پر کلام کرنے کو تمام علماء کرام کی بے ادبی نہیں سمجھا جاتا تو پھر کسی صحابی کہلانے والے واحد شخص کی بے اعتدالیوں پر کلام کرنے کو تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بے ادبی کیونکر تصور کیا جاتا ہے؟

سبّ و شتم نہ کرنے کی شرط دھجیاں

پانچویں شرط یہ تھی کہ مولا علی علیہ السلام پر سب و شتم نہیں کیا جائے گا۔ اِس کی دھجیاں یوں اڑائی گئیں کہ اُسی دن سے ہی پھر سے سبّ و شتم کا سلسلہ شروع کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ ابوالفداء عماد الدین بن اسماعیل شافعی متوفّی ۷۳۲ھ لکھتے ہیں:

كَانَ خُلَفَاءُ بَنِي أُمَيَّةَ يَسُبُّوْنَ عَلِياً رضي الله عنه مِنْ سَنَةِ إِحْدٰى وَأَرْبَعِيْنَ، وَهِيَ السَّنَةُ الَّتِيْ خَلَعَ الْحَسَنُ فِيْهَا نَفْسَهُ مِنَ الْخِلَافَةِ إِلٰى أَوَّلِ سَنَةِ تِسْعٍ وَّتِسْعِيْنَ، آخِرِ أَيَّامِ سُلَيْمَانَ بْنِ عَبْدِ الْمَلِكِ، فَلَمَّا وَلِّيَ عُمَرُ أَبْطَلَ ذٰلِكَ.

”خلفاء بنو امیہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ پر ۴۱ھ سے، جب امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ خلافت سے دست بردار ہوئے تھے (زور و شور سے) سبّ و شتم شروع کیا اور یہ سلسلہ ۹۹ھ سلیمان بن عبدالملک کے آخری ایام تک جاری رہا، پھر جب سیدنا عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے خلافت سنبھالی تو اُنہوں نے اس کو ختم کیا“۔

(المختصر في أخبار البشر ج۱ ص ۲۰۱)

اس مسئلہ کی مکمل اور مدلل تفصیل ہماری کتاب ”لَا تَسُبُّوْا أَصْحَابِيْ“ (میرے صحابہ کو برا نہ کہو)

میں آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

صلحِ حسن کی رٹ لگانے والوں سے سوال

یہاں اُن لوگوں سے سوال ہے جو صلحِ امامِ حسن مجتبیٰ علیہ السلام سے اہلیتِ معاویہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ کیا وہ یہ بتلانا پسند فرمائیں گے کہ جس شخص کے ساتھ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے معاہدہ کرتے ہوئے یہ شرط لکھوانا ناگزیر سمجھا کہ جب وہ مکمل اقتدار سنبھالے تو اُن کے بابا کو سبّ و شتم کرنے سے باز آجائے، ایسی شرط لکھوانے کی ضرورت ہی کیوں پیش آئی اور کیا اِس قسم کی شرط کسی راشد، ہادی اور مہدی شخص کے ساتھ طے کرنے کی ضرورت ہوتی ہے؟

اِس مقام پر میں تمام اہلِ دل مسلمانوں سے حق کا واسطہ دے کر غور و فکر کرنے کی اپیل کرتا ہوں کہ وہ ذرا اُس منظر کو چشم تصور میں لائیں کہ جب دل رُبائے مرتضیٰ، جگر گوشۂ زہرا اور شبیہ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شرائط لکھوائی ہوں گی اور بزبانِ قلم معاویہ سے مخاطب ہوئے ہوں گے کہ تحفظِ خونِ مسلمین کی خاطر ہم مملکت اسلامیہ تو تمہارے سپرد کر دیتے ہیں مگر تم وعدہ کرو کہ ہمارے بابا کو سبّ و شتم کرنے سے باز آجاؤ گے۔ خود سوچئے ایسی شرط لکھواتے وقت امام پاک کے قلب اقدس کی کیفیت کیا ہوگی؟ وہ کیا سوچ رہے ہوں گے کہ کیسے شخص کو اقتدار سونپنا پڑ گیا ہے؟ کیا وہ یہ نہیں سوچتے ہوں گے کہ کیسا وقت آ گیا ہے کہ ایک مسلمان کہلانے والے شخص کے ساتھ معاہدہ کرتے ہوئے یہ لکھوانا ناگزیر ہو گیا ہے کہ وہ شخص اپنی حکومت میں محبوبِ خدا و مصطفیٰ علی المرتضیٰ علیہ السلام والرضا پر سبّ و شتم نہیں کرے گا؟ خدارا ذرا سوچئے تو سہی! اہل بیت کرام علیہم السلام پر کیسے کیسے وقت آئے۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّآ إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ.

چھٹی شرط کا حلیہ کیسے بگاڑا؟

چھٹی شرط یہ تھی کہ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کوفہ کے بیت المال سے پانچ لاکھ درہم لیں گے اور دارابجرد کا خراج اُنہی کے لیے ہوگا۔ اِس شرط کا حلیہ یوں بگاڑا گیا کہ ایک طرف تو معاویہ نے اس شرط کو قبول کر لیا مگر دوسری طرف اہل بصرہ کو سمجھا دیا کہ وہ دارابجرد اپنے پاس ہی رکھیں۔ چنانچہ ابن اثیر جزری لکھتے ہیں:

وَأَمَّا خِرَاجُ دَارِ أَبْجَرْدَ ، فَإِنَّ أَهْلَ الْبَصْرَةِ مَنَعُوهُ مِنْهُ وَقَالُوا : هُوَ فَيْئُنَا لَا نُعْطِيهِ أَحَدًا ، وَكَانَ مَنْعُهُمْ بِأَمْرِ مُعَاوِيَةَ أَيْضًا.

''اور رہا دارا بجرد کا خراج تو اُسے اہل بصرہ نے امام پاک سے روک لیا اور کہا: یہ ہمارا حصہ ہے، ہم یہ کسی کو نہیں دیں گے، اور اُن کا یہ منع کرنا بھی معاویہ کے حکم سے تھا''۔

(الکامل فی التاریخ ج۳ ص٦)

حافظ ابن عساکر لکھتے ہیں:

وَدَسَّ مُعَاوِيَةُ إِلَى أَهْلِ الْبَصْرَةِ فَطَرَدُوا وَكِيلَ الْحَسَنِ وَقَالُوا: لَا تُحْمَلُ فَيْأُنَا إِلَىٰ غَيْرِنَا.

''اور معاویہ نے اہل بصرہ کو چال سمجھائی تو اُنہوں نے سیدنا امام حسن علیہ السلام کے نمائندہ کو دھتکار دیا اور کہا: ہمارا حصہ کسی اور کی طرف نہیں لے جایا جا سکتا''۔

(تاریخ دمشق ج۱۳ ص۲٦٦)

اِس سے دو باتیں نکلتی ہیں: ایک تو یہ کہ امیر شام وعدہ کر کے مکر گئے اور دوسری یہ کہ اہل بصرہ سے یہ کہلوا کر کہ یہ اُن ہی کا حصہ ہے، نہ صرف یہ کہ امام پاک کی طرف ناحق مطالبہ کی نسبت کی بلکہ اُنہیں غلط ثابت کرنے کی کوشش بھی کی ۔خود سوچئے! جن ہستیوں پر صدقات وزکوٰۃ تک حرام تھی اور جن کی ایسی تربیت کی گئی تھی کہ اُنہوں نے بچپن میں بیت المال کی کھجور کا ایک دانہ اپنے منہ میں لے لیا تھا تو آقا علیہ السلام نے کَخْ کَخْ فرماتے ہوئے وہ دانہ اُن کے منہ مبارک سے نکلوا دیا تھا، اُن کے بارے میں یہ کیونکر تصور کیا جا سکتا ہے کہ اُنہوں نے کسی ناجائز مال کا مطالبہ کیا ہوگا؟

کیا کوئی ایک شرط پوری بھی ہوئی؟

متعدد کتب تاریخ میں ہے کہ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام از خود صلح کے خواہاں ہوئے اور معاویہ کی طرف شرائطِ صلح لکھ بھیجیں، جبکہ اُن کتب میں یہ بھی مذکور ہے کہ ابن صخر نے ہی صلح کی پیش کش کی اور مہر زدہ ایک سادہ کاغذ امام حسن علیہ السلام کی طرف بھیجا اور کہا کہ آپ اس میں جو چاہیں شرائط لکھ دیں، مجھے قبول ہوں گی۔

حدیث کی کتبِ صحاح سے دوسرے قول کی تائید ملتی ہے۔ کتبِ تاریخ میں سے جس کتاب میں یہ دونوں قول مذکور ہیں وہاں یہ تطبیق دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ ایک شرائط نامہ امام پاک کی طرف سے روانہ کر دیا گیا تھا اور اس میں مرقوم شرائط کو معاویہ نے تسلیم کر کے واپس روانہ کر دیا تھا، جبکہ اُس نے اپنی طرف سے مہر زدہ ایک سادہ کاغذ بھی امام پاک کی طرف ارسال کیا ہوا تھا جو ابھی امام پاک تک نہیں پہنچا تھا۔ جب وہ کاغذ امام پاک کو موصول ہوا تو اُس کے ساتھ دوسرے کاغذ پر لکھا ہوا تھا کہ اِس میں آپ جو چاہیں شرائط لکھ دیں ہمیں قبول ہوں گی۔ امام پاک نے اُس میں پہلے سے دوگنا زیادہ شرائط لکھ دیں، پھر جب امام پاک کی معاویہ سے ملاقات ہوئی اور اُنہوں نے اُن شرائط کو پورا کرنے کا مطالبہ فرمایا تو معاویہ نے کہا: پہلی مرتبہ جو آپ نے شرائط لکھ کر بھیجی تھیں بس وہی منظور ہیں دوسری نہیں۔ چنانچہ مؤرخین ۴۱ھ کے حالات میں لکھتے ہیں:

فَلَمَّا الْتَقٰى مُعَاوِيَةُ وَالْحَسَنُ عَلَيْهِ السَّلَامُ سَأَلَهُ الْحَسَنُ أَنْ يُعْطِيَهُ الشُّرُوْطَ الَّتِيْ شَرَطَ فِي السِّجِلِّ الَّذِيْ خَتَمَ مُعَاوِيَةُ فِيْ أَسْفَلِهِ، فَأَبٰى مُعَاوِيَةُ أَنْ يُعْطِيَهُ ذٰلِكَ، فَقَالَ: لَكَ مَا كُنْتَ كَتَبْتَ إِلَيَّ أَوَّلًا تَسْأَلُنِيْ أَنْ أُعْطِيَكَهُ، فَإِنِّيْ قَدْ أَعْطَيْتُكَ حِيْنَ جَاءَ نِيْ كِتَابُكَ. قَالَ الْحَسَنُ عَلَيْهِ السَّلَامُ: وَأَنَا قَدْ اشْتَرَطْتُ حِيْنَ جَاءَ نِيْ كِتَابُكَ، وَأَعْطَيْتَنِي الْعَهْدَ عَلَى الْوَفَاءِ بِمَا فِيْهِ. فَاخْتَلَفَا فِيْ ذٰلِكَ، فَلَمْ يَنْفُذْ لِلْحَسَنِ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنَ الشُّرُوْطِ شَيْئًا.

”پھر جب معاویہ اور امام حسن علیہ السلام کی ملاقات ہوئی تو امام پاک نے اُن سے اُن شرائط کو پورا کرنے کا مطالبہ کیا جو اُنہوں نے اُس کاغذ پر لکھی تھیں جس کو معاویہ نے مہر لگا کر بھیجا تھا تو معاویہ نے وہ شرائط پوری کرنے سے انکار کرتے ہوئے کہا: جو کچھ آپ نے اوّلاً میرے پاس لکھ کر بھیجا تھا اور مانگا تھا تو وہ میں نے اُسی وقت دے دیا تھا جب آپ کی تحریر میرے پاس پہنچی تھی۔ سیدنا امام حسن علیہ السلام نے فرمایا: میں نے تو آپ کے ساتھ اُس وقت شرائط طے کیں جس وقت آپ کی تحریر میرے پاس پہنچی

اور جو کچھ میں نے اُس میں لکھا اُس کو پورا کرنے کا آپ نے میرے ساتھ وعدہ کیا۔
پس اِس بات پر دونوں میں اختلاف ہوگیا تو معاویہ نے شرائط میں سے کچھ بھی سیدنا امام حسن علیہ السلام کے لیے جاری نہ کیا"۔

(تاریخ الطبري ج٥ ص١٦٢، ١٦٣؛ تاریخ دمشق ج١٣ ص٢٧٢؛ مرآة الزمان لسبط ابن الجوزي ج٧ ص٩؛ الكامل فی التاریخ ج٣ ص٥، ٦؛ تاریخ ابن خلدون ج٢ ص٦٤٨، ٦٤٩، ومترجم اردو ج٣ ص٣٤٦)

حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی لکھا ہے:

فَلَمْ يَنفُذْ لِلْحَسَنِ مِنَ الشَّرْطَيْنِ شَيْءٌ.

"پس اُس نے امام حسن کے لیے دونوں شرطوں میں سے کچھ بھی پورا نہ کیا"۔

(فتح الباري ج١٦ ص٥٣٢)

اُس دور کے بعض جہاندیدہ حضرات نے تو یہاں تک کہا ہے کہ سادہ کاغذ پر مہر لگا کر بھیجنا ہی ایک چال تھی۔ چنانچہ علامہ سبط ابن الجوزی لکھتے ہیں:

قَالَ الزُّهْرِيُّ: وَلَا مَعْنىٰ لِخَتْمِ مُعَاوِيَةَ عَلىٰ أَسْفَلِ الصَّحِيفَةِ الْبَيْضَاءِ إِلَّا مُكَايَدَةَ الْحَسَنِ وَمُخَادَعَتَهُ وَمُغَالَطَتَهُ.

"امام زہری فرماتے ہیں: معاویہ کا سفید کاغذ کے نچلے حصہ پر مہر لگا کر بھیجنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے ساتھ فریب، دھوکہ اور مغالطہ آفرینی کے علاوہ کوئی معنیٰ نہیں رکھتا"۔

(مرآة الزمان ج٧ ص٩)

خیال رہے کہ بعض کتب میں شرائط کے ذکر کے بعد یہ الفاظ بھی آئے ہیں:

فَأَجَابَهُ مُعَاوِيَةُ، وَأَعْطَاهُ مَا سَأَلَ.

"تو معاویہ نے اُن کی بات قبول کی اور جو اُنہوں نے مانگا وہ اُنہیں دے دیا"۔

(تاریخ دمشق ج١٣ ص٢٦٤؛ سير أعلام النبلاء ج٣ ص٢٦٤)

اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ فی الفور معاویہ نے مثبت جواب دیا اور شرائط تسلیم کیں، ورنہ آگے چل کر کسی بھی شرط کو پورا نہیں کیا تھا، جیسا کہ ہم ایک ایک شرط پر تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں۔

یہاں قارئین کرام کو یہ بات یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ وہی صاحب تھے جنہوں نے صفین میں قرآن نیزوں پر آویزاں کر کے امام حسن مجتبیٰ کے بابا کریم علیہما السلام کے ساتھ ایک معاہدہ کیا تھا، جو تحکیم کے نام سے مشہور ہے، مگر اُسے نبھایا نہیں تھا، اسی لیے سیدنا علی علیہ السلام پھر سے اُن کی بغاوت کو کچلنے کی تیاریوں میں مشغول تھے کہ اُنہیں شہید کر دیا گیا، سیدنا امام حسن علیہ السلام اپنے بابا کریم علیہ السلام کے اُسی جمع کردہ لشکر کو لے کر میدان میں آئے تھے تو معاویہ بن ابی سفیان نے اُن کے ساتھ بھی اُسی طرح معاہدہ کیا تھا اور اُسی طرح ہی نبھایا تھا۔ **فَافْهَمْ وَلَا تَكُنْ مِنَ الْغَافِلِيْنَ.**

تنبیہ

خبردار! یہاں یہ مت سمجھا جائے کہ یہ قدسی صفت ہستیاں لوگوں کی چال بازیوں کو سمجھنے سے قاصر تھیں۔ نہیں بلکہ وہ ہستیاں سب چالاکیاں سمجھتی تھیں مگر حالات کی مجبوری کو مدنظر رکھتے ہوئے تمام لوگوں کے سامنے شرائط طے کر کے معاہدہ کرتی رہیں، تاکہ ایک طرف وہ خود عنداللہ سرخرو ہوں اور دوسری طرف فریق مخالف کی عنداللہ اور عندالناس اصلیت بھی ظاہر ہو جائے۔ غالباً یہ مولیٰ علی علیہ السلام ہی کا قول ہے کہ کم ظرف لوگوں کو منصب نہیں بدلتا بلکہ اُن کی اصلیت عیاں ہو جاتی ہے۔ یعنی وہ Expose ہو جاتے ہیں۔ سونا، سونا ہی رہتا ہے اگرچہ وہ کیچڑ میں ہی کیوں نہ پڑا ہو، اور تانبا تانبا ہی رہتا ہے اگرچہ اُسے ماتھے پر ہی کیوں نہ سجایا ہوا ہو۔ اِسی لیے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا:

النَّاسُ مَعَادِنٌ كَمَعَادِنِ الْفِضَّةِ وَالذَّهَبِ ، خِيَارُهُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُهُمْ فِي الْإِسْلَامِ.

''لوگ سونے چاندی کی کانوں کی مانند کانیں ہیں، جو زمانۂ جاہلیت میں اچھے تھے وہ زمانۂ اسلام میں بھی اچھے ہیں''۔

(صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب الأروح جنود مجندة، ص ۱۲۱۸ حدیث ۲۶۳۸)

عہد شکن کے بارے میں حکم

قارئین کرام! معاہدۂ صلح میں جو شرائط طے ہوئی تھیں اُن میں سے جن موٹی موٹی شرائط پر اب تک ہم کلام کر چکے ہیں وہ درجِ ذیل ہیں:

۱۔ خلافت پھر امام حسن کو لوٹا دی جائے گی

۲۔ معاویہ کو کتاب وسنت کے مطابق چلنا ہوگا

۳۔ خلفاءِ راشدین رضی اللہ عنہم کے طریقے پر چلنا ہوگا

۴۔ معاویہ کے بعد خلافت کا معاملہ شوریٰ طے کرے گی

۵۔ مولا علی علیہ السلام پر سب وشتم نہیں کیا جائے گا

۶۔ کچھ مالی شرائط

اِن میں سے اول الذکر پانچ شرائط کی تو سراسر خلاف ورزی کی گئی، اور چھٹی شرط کو بھی حسبِ تحریر پورا نہیں کیا گیا، البتہ اگر دوسرے اہل اسلام کی طرح حسنین کریمین علیہما السلام کو بھی اُن کا حصہ دیا جاتا رہا ہو تو وہ معاہدہ سے الگ معاملہ ہے، اور اس پر ہم آئندہ سطور میں بات کریں گے۔ یہاں ہم پہلے وہ احادیث پیش کر رہے ہیں جو عہد شکن لوگوں کے بارے میں آئی ہیں اور پھر ہم یہ جاننا چاہیں گے کہ کیا قرنِ اول سے لے کر اب تک ایسی احادیث کے حکم سے مسلمانوں کا کوئی طبقہ مستثنیٰ بھی ہے؟ مثلاً ایک حدیث میں ہے:

لَا إِيْمَانَ لِمَنْ لَّا أَمَانَةَ لَهُ وَلَادِيْنَ لِمَنْ لَّا عَهْدَ لَهُ.

''وہ شخص ایمان دار نہیں جو امانت دار نہیں اور وہ دین دار نہیں جو عہد کا پاس دار نہیں''۔

(صحیح ابن حبان ج۱ ص۴۲۲، ۴۲۳ حدیث ۱۹۴؛ الجامع الصغیر حدیث ۹۶۸۵)

ایک اور حدیث اِن الفاظ سے بھی آئی ہے:

آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ: إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَإِذَا أُتُمِنَ خَانَ.

''منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو

اُس کے خلاف کرے اور جب اُسے امانت دی جائے تو وہ خیانت کرے"۔

(بخاري ص ١١ حديث ٣٣)

صحیح مسلم میں یہ الفاظ بھی ہیں:

وَإِنْ صَامَ وَصَلّٰى وَزَعَمَ أَنَّهُ مُسْلِمٌ.

"اگرچہ وہ روزے رکھے، نماز پڑھے اور خود کو مسلمان سمجھے"۔

(صحيح مسلم ص ٤٧ حديث ١٠٩، ١١٠؛ مشكاة المصابيح ج ١ ص ٢٣ حديث ٥٥)

ایک اور حدیث میں "وَزَعَمَ أَنَّهُ مُسْلِمٌ" کی بجائے یہ الفاظ ہیں:

وَقَالَ: إِنِّيْ مُسْلِمٌ.

"اور وہ کہے: میں مسلمان ہوں"۔

(مسند أبي يعلىٰ ج ٧ ص ١٣٦ حديث ٤٠٩٨)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

أَرْبَعُ خِلَالٍ مَنْ كُنَّ فِيْهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا: مَنْ إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَإِذَا عَاهَدَ غَدَرَ، وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ، وَمَنْ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِنْهُنَّ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِنَ النِّفَاقِ حَتّٰى يَدَعَهَا.

"جس شخص میں چار باتیں پائی جائیں تو وہ پکا منافق ہے: وہ شخص کہ جب بات کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے، معاہدہ کرے تو دھوکہ دے اور جب جھگڑا کرے تو بدکلامی کرے، اور جس شخص کے اندر اِن میں سے کوئی ایک خصلت ہو تو اُس میں نفاق کی ایک خصلت باقی رہے گی یہاں تک کہ وہ اُسے چھوڑ دے"۔

(بخاري ص ٤٣١ حديث ٣١٧٨؛ مسلم ص ٤٦ حديث ١٠٦)

میں نے بہت تلاش کیا کہ کتاب وسنت کی کوئی ایسی تصریح مل جائے جس میں یہ مذکور ہو کہ کسی صحابی،

فقیہ اور مجتہد انسان میں مذکورہ بالا چاروں باتیں یا اُن میں سے بعض باتیں پائی جائیں تو وہ صحابیت، فقاہت اور اجتہاد کی بدولت اِس حکم سے مستثنیٰ ہو، مگر مجھے ایسی کوئی صراحت نہیں ملی۔ اگر مستند، معتبر، ماہر، کہنہ مشق اور جیّد علماء کرام کو کوئی ایسی استثنائی صورت مل جائے تو ضرور آگاہ فرمایئے گا۔

مالکانِ کوثر محتاج اور طلقاء ذوالعطاء؟

چونکہ شرائطِ صلحِ حسن مجتبیٰ علیہ السلام میں چھٹی شرط کا تعلق مالی معاملہ سے ہے، جس کو اُس کی اصل صورت میں پورا نہ کیا گیا، تاہم بعض کتب میں جہاں یہ مذکور ہے کہ موصوف نے خراجِ دارابجرد کی شرط کو تسلیم کرنے کے باوجود پورا نہ کیا اور ابن عساکر وغیرہ کی روایت کے مطابق دھوکہ کیا، وہیں یہ بھی مذکور ہے:

فَأَجریٰ مُعَاوِیَةُ عَلَی الْحَسَنِ کُلَّ سَنَةٍ أَلْفَ أَلْفِ دِرْهَمٍ ، وَعَاشَ الْحَسَنُ بَعْدَ ذٰلِکَ عَشَرَ سِنِیْنَ.

''پھر معاویہ نے امام حسن علیہ السلام کے لیے ہر سال دس لاکھ درہم جاری کر دیے، اور اُس کے بعد امام حسن علیہ السلام دس سال حیات رہے''۔

(تاريخ دمشق ج۱۳ ص۲٦٦؛ سير أعلام النبلاء ج۳ ص۲٦٤)

اِقتدار پر براجمان یا اقتدار حاصل کرنے والے شخص کے ساتھ مالی معاملات کی اِس قسم کی جتنی بھی شرائط طے کی جاتی ہیں اُن کی نوعیت ایسے حقوق کی ہوتی ہے جیسا کہ وفاق پر صوبوں کا حق، لہٰذا ایسی کسی بھی مالی صورت کو منصب پر براجمان شخص کی فیاضی، سخاوت اور عطا نہیں کہا جا سکتا۔ مثلاً اگر ملک کا بادشاہ یا وزیر اعظم کسی صوبہ کے چیف منسٹر یا منسٹر کو کوئی فنڈ دے تو اُسے بادشاہ کی سخاوت یا عطا نہیں کہا جا سکتا، ہاں اگر بادشاہ اپنے ایسے ذاتی مال سے لوگوں پر خرچ کرے جس کو اُس نے خود کمایا تھا یا اُس کو اُس کے ماں باپ کی طرف سے وراثۃً ملا تھا تو اُسے عطا، فیاضی اور سخاوت کہنا درست ہے۔

خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم یا اوائلِ اسلام کی بادشاہت میں ملک کے گورنروں، سربرآوردہ شخصیتوں یا عام مسلمانوں کو جو مال دیا جاتا تھا وہ اُن کا حق تھا۔ مال دینے کی ایسی صورت کو جس طرح عطائے صدیقی، عطیۂ فاروقی، سخاوتِ عثمانی اور ایثارِ مرتضوی نہیں کہا جا سکتا اسی طرح معاویہ کے ہاتھوں سے جو مال نکلتا تھا اُسے

بھی عطیۂ اُموی اور سخاوتِ معاویہ نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں اقتدار سے قبل خلفاء راشدین ﷺ اپنی اپنی استطاعت کے مطابق اسلام اور اہل اسلام پر جو کچھ خرچ کرتے رہے وہ اُن کا جود و عطا تھا، مثلاً سیدنا ابوبکر صدیق ﷺ کا پورا مال خرچ کرنا، سیدنا عمر ﷺ کا آدھا مال خرچ کرنا، سیدنا عثمان غنی ﷺ کا غزوۂ تبوک وغیرہ مواقع پر خرچ کرنا اور سیدنا مولیٰ علی علیہ السلام کا حالتِ نماز میں انگوٹھی فقیر کو دینا، آقا علیہ السلام کے ساتھ سرگوشی کرنے سے قبل بعض ضرورت مندوں کو خیرات دینا اور مسلسل تین دن تک افطار کے وقت اپنا مکمل کھانا مسکین، یتیم اور اسیر کو دے دینا، ایسے تمام اِنفاقات کا شمار یقیناً خلفاء اربعہ ﷺ کے جود و عطا میں ہوتا ہے۔

معاویہ کی طرف سے بھی اگر اقتدار سے قبل اسلام اور اہل اسلام پر خرچ کرنا ثابت ہو جائے تو یقیناً وہ بھی اُن کا جود و عطا سمجھا جائے گا مگر ایسی کسی صورت کا ہونا مشکل ہے، کیونکہ معاویہ بن ابی سفیان تنگ دست آدمی تھے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کو اُن کے شوہر نے طلاق دے دی تو وہ عدت گزارنے کے بعد بارگاہِ نبوی ﷺ میں مشورہ کے لیے حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ اُنہیں دو شخصوں نے نکاح کا پیغام بھیجا ہے، جن میں سے ایک معاویہ بن ابوسفیان اور دوسرے ابوجہم ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

أَمَّا مُعَاوِيَةُ فَصُعْلُوكٌ لَا مَالَ لَهُ.

''رہا معاویہ تو وہ محتاج ہے، اس کے پاس کوئی مال نہیں''۔

(مسلم: کتاب الطلاق، باب المطلقة ثلاثا لا نفقة لها، ص ٦٨٦ حديث ١٤٨٠)

فتح مکہ کے موقع پر جب وہ، اُن کے ماں باپ اور بھائی مجبوراً اسلام میں داخل ہوئے تو مال لیتے تو رہے مگر خرچ نہیں کیا حتیٰ کہ اقتدار پر جا پہنچے۔ پھر جب وہ اقتدار پر براجمان ہوئے تو اُن کا ملکی وسائل سے کسی مسلم یا غیر مسلم کو کچھ دینا جود و سخا نہیں تھا بلکہ وہ مسلمانوں اور دوسرے انسانوں کا وہ حق تھا جو اُن کے دستِ تصرّف میں چلا گیا تھا۔

کیا رعایا کا حق رعایا کو دینا سخاوت ہے؟

بعض لوگوں کی سادگی یا سفاہت کی حد ہے کہ ابن صخر پر مملکتِ اسلامیہ کے سربراہ کی حیثیت سے

رعایا کے جو حقوق تھے اور جنہیں ادا کرنا اُن کے فرائض منصبی میں شامل تھا، اُسے وہ عام رعایا پر ہی نہیں بلکہ اہل بیت کرام علیہم السلام پر بھی سخاوتِ معاویہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں، حالانکہ لفظ سخاوت بولتے ہوئے جہاں ایک طرف سخی کا تو دوسری طرف ضرورت مند یا محتاج کا تصور اُبھرتا ہے۔ خود غور فرمایئے! جب یوں کہا جائے کہ فلاں نے فلاں پر سخاوت کی تو ذہن میں کیسا تصور آتا ہے؟ یاد رکھیئے! حکمرانوں کے دست تصرّف میں جو رعایا کے مالی حقوق ہوتے ہیں اُن کی ادائیگی کو حکمرانوں کا جود وسخا تو کیا نذرانہ بھی نہیں کہا جا سکتا مگر افسوس کی بات ہے کہ معاویہ کی جانب سے اُن حقوق کی ادائیگی کو وکلاءِ طلقاء تمام اہل اسلام پر تو کیا سیدین حسنین کریمین علیہما السلام پر بھی معاویہ کے جود وسخا اور فیاضی سے تعبیر کرتے ہیں۔ بعض لوگ حقوق کی اِس ادائیگی کو نذرانے کا نام بھی دیتے ہیں۔ گویا ایسے سب لوگوں کے نزدیک معاویہ بن ابی سفیان معطی، محسن اور نذرانہ پیش کرنے والا، جبکہ حسنین کریمین محتاج، ممنون اور بنوامیہ کے نذرانوں پر گذارا کرنے والے تھے۔ **إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّآ إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ.**

میرے سامنے وکلائے ملوکیت کی ایسی متعدد بے ڈھنگی تصریحات موجود ہیں مگر میں ایسے تمام اقتباسات سے صَرفِ نظر کرتے ہوئے یہاں شاہی مال کی ادائیگی کی حقیقت کو آپ کے سامنے رکھنا ضروری سمجھتا ہوں۔ امام ابوبکر احمد بن علی جصاص رازی حنفی رحمۃ اللہ علیہ متوفّٰی ۳۷۰ھ نے پہلے مشہور (نام نہاد خلیفہ) عبدالملک اور حجاج کا ظالم ہونا بیان کیا پھر اُن کے ہاتھوں سے صلحاء لوگ جو مالی حصے (جنہیں بعض احمق لوگ عطائیں قرار دیتے ہیں) قبول کرتے رہے، اُس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ یہ اُن صلحاء کے حقوق تھے جو اُن ظالم بادشاہوں کے ہاتھوں میں چلے گئے تھے، سو وہ صلحاء کرام اپنے ہی حقوق وصول فرماتے رہے۔ اس کے بعد امام جصاص نے بعض حکمرانوں کا نام لے کر اُنہیں بھی ظالموں کی اُسی فہرست میں شامل رکھا ہے۔ ذرا غور سے پڑھیئے! وہ لکھتے ہیں:

وَكَذٰلِكَ كَانَ سَبِيلُ مَنْ قَبْلَهُمْ مَعَ مُعَاوِيَةَ حِيْنَ تَغَلَّبَ عَلَى الْأَمْرِ بَعْدَ قَتْلِ عَلِيٍّ عليه السلام، وَقَدْ كَانَ الْحَسَنُ وَالْحُسَيْنُ يَأْخُذَانِ الْعَطَاءَ، وَكَذٰلِكَ مَنْ كَانَ فِيْ ذٰلِكَ الْعَصْرِ مِنَ الصَّحَابَةِ، وَهُمْ غَيْرُ مُتَوَلِّيْنَ

لَهُ بَلْ مُتَبَرِّؤُونَ مِنْهُ عَلَى السَّبِيْلِ الَّتِيْ كَانَ عَلَيْهَا عَلِيٌّ علیہ السلام إِلَى أَنْ تَوَفَّاهُ اللّٰهُ تَعَالىٰ إِلىٰ جَنَّتِهِ وَرِضْوَانِهِ ، فَلَيْسَ إِذًا فِيْ وِلَايَةِ الْقَضَاءِ مِنْ قِبَلِهِمْ وَلَا أَخْذُ الْعَطَاءِ مِنْهُمْ دَلَالَةً عَلَى تَوْلِيَتِهِمْ وَاعْتِقَادِ إِمَامَتِهِمْ.

''اور یہی طریقہ اُن سے ماقبل لوگوں کا معاویہ کے ساتھ رہا، جب اُس نے سیدنا علی علیہ السلام کی شہادت کے بعد حکومت پر غلبہ پایا تو سیدین حسنین کریمین علیہما السلام حصہ وصول فرماتے رہے، اور اسی طرح اُسی زمانے کے صحابہ اور دوسرے حضرات کا طریقہ رہا، وہ معاویہ سے محبت کرنے والے نہیں بلکہ اُس سے اُسی طرح نفرت کرنے والے تھے جس طرح سیدنا علی علیہ السلام نفرت کرتے تھے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں وفات دی اور اپنی جنت و رضا میں جگہ دی۔ پس اُن حکمرانوں سے قضا کے عہدہ کو قبول کرنا اور اُن سے وظیفہ وصول کرنا اُن سے محبت اور اُن کی خلافت کی حقانیت کی دلیل نہیں ہے''۔

(أحكام القرآن للجصاص الرازي ج١ ص٨٨)

دربارِ معاویہ میں اُس کی سخاوت کا پول

بعض لوگ امام جصاص رازی رحمۃ اللہ علیہ کی ایسی عبارات پر چیں بجبیں ہوتے ہیں، ایسے لوگوں کو جاننا چاہیئے کہ جس طرح وہ اپنے ممدوح کی فیاضی اور سخاوت کے جھوٹے ڈھنڈورے پیٹتے ہیں، ایسے ڈھنڈورے اُن کے ممدوح کو اُن کی زندگی میں محبوب رہے ہیں اور اُسی طرح بعد کے لوگوں تک پہنچے ہیں۔ موصوف حق داروں کو اُن کا حق دے کر اپنی تعریف چاہتے تھے۔ اکثر عوام نثر و نظم میں اُن کی تعریف کر دیتے تھے مگر بعض حقیقت شناسوں سے موصوف کو بھری مجلس میں کھری کھری بھی سننا پڑ جاتی تھی۔ چنانچہ علامہ بلاذری ''ولد أبو سفيان بن حرب'' عنوان کے تحت معاویہ بن ابی سفیان کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

''علماء سیر نے ذکر کیا ہے کہ ایک مرتبہ معاویہ نے بنو ہاشم کی جانب متوجہ ہو کر کہا: اے بنو ہاشم! میری عطا تمہارے لیے مسلسل ہے اور میرا دروازہ تم پر کھلا ہوا ہے، سو تم میری

عطا کو اپنے آپ سے منقطع نہ کرو، اور میرے دروازہ کو خود پر بند نہ کرو۔ میں اپنے اور تمہارے معاملہ میں مضطرب ہوں، تم سمجھتے ہو کہ جو کچھ میرے ہاتھ میں ہے تم اُس کے مجھ سے زیادہ حق دار ہو، اور میں سمجھتا ہوں کہ میں تم سے زیادہ حق دار ہوں۔ پس جب میں تمہیں کچھ دیتا ہوں جس سے تمہارا حق پورا ہو جاتا ہے تو تم کہتے ہو کہ ہم نے اپنے حق سے کم لیا ہے اور ہمیں ہمارے حصہ کے مطابق نہیں دیا گیا۔ سو میری حالت تو اُس شخص کی طرح ہے جس سے کچھ لیا جاتا ہے تو اُس کی تعریف نہیں کی جاتی ۔ میں تم میں برا پھنس گیا ہوں: دیتا ہوں تو میرا شکریہ ادا نہیں کیا جاتا اور روکتا ہوں تو مجھے معذور نہیں سمجھا جاتا، جبکہ تم ہر حال میں اچھائی پر ہو: تمہارا احتجاج کرنے والا انصاف پر سمجھا جاتا ہے اور مطالبہ کرنے والے کو مل جاتا ہے۔ اس پر سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تیرا مال کبھی بھی ہمیں اُس وقت تک نہیں ملا جب تک کہ ہم نے مطالبہ نہیں کیا اور تیرا دروازہ ہم پر اُس وقت تک نہیں کھلا جب تک کہ ہم نے دستک نہیں دی۔ اگر تم نے ہم سے اپنی خیر کو روک لیا تو ہمارے لیے اللہ عزوجل کی خیر تمہاری خیر سے بہتر ہے، اور اگر تم نے ہم پر اپنا دروازہ بند کر دیا تو ہم خود کو تم سے روک لیں گے۔ خدا کی قسم! ہم نے تجھ سے سوال کرنے میں تکرار نہیں کیا اور نہ ہی ہم نے تجھے مشقت میں ڈالا۔ "فَأَمَّا هٰذَا الْمَالُ فَلَيْسَ لَكَ مِنْهُ إِلَّا لِرَجُلٍ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ" (باقی اِس مال میں تمہارا حصہ بھی ایک عام مسلمان سے زیادہ نہیں ہے) جبکہ کتابِ الٰہی کی رو سے ہمارے لیے مال میں دو حق ہیں۔ ایک غنیمت کا حق اور دوسرا مالِ فئی کا حق۔ پس مالِ غنیمت میں ہم پر غلبہ پا لیا گیا اور مالِ فئی کو ہم نے لیا نہیں۔ پس اب تو صورتِ حال یہ ہے کہ کسی بھی طریقہ سے ہمیں تمہاری طرف سے کوئی چیز پہنچتی ہے تو ہم لے لیتے ہیں اور اُس پر اللہ تعالیٰ کی حمد بجا لاتے ہیں، پھر جو خیر تمہارے ہاتھ سے جاری ہوتی ہے اُس پر ہم تمہیں بھی شکریہ سے محروم نہیں رکھتے "وَلَوْلَا حَقُّنَا فِيْ هٰذَا

الْـمَـالِ مَا أَتَاکَ مِنَّا زَائِرٌ يَحْمِلُه خُفٌّ وَلَا حَافِرٌ" (اور اگر اِس مال میں ہمارا حق نہ ہوتا تو ہم میں سے کوئی بھی تمہارے پاس پیدل یا سوار آتا ہی نہ) جو کچھ میں نے کہا آیا یہ تمہیں کافی ہے یا مزید بھی کہوں؟ اِس پر معاویہ نے کہا: اے ابوالعباس! بس یہی کافی ہے، آپ ٹانکا لگاتے ہیں اور غلطی نہیں کرتے"۔

(أنساب الأشراف للبلاذري ج٥ ص ١٢٠، ١٢١؛ مرآة الزمان لسبط ابن الجوزي ج٨ ص ٤٥٢، في ترجمة ابن عباس؛ العقد الفريد ج٤ ص ٩٥)

اس سے معلوم ہوا کہ حسنین کریمین یا دوسرے بنو ہاشم پر معاویہ کا بابِ جود و عطا نہیں کھلا ہوا تھا بلکہ اُنہیں اُن کے استحقاق سے بھی کم ملتا تھا، جبکہ موصوف خود اپنے لیے اپنے حق سے زیادہ رکھ لیتے تھے، اسی لیے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کھلے بندوں فرما دیا تھا کہ اِس مال میں تمہارا حصہ بھی ایک عام مسلمان سے زیادہ نہیں ہے۔ بعض زائغین حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب قول کا سہارا لیتے ہوئے معاویہ کو "أَسْوَدُ مِنْ عُمَرَ" (سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر سردار) ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اُنہیں چاہیے کہ وہ یہاں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے قمیص والے واقعہ کو ذہن میں لا کر ذرا غور تو کریں کہ کس کا تقابل کس سے کر رہے ہیں؟ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم نے اپنا حصہ اتنا محدود مقرر کر رکھا تھا کہ روزمرہ حصہ سے اُن کے گھر میں سادہ سالن روٹی کے علاوہ الگ سے میٹھی چیز پکانا مشکل تھا جبکہ موصوف دن میں سات سات مرتبہ انواع واقسام کے کھانے کھاتے کھاتے تھک جاتے تھے مگر سیر نہیں ہوتے تھے، لیکن حیرت ہے کہ اِس کے باوجود روایاتِ موضوعہ کے دلدادہ لوگوں کے مطابق وہ پھر بھی شیخین کریمین رضی اللہ عنہما سے بڑے سردار اور بڑے سیاست دان تھے۔ فَاعْتَبِرُوْا يَاأُولِي الْأَبْصَارِ!

انصار رضی اللہ عنہم سے ترجیحی سلوک کا اوّلین مرتکب

موصوف نہ صرف یہ کہ بنو ہاشم کو اُن کے مکمل حصہ سے محروم رکھتے تھے بلکہ انصار رضی اللہ عنہم کو بھی اُن کے اصل حق سے محروم رکھتے تھے اور اُن پر دوسرے طلقاء اور بنو امیہ کو ترجیح دیتے تھے۔ چنانچہ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انصار رضی اللہ عنہم کو پہلے ہی آگاہ کرتے ہوئے فرمایا تھا:

إِنَّكُمْ سَتَلْقُوْنَ بَعْدِيْ أُثْرَةً ، فَاصْبِرُوْا حَتىٰ تَلْقَوْنِيْ وَمَوْعِدُكُمُ الْحَوْضُ.

''عنقریب تم میرے بعد ترجیحی سلوک کا سامنا کرو گے،لہٰذا مجھ سے ملاقات تک صبر کرنا اور ہمارے تمہارے ملنے کی جگہ حوض ہے''۔

(بخاري: كتاب مناقب الأنصار،باب قول النبي ﷺ للأنصار: اصبروا حتىٰ تلقوني على الحوض،حديث۳۷۹۳)

علامہ ابن سید الناس یعمری لکھتے ہیں:

إِنَّكُمْ سَتَلْقُوْنَ بَعْدِيْ أُثْرَةً ، فَكَانَتْ زَمَنَ مُعَاوِيَةَ.

''عنقریب تم میرے بعد ترجیحی سلوک کا سامنا کرو گے،تو یہ ترجیح معاویہ کے زمانے میں تھی''۔

(عيون الأثر في فنون المغازي والشمائل والسير ج۲ ص۳۷٦؛نور العيون في تلخيص سيرة الأمين المأمون ص۱۲٤)

شیخ شمنّی ، ملا علی قاری اور شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہما لکھتے ہیں:

قَالَ الْيَعْمَرِيُّ: كَانَتْ هٰذِهِ الْأَثَرَةُ فِيْ زَمَنِ مُعَاوِيَةَ.

''علامہ یعمری فرماتے ہیں: یہ ترجیحی سلوک معاویہ کے زمانے میں ہوا''۔

(مزيل الخفاء عن ألفاظ الشفاء ج۱ ص۲۱۰؛شرح الشفا لعلي القاري ج۱ ص٦۹٦؛مدارج النبوة ص۲٥۳)

علامہ خفاجی لکھتے ہیں:

قَالَ ابْنُ سَيِّدِالنَّاسِ: كَانَ اِبْتِدَاءُ هٰذَا فِيْ زَمَنِ مُعَاوِيَةَ.

''ابن سید الناس نے کہا ہے: اس ترجیحی سلوک کا آغاز معاویہ کے زمانے میں ہوا''۔

(نسيم الرياض ج٤ ص۱۸٦)

انصار رضی اللہ عنہم کو اس ترجیحی سلوک سے کتنا متاثر اور پریشان ہوتے تھے؟ اِس کی کچھ تفصیل ہماری کتاب ''الأحاديث الموضوعة في فضائل معاوية'' میں دیکھی جائے۔ ویسے خدا لگتی بات ہے کہ انصار رضی اللہ عنہم

نے جو نبی کریم ﷺ کو اپنی طرف ہجرت کرنے کی دعوت دی اور آپ پر اپنا تن من دھن قربان کرنے کا جو وعدہ کیا اور پھر تمام مشکلات وغزوات میں اُس وعدہ کو نبھایا بھی، اُس جرم کی سزا اُنہیں تادم حیات ملتی رہی۔ غزوات میں ایک طرف وہ دادِ شجاعت دیتے تھے تو دوسری طرف سیدنا علی رضی اللہ عنہ قریش مکہ کی تکہ بوٹی کرتے تھے، اور پھر جب اُنہی قریش کی اولاد کسی طرح اقتدار کے ایوانوں تک پہنچ گئی تو یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ سیدنا علی اور انصار رضی اللہ عنہم کو اُن کے جرمِ جہاد کا مزہ نہ چکھاتے؟ یہی وجہ ہے کہ احادیث صحیحہ میں جہاں ایک طرف سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھنے کو منافقت فرمایا گیا تو دوسری طرف جماعتِ انصار رضی اللہ عنہم سے بغض کو بھی منافقت فرمایا گیا۔ اِس قسم کی احادیث کے لیے صحیح مسلم میں "**كتاب الإيمان، باب الدليل على أن حب الأنصار وعلي رضي الله عنه من الإيمان وعلاماته، وبغضهم من علامات النفاق**" کا مطالعہ فرمایئے اور سوچیئے کہ آخر نبی کریم ﷺ نے ایسا کیوں فرمایا، آپ کی نگاہوں میں مستقبل کا آخر کیا منظر ہوگا؟

خلاصہ یہ ہے کہ حسنین کریمین، دوسرے بنو ہاشم اور انصار رضی اللہ عنہم کو حکومتِ معاویہ میں جو کچھ ملتا تھا وہ اُن کے حصہ سے بھی کم ہوتا تھا اور وہ بھی مطالبہ کے بغیر نہیں ملتا تھا، لہٰذا اس کو معاویہ کا جود وعطا، سخاوت، تحائف اور نذرانہ قرار دینا حقیقت کے خلاف ہے۔ بعض لوگ کچھ غیر معتبر روایات درج کرنے کے بعد اُن پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "نیز حضرت سیدنا امام حسن وحسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا آپ کی طرف سے پہنچنے والے تحائف کا قبول فرمالینا بھی اِس بات کی دلیل ہے کہ آپ کے درمیان ادب ومحبت کا رشتہ قائم تھا"۔

(فیضان امیر معاویہ ص ۹٤)

یہ جھوٹ پر مبنی محض لفاظی ہے، حقیقت وہ ہے جو سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ اور امام جصاص رازی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے ذکر ہوچکی ہے۔ کیا ادب ومحبت اِسی کو کہتے ہیں کہ موصوف نے سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی اچانک شہادت کو مصیبت ہی نہ سمجھا اور اُن کے روبرو ایک بدبخت اسدی شخص نے امام پاک کو "جَمْرَةٌ" (انگارہ) کہہ دیا تو موصوف نے اُس بدزبان شخص پر برہم ہونے کی بجائے اُسے انعام سے نواز دیا، جیسا

کہ ہم اِس سے قبل ''معاویہ کو امام پاک کیوں ناپسند تھے؟'' کے عنوان کے تحت سنن ابی داود وغیرہ کے حوالہ سے لکھ چکے ہیں۔

خیال رہے کہ جس طرح کسی صحابی کی شان میں وارد شدہ سچی احادیث کا عمداً انکار کرنا بدبختی اور جہنمی ہونے کی دلیل ہے اسی طرح جھوٹی روایات بیان کرنا اور اُن سے استدلال کرنا بھی بدبختی اور جہنمی ہونے کی دلیل ہے۔

کچھ دے کر اِترانا بھی تواضع؟

بعض لوگوں نے لکھا ہے:

> ''ایک مرتبہ حضرت سیدنا امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس تشریف لائے تو حضرت سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: آج میں آپ کو وہ نذرانہ پیش کروں گا جو کبھی کسی نے دوسرے کو نہ کیا ہوگا۔ چنانچہ آپ نے حضرت سیدنا امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں چار لاکھ درہم پیش فرمائے''۔

(فیضان أمیر معاویة رضی اللہ تعالیٰ عنه ص ۸۹)

بعض حکماءِ امت نے بھی بلاتأمل ایسے الفاظ نقل کردیے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''ایک بار فرمایا کہ آج میں آپ کو وہ نذرانہ دیتا ہوں جو کبھی کسی نے کسی کو نہ دیا ہو''۔

(مرآۃ المناجیح ج۸ ص ٤٦١)

اِن روایات کی صحت وعدم صحت سے قطع نظر اہل عقل وفہم سے سوال ہے کہ کسی کو کچھ دیتے ہوئے یوں کہنا کہ آج میں آپ کو وہ نذرانہ پیش کروں گا جو کبھی کسی نے دوسرے کو (پیش) نہ کیا ہوگا۔ کیا یہ جملہ تواضع پر مبنی ہے؟ اعلیٰ ظرف لوگوں کے نزدیک تو اضع تو اِس بات میں سمجھی جاتی ہے کہ کسی سفید پوش انسان کو بھی اگر زیادہ سے زیادہ مال دیا جائے تو یوں کہا جاتا ہے: اگرچہ یہ حقیر سا نذرانہ جناب کی شایانِ شان نہیں ہے، تاہم قبول فرمایئے! پھر خود سوچیئے کہ اگر کوئی انسان عام شخص کو نہیں بلکہ اپنے نبی کے لختِ جگر اور نوجوانانِ

اہل جنت کے سردار کو کچھ دیتے ہوئے مذکورہ بالا الفاظ کہے تو کیا اِس انداز کو تواضع کہا جا سکتا ہے؟

تنبیہ:

قارئین کرام! اِن دونوں عبارتوں میں سیدنا امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ کی توہین کا پہلو پایا جاتا ہے۔ وہ اس طرح کہ اِن دونوں عبارتوں میں لکھا گیا ہے "معاویہ نے امام حسن علیہ السلام کو "فرمایا" حالانکہ لکھنا چاہیئے تھا کہ اُس نے "عرض کیا" گویا کہ اِن نام نہاد بادب لوگوں کے نزدیک سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام غلام یا مفضول ہیں اور معاویہ سردار اور افضل ہے، جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کو مطلقاً "سَیِّـــــد" (سردار) فرمایا ہے۔

اعلیٰ ظرف ہستیوں کا انداز

دل پر ہاتھ رکھ کر بتلایئے! اگر بادشاہِ وقت غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کو ڈھیروں مال دیتے ہوئے ایسے الفاظ استعمال کرتا کہ "آج میں آپ کو وہ نذرانہ دیتا ہوں جو کبھی کسی نے کسی کو نہ دیا ہو" تو کیا اُسے ادب و تواضع پر محمول سمجھا جاتا؟ ہرگز نہیں۔ آیئے! اِس سلسلے میں ہم آپ کے سامنے تواضع اور انسانی ادب کا صحیح نمونہ پیش کرتے ہیں۔ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا سہارنپوری نے سیدنا امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ کی فیاضی کا ایک طویل واقعہ لکھا ہے، جس کا دوسرا نصف حصہ یوں ہے کہ امام پاک نے سائل کو فرمایا:

> "اگر آپ اِس بات کے لیے تیار ہوں کہ جو میرے پاس موجود ہے اُس کو آپ خوشی سے قبول کریں اور مجھے اِس پر مجبور نہ کریں کہ میں وہ مقدار پیش کروں جو آپ کے مرتبہ کے مناسب ہو اور آپ کا جو حق مجھ پر واجب ہو گیا ہے وہ مقدار اُس کو پورا کر سکے تو میں بخوشی حاضر ہوں۔ اُس سائل نے کہا: اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیٹے! جو کچھ آپ دیں گے میں اُسی کو قبول کر لوں گا اور اُس پر شکر گذار ہوں گا اور اُس سے زیادہ نہ کرنے میں آپ کو معذور سمجھوں گا۔ اِس پر حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اپنے خزانچی سے فرمایا کہ اُن تین لاکھ درہموں میں سے (جو تمہارے پاس رکھوائے تھے) جو بچے

ہوں لے آؤ۔ وہ پچاس ہزار درہم لائے (کہ اُس کے علاوہ سب خرچ ہو چکے تھے)
حضرت حسن ؓ نے فرمایا کہ پانچ سو دینار (اشرفیاں) اور بھی تو کہیں تھے؟ خزانچی
نے عرض کیا کہ وہ بھی موجود ہیں۔ آپ نے فرمایا: وہ بھی لے آؤ۔ جب یہ سب کچھ
آ گیا تو اُس سائل سے فرمایا: کوئی مزدور لے آؤ جو اِس سب کچھ کو تمہارے گھر تک
پہنچا دے، وہ دو مزدور لے آئے۔ حضرت حسن ؓ نے وہ سب کچھ اُن کے حوالے کر
دیا اور اپنے بدن مبارک سے چادر اُتار کر مرحمت فرمائی کہ اُن مزدوروں کی مزدوری
بھی تمہارے گھر تک پہنچانے کی میرے ہی ذمہ ہے، لہٰذا یہ چادر فروخت کر کے اُن کو
مزدوری میں دے دینا۔ حضرت حسن ؓ کے غلاموں نے عرض کیا کہ ہمارے پاس تو
اب کھانے کے لیے ایک درہم بھی باقی نہیں رہا، آپ نے سب کا سب ہی دے دیا۔
حضرت حسن ؓ نے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ شانہ کی ذات سے قوی امید ہے کہ وہ اپنے
فضل سے مجھے اس کا بہت ثواب دے گا۔ سب کچھ دے دینے کے بعد جب کہ اپنے
پاس کچھ باقی نہ رہا اور مقدار بھی اتنی زیادہ تھی پھر بھی آپ کو اس بات کا قلق اور ندامت
رہی کہ سائل کا حق ادا نہ ہو سکا''۔

(فضائل صدقات (بتسهيل قليل) ص ٥٤٠، ٥٤١)

یہ ہے اعلیٰ ظرفی کی عمدہ مثال کہ گھر میں جو کچھ موجود تھا سب کا سب خرچ کر دیا مگر سمجھا یہ کہ ہم نے
کچھ بھی نہیں دیا۔ پھر قابل غور بات یہ ہے کہ سب کچھ لٹانے کے باوجود دل کا غناء قائم رہا اور حدیث پاک
میں ہے:

خَيْرُ الصَّدَقَةِ مَا كَانَ عَنْ ظَهْرِ غِنًى.

''بہترین خیرات وہ ہے جس کے پیچھے غنیٰ موجود ہو''۔

(بخاري ص ۱۹۳ حديث ١٤٢٦)

کیا حق دار کو اُس کا اپنا مال دینا سخاوت ہے؟

ہمارے بعض حکماءِ امت اور اُمراءِ اہل سنت نے معاویہ بن ابی سفیان کی جس نام نہاد فیاضی، دریا دلی، سخاوت، عطایا اور نذرانوں کا ذکر کیا ہے، وہ نہ تو اُس کے آباؤ اجداد کا مال تھا اور نہ ہی وہ اُس مال میں سے تھا جو اُنہیں اپنے حصہ سے ملتا تھا۔ وہ تو اہل اسلام کے حقوق میں سے اُنہیں کچھ نہ کچھ دے کر اُس پر اتراتے تھے اور دیتے وقت کہتے تھے: "أَنَـا ابْـنُ الْهِنْدِ" (میں فرزند ہند ہوں) اور باقی مال اپنے لیے اور اپنے اہل و عیال کے لیے ذخیرہ کر لیتے تھے۔ چنانچہ اُنہوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اپنے لختِ جگر یزید پلید کے لیے یوں پیغامِ وصیت چھوڑا تھا:

يَا بُنَيَّ ! إِنِّي قَدْ كَفَيْتُكَ الشَّدَّ وَالتِّرْحَالَ ، وَوَطَّأْتُ لَكَ الْأُمُوْرَ ، وَذَلَّلْتُ لَكَ الْأَعْدَاءَ ، وَأَخْضَعْتُ لَكَ رِقَابَ الْعَرَبِ ، وَجَمَعْتُ لَكَ مَا لَمْ يَجْمَعْهُ أَحَدٌ.

"پیارے بیٹے! میں نے تیرے لیے کافی تگ و دو کی ہے، میں نے تیرے لیے تمام اُمور آسان کر دیے ہیں، میں نے تیری خاطر دشمنوں کو ذلیل کر دیا ہے، میں نے تیری خاطر عرب کی گردنوں کو جھکا دیا ہے اور میں نے تمہاری خاطر وہ کچھ جمع کر دیا ہے جو کسی نے بھی جمع نہیں کیا"۔

(الكامل فی التاريخ، سنة ستين، ذكر وفاة معاوية ج۳ ص ۱۱۹؛ تاريخ الطبري، ذكر عهد معاوية لابنه يزيد، ج ۵ ص ۳۲۲)

اِس کلام میں دو باتیں قابلِ غور ہیں: اوّلاً یہ کہ موصوف نے اِس وصیت میں اپنے لختِ جگر کو مخاطب کرتے ہوئے متعدد بار "لَکَ لَکَ" (تیری خاطر، تیرے لیے) تو کہا لیکن پوری وصیت میں ایک بار بھی "لِـلْاِسْلَامِ" (اسلام کے لیے) نہیں کہا۔ ثانیاً یہ کہ وہ ساری زندگی اپنے اہل و عیال کے لیے مال جمع کرتے رہے اور آخری وصیت میں اُسی کا تذکرہ کرتے رہے۔ فی الجملہ یہ کہ وہ اپنے مال سے نہیں بلکہ اہل اسلام پر اُن ہی کے مال میں سے کچھ خرچ کرتے تھے، لہٰذا اِس کو ہمارے حکماءِ امت اور اُمراءِ اہل سنت کا

فیاضی اور سخاوت باور کرانا ایسا ہی ہے جیسا کہ دورِ حاضر میں سرکاری خرچ پر کچھ بنا کر بعض وزراء اعظم کے نام کی تختی لگانا۔ ہاں اگر ایسا ہوتا کہ وہ قحط سالی میں سیدنا عمرؓ کی طرح خود فاقہ کشی کرتے یا پھر بیت المال کا سارا مال خرچ کرنے کے بعد اُس میں جھاڑو پھیر کر وہاں دوگانہ نفل ادا کر کے شکرِ الٰہی بجالاتے اور کہتے کہ یا اللہ تیرا شکر ہے کہ حق حقداروں تک پہنچ گیا اور پھر اپنے ذاتی حصہ میں سے حسنین کریمین یا دوسرے اہل اسلام پر خرچ کرتے تو ایسے اقدام کو اُن کی فیاضی اور سخاوت کہنا یقیناً سچی اور عقل مندی کی بات ہوتی۔

حُبِ دنیا میں مبتلا سخی کیونکر؟

معاویہ بن صخر ساری زندگی اپنے اہل اعیال کے لیے مال جمع کرنے میں لگے رہے اور آپ نے ابھی پڑھا کہ اُنہوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں جو وصیت کی وہ بھی مال کے متعلق تھی۔ ظاہر ہے کہ انسان کو اُس کے آخری وقت میں اُسی بات کی فکر زیادہ ہوتی ہے جو اُس کی زندگی کا محور رہی ہو، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ "كُلُّ إِنَاءٍ يَنْضَحُ بِمَا فِيهِ" (ہر برتن اُسی چیز سے ٹپکتا ہے جو اُس کے اندر ہو) اِسی لیے اسلاف کرام اور صوفیہ میں سے مسلّم ہستیوں نے اعتراف کیا ہے کہ وہ حُبِّ دنیا میں مبتلا تھے۔ چنانچہ مشہور ترین صوفی بزرگ حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

كَانَ مِنَ الْعُلَمَاءِ الْكِبَارِ ، مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ وَلٰكِنِ ابْتُلِيَ بِحُبِّ الدُّنْيَا.

"وہ اصحابِ نبی ﷺ کے اکابر علماء میں سے تھے لیکن دنیا کی محبت میں مبتلا ہو گئے تھے"۔

(تاریخ دمشق ج۵۹ ص۲۱۳؛ البدایة والنهایة ج۸ ص۲۰۳)

شاید یہاں بعض ذہنوں میں یہ خیال پیدا ہو کہ فضیل بن عیاض اعتراض کرنے والے کون ہوتے ہیں؟ ایسے لاکھوں کروڑوں صوفیہ کسی صحابی کی گردِ راہ کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ ایسے عقل مندوں کے لیے عرض ہے کہ بات صحابی اور غیر صحابی کے تقابل کی نہیں ہو رہی بلکہ یہاں بات ہو رہی حبِ دنیا میں مبتلا ہونے کی، اور حُبِ دنیا میں کوئی عالم مبتلا ہو جائے یا غیر عالم، صحابی مبتلا ہو جائے یا غیر صحابی، جو کوئی بھی جتنا حُبِ دنیا میں مبتلا ہو جائے وہ اتنا ہی دین سے دور ہو جاتا ہے۔ سورۃ التوبہ کی آیات نمبر۷۵، ۷۶، ۷۷ وغیرھا میں بعض صحابہ کا ذکر ہے کہ وہ حُبِ دنیا میں مبتلا ہوئے تھے تو دین سے ہی ہاتھ دھو بیٹھے تھے، اسی لیے ارشاد فرمایا گیا

دنیا کی محبت ہر گناہ کی جڑ ہے۔

کیا صحابی بھی حُبِّ دنیا میں مبتلا ہو سکتا ہے؟

پھر بھی اگر کسی کے دِل میں خلش ہو کہ حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ کا مذکور الصدر قول ایک صحابی کے بارے میں غیر صحابی کا قول ہے، لہٰذا قابلِ قبول نہیں تو ہم اُس کے سامنے سابقون اولون میں سے ایک ایسے صحابی کا قول پیش کرتے ہیں جنہیں شیطان سے محفوظ و مامون فرمایا گیا ہے، جیسا کہ ہم صحیح بخاری کے حوالے سے لکھ چکے ہیں، اُنہوں نے اپنی زندگی کی آخری تقریر میں جامِ شہادت نوشِ جاں کرنے سے قبل قسم کھا کر فرمایا تھا کہ ''اِن لوگوں کے دلوں میں کوئی خشیتِ الٰہی نہیں بلکہ یہ دنیوی لذتوں اور حُبِّ جاہ میں مبتلا ہو چکے ہیں''۔ اُس عظیم صحابی کی یہ تقریر ہم اپنی کتب ''شرح خصائص علي ﷺ'' وغیرہ میں نقل کر چکے ہیں۔ جن حضرات کو اصل کتب کی طرف رجوع کرنے کا شوق ہو تو وہ کتب سیر و تاریخ میں ۳۷ ہجری کے حالات میں سیدنا عمار بن یاسر ﷺ کے احوال کا مطالعہ فرمائیں، خصوصاً ابن کثیر کی ''البداية والنهاية ج ۵ ص ۳٦۷، وط: ج۷ ص ٤۵۵، وط: ج ۱۰ ص ۵۲۷، ملاحظہ فرمائیں۔

اگر کچھ لوگوں کے ذہن میں پھر خیال پیدا ہو کہ سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما تو تھے ہی سیدنا علی ﷺ کی پارٹی کے آدمی تو اُن کی یہ بات کیونکر تسلیم کی جا سکتی ہے؟ تو ایسے لوگوں کے لیے ہم حدیث نبوی ﷺ پیش کر دیتے ہیں۔ بخاری شریف میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے صحابہ کو مخاطب کرتے ہوئے اُن کے دنیا میں مبتلا ہونے کا خدشہ یوں ظاہر فرمایا تھا:

وَإِنِّي لَسْتُ أَخْشَىٰ عَلَيْكُمْ أَنْ تُشْرِكُوا ، وَلٰكِنِّي أَخْشَىٰ عَلَيْكُمُ الدُّنْيَا أَنْ تَنَافَسُوهَا.

''مجھے تم پر یہ خدشہ نہیں کہ تم شرک کرو گے لیکن مجھے تم پر دنیا کا خدشہ ہے کہ تم اس میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو گے''۔

(بخاري: كتاب المغازي، باب غزوة أحد، ص ۱۵۵ حديث ٤۰٤۲؛ مسلم: كتاب الفضائل، باب إثبات حوض نبينا ﷺ وصفاته، ص ۱۰۸۸ حديث ۳۱ [۲۲۹٦])

پھر اگر کسی شخص کو صحیحین کی اِس حدیث پر بھی اعتماد نہ ہو تو ہم اُس کے سامنے قرآن مجید کی آیت پیش کر دیتے ہیں، یقین فرمائیے! اللہ تعالیٰ نے درج ذیل آیت میں صحابہ کو ہی خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

مِنْكُمْ مَنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ.

''بعض تم میں سے طلبگار ہیں دنیا کے اور بعض تم میں سے طلب گار ہیں آخرت کے''۔

(آل عمران: ۱۵۲)

امام سیوطی نے سندِ صحیح کے ساتھ سیدنا ابن مسعود سے روایت کیا ہے کہ اُنہوں نے فرمایا:

مَا كُنْتُ أَرٰى أَنَّ أَحَدًا مِنْ أَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ يُرِيْدُ الدُّنْيَا حَتّٰى نَزَلَ فِيْنَا يَوْمَ أُحُدٍ: ﴿مِنْكُمْ مَنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ.

''میں رسول اللہ ﷺ کے اصحاب میں سے کسی کو نہیں سمجھتا تھا کہ وہ دنیا کا ارادہ رکھتا ہے، حتیٰ کہ اُحد کے دن ہمارے بارے میں نازل ہوا ﴿بعض تم میں سے طلبگار ہیں دنیا کے اور بعض تم میں سے طلب گار ہیں آخرت کے﴾''۔

(الدر المنثور للسیوطي ج٤ ص ٧٠)

سو اگر کسی شخص کو قرآن وحدیث کی تصریح کے مطابق سابقین صحابہ کرام میں سے بعض صحابہ کا حُبّ دنیا میں مبتلا ہونا تسلیم ہو تو پھر اُسے یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ بعض طلقاء اور مؤلفۃ القلوب بدرجۂ اتم حُبّ دنیا میں مبتلا تھے اور سونا چاندی کے دلدادہ تھے۔ چنانچہ متعدد کتب حدیث وسیر وغیرہ میں حضرت حکم بن عمرو غفاری کی سوانح میں آیا ہے کہ زیاد ابن ابیہ جب معاویہ کی طرف سے کوفہ کا گورنر تھا تو اُس نے خراسان کی طرف ایک لشکر بھیجا اور اُس کا سربراہ صحابیٔ رسول سیدنا حکم بن عمرو الغفاری کو مقرر کیا۔ اُنہوں نے خراسان کو فتح کر لیا اور کثیر مالِ غنیمت حاصل کیا۔ زیاد نے اُنہیں ایک خط روانہ کیا، جس کا مضمون یہ تھا:

أَمَّا بَعْدُ: فَإِنَّ أَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ كَتَبَ إِلَيَّ أَنْ اصْطَفِيَ لَهُ الصَّفْرَاءُ وَالْبَيْضَاءُ، فَلَا تُقْسَمُ بَيْنَ النَّاسِ ذَهَبًا وَلَا فِضَّةً.

''امابعد: امیر المومنین نے میری طرف ایک خط لکھا ہے کہ سونا چاندی اُن کے لیے الگ کرلیا جائے، لہٰذا سونا چاندی مجاہدین میں تقسیم نہ کیا جائے''۔

جواباً سیدنا حکم بن عمرو الغفاری ؓ نے اُس کی طرف یوں لکھ بھیجا:

''تمہارا خط مجھے پہنچ چکا ہے، تم نے اُس میں امیر المومنین کی کتاب (خط) کا ذکر کیا ہے، جبکہ میرے پاس امیر المومنین کی کتاب (خط) سے قبل اللہ کی کتاب موجود ہے، اور اللہ کی قسم! اگر زمین وآسمان کسی بندے کو کچلنے کے لیے باہم جُڑ جائیں اور وہ بندہ خوفِ الٰہی رکھتا ہو تو اللہ تعالیٰ اُس کے نکلنے کی سبیل پیدا فرمادے گا، والسلام۔ پھر سیدنا حکم بن عمرو الغفاری ؓ نے لوگوں میں اعلان کرادیا کہ وہ مال غنیمت آپس میں تقسیم کرلیں۔ معاویہ نے چونکہ سیدنا حکم بن عمرو کو تقسیم کے متعلق ایک حکم کیا تھا، اُنہوں نے اس حکم کی تعمیل نہ کی تو انہیں قید کردیا گیا اور وہ اسی قید ہی میں انتقال فرماگئے''۔

بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ جب اُن کے پاس یہ خط پہنچا اور اُنہوں نے اس کی تعمیل نہ کی تو اس موقع پر اُن کی زبان پر یہ الفاظ جاری ہوگئے:

''اے اللہ! اگر میرے لیے تیرے پاس کوئی خیر ہے تو مجھے اپنے پاس بلالے،
پھر وہ اسی عرصہ میں خراسان کے علاقہ مَرُو میں انتقال فرماگئے''۔

(المستدرك: كتاب معرفة الصحابة، ذكر مناقب الحكم بن عمرو الغفاري ؓ ج۳ص۴٤۲، وط: ج۳ص۵۰۱ حديث ۵۸٦۹؛ الطبقات الكبرى لابن سعد ج۹ص۲۸؛ تاريخ الطبري ج٤ ص۲۷؛ الاستيعاب (قديم) ص۳۵۷، ۳۵۸؛ الكامل فى التاريخ لابن أثير ج۳ص۳۲٤؛ أسد الغابة ج۲ص۵۲؛ معرفة الصحابة لأبي نعيم ج۲ص۷۰۸؛ المنتظم لابن الجوزي ج۵ص ۲۳۰؛ صفة الصفوة ج۱ص٦۷۲؛ مرآة الزمان لسبط ابن الجوزي ج۷ص۱۷۹؛ تهذيب الكمال للمزي ج۷ص۱۲۷؛ تذهيب تهذيب الكمال للذهبي ج۲ص٤۱٦؛ سير أعلام النبلاء ج۲ ص٤۷٤، ٤۷۵)

علامہ ذہبی نے اس حدیث پر سکوت اختیار کیا ہے۔

فقہاء احناف میں سے امام ابن مازہ حنفی، امام برہان الدین مرغینانی حنفی، قاضی خاں اوزجندی حنفی، امام برھان الدین ابوالمعالی حنفی، امام ابن الہمام حنفی، زین الدین ابن نجیم مصری حنفی، سراج الدین ابن نجیم حنفی، امام اکمل الدین بابرتی حنفی، امام عینی حنفی، امام فخر الدین زیلعی حنفی، امام شھاب الدین شلبی حنفی، امام ابن الشحنہ حنفی، ملاجیون حنفی اور علامہ عبدالحی لکھنوی حنفی وغیرہم نے بھی ادب القاضی کی بحث میں معاویہ کو جائر اور غیر عادل قرار دیتے ہوئے یہ واقعہ نقل کیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

(شرح أدب القاضي لابن مازة ج۱ ص ۱۳۰، ۱۳۲؛ الهداية ج۲ ص ۱۰۲؛ فتاوى قاضي خان ج۲ ص ۲۸۶؛ المحيط البرهاني ج۸ ص ۶؛ فتح القدير ج۷ ص ۲۴۵؛ البحر الرائق ج۶ ص ۴۶۰؛ النهر الفائق ج۳ ص ۶۰۳؛ العناية في شرح الهداية للبابرتي مع فتح القدير ج۷ ص ۲۶۰؛ البناية في شرح الهداية للعيني ج۹ ص ۱۴؛ تبيين الحقائق ج۴ ص ۱۷۷؛ حاشية الشلبي على تبيين الحقائق على هامشه ج۴ ص ۱۷۷؛ لسان الحكام لابن شحنه حنفي ص ۳؛ التفسيرات الأحمدية ص ۱۹۳؛ شرح الهداية للكنوي ج۵ ص ۳۵۹)

سو جو شخص خود مالِ دنیا کا اِس حد تک دلدادہ ہو کہ جائز و ناجائز کا بھی خیال نہ کرتا ہو اور دوسروں کے حق سے بھی اپنے لیے رکھ لیتا ہو تو وہ حسنین کریمین یا کسی بھی شخص کے لیے سخی کیونکر ہو سکتا ہے؟

اُمِّ یزید کے ساتھ شادی پر شاہ خرچیاں

داشتہ بکار آید، چونکہ موصوف نے سیم وزر اور مال و جواہر جمع کر رکھے تھے اِس لیے خوشی کے اہم مواقع پر خوب خرچ کرتے تھے۔ چنانچہ جب موصوف نے عیسائی عورت میسون بنت بحدل (اُمِّ یزید) سے شادی کرنا چاہی تو سیم وزر کا خوب مظاہرہ کیا، جیسا کہ مشہور مناظرِ اہلِ سنت حضرت علامہ مولانا منظور احمد فیضی کے تلمیذ اور غزالیِ زماں علامہ سید احمد سعید شاہ صاحب کاظمی محدث ملتانی رحمۃ اللہ علیہما کے مرید سراجِ اہلِ سنت علامہ سراج احمد سعیدی "حیاۃ الحیوان ج ۲ ص ۲۱۲" کے حوالہ سے اُس شادی کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قبیلہ بنی کلب کی میسون بنت بحدل جو یزید بن معاویہ کی والدہ ہے، بے حد حسن و جمال رکھتی تھی، جب حضرت معاویہ کے حرم میں داخل ہوئی تو اُن کی منظور نظر ہوگئی، آپ نے اُس کے لیے ایک اونچا محل تیار کرایا جس سے غوطہ دمشق کا سرسبز وشاداب باغ نظر آتا تھا، اور قسم وقسم کے نقش ونگار سے اُس محل کو مزین کرایا، زیب وزینت کے لیے سونے چاندی کے برتن کمروں کے رنگ کے مشابہ اُس میں رکھے، رومی ریشم کے رنگین اور پھول دار پردے لٹکائے (قالین بچھوائے) پھر آپ نے اُسے حوروں کی مانند خوب صورت باندیوں کے ہمراہ اُس محل میں ٹھہرایا۔

ایک دن میسون نے اپنا بہترین سوٹ پہن کر بناؤ سنگھار کیا، عطریات لگائے اور اپنے زیورات اور ہیروں کو جن کا مثل اب نہیں پایا جاتا زیب تن کیا، پھر اپنے گھر کے بالا خانہ میں جا بیٹھی، جبکہ اُس کے اردگرد کنیزیں تھیں، وہاں سے اُس نے غوطہ پر نظر ڈالی اور اُس کے درختوں کا نظارہ کرنے لگی، گھونسلوں سے پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں اُسے سنائی دے رہی تھیں، پھولوں اور کلیوں کی مہک اُس کے مشام جان کو معطر کر رہی تھی تو اُسے (اُس کا سرسبز وشاداب وطن) نجد یاد آگیا اور اُسے اپنی سہیلیوں اور اپنے لوگوں کی یاد آنے لگی، پھر اُسے اپنی پیدائش کی جگہ یاد آئی تو وہ رو پڑی اور سسکیاں بھرنے لگی، تو اُس کی ایک چہیتی کنیز نے پوچھا: آپ کے رونے کی وجہ کیا ہے؟ جبکہ آپ ملکۂ بلقیس کے ملک کی مانند ملک کی ملکہ ہیں۔

تو اُس نے ایک لمبی آہ بھر کر کہا: (اُس کے اشعار کا ترجمہ)

۱۔ اُس گھر کے لیے (رو رہی ہوں) جس میں ہواوں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں، وہ گھر جو مجھے بلند و بالا محل سے زیادہ پسند ہے۔

۲۔ اور مجھے وہاں آنکھوں کی ٹھنڈک حاصل ہونے کے ساتھ موٹا لباس پہننا (یہاں کے) نرم ونازک اور شفاف مہین لباس سے زیادہ پسند ہے۔

۳۔ اور اپنے (اُس) گھر کے ٹوٹے ہوئے حصے میں روٹی کا ٹکڑا کھالینا مجھے (عمدہ اور مکمل) روٹی کھالینے سے زیادہ پسند ہے۔

۴۔ اور (وہاں کی) ہر پگ ڈنڈی پر ہواوں کی آوازیں مجھے (یہاں کی) ڈھولکیوں کی تھاپ سے زیادہ پسند ہے۔

۵۔ اور وہاں کا کتا جو میرے سوا ہر رات کو آنے والے کو بھونکتا تھا مجھے یہاں کے (مانوس اور) بہت محبت کرنے والے بلّے سے زیادہ پسند ہے۔

۶۔ اور وہاں کا سخت مزاج اونٹ جو ڈاچی (اونٹنی) سوار عورتوں کے پیچھے پیچھے چلتا تھا مجھے بنے سنورے خچر سے زیادہ پسند ہے۔

۷۔ اور میرے چچا کے بیٹوں میں سے دُبلا پتلا سخی جوان مجھے سخت گیر موٹے کافر، جنگلی گدھے سے زیادہ پسند ہے۔

پس جب حضرت معاویہ آئے تو ایک باندی نے آپ کو اُس کی اس بات سے آگاہ کیا، اور ایک روایت یہ ہے کہ جب وہ یہ اشعار پڑھ رہی تھی تو حضرت معاویہ نے انہیں خود سن لیا تھا تو آپ نے فرمایا کہ بحدل کی بیٹی مجھے **"علج عنوف"** وغیرہ قرار دے کر ہی راضی ہوئی، اُسے میری طرف سے تین طلاقیں ہیں۔ (پھر اُسے یہ پیغام بھیجا کہ) اُسے میری طرف سے کہہ دو کہ اس محل میں لایا گیا سارا سامان اُسی کا ہے، پس وہ اُسے لے لے، پھر آپ نے اُسے نجد میں اُس کے میکے (گھر) پہنچوا دیا، جبکہ یزید اُس کے حمل میں تھا"۔

(القول السدید في حکم یزید ص ۸۶، ۸۷، ۸۸)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ شادی کی یہ ٹھاٹھ باٹھ اور دُلہن پر سونے چاندی کے زیورات کی بھرمار ہی نہیں بلکہ محل کے رنگ کے مطابق سونے چاندی کے برتن کیسے جمع ہو گئے تھے، جبکہ حکم بن عمرو غفاری رضی اللہ عنہ نے تو حکم عدولی کی تھی اور بادشاہ سلامت کے لیے زر و سیم کو الگ نہیں کیا تھا؟ جواباً عرض ہے کہ اگر خراسان کے

گورنر دنیاداری کے رنگ ڈھنگ سے کورے، شاہی آداب سے عاری اور رنگ میں بھنگ ڈالنے والے نرے صوفی صافی تھے تو دوسرے علاقوں کے گورنر تو سلیقہ شعار، رمز آشنا اور فرمانبردار تھے۔ اگر سب لوگ ہی حکم بن عمرو رضی اللہ عنہ کی طرح شاہی مزاج سے نا آشنا ہوتے تو شاہی ایوان کی رونق اور کاروبارِ سلطنت کیونکر چلتا؟

ممکن ہے کچھ لوگ اِس حقیقت کو تاریخ کہہ کر رد کرنے کی کوشش کرنا چاہیں تو عرض ہے کہ یہ حقیقت سنن ابی داود وغیرہ کی صحیح حدیث میں بھی مذکور ہے کہ کاشانۂ معاویہ میں سونے، ریشم اور درندوں کی کھالوں کا عام استعمال ہوتا تھا، یہی وجہ ہے کہ سیدنا مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ نے غضب ناک ہو کر معاویہ کو فرمایا تھا کہ تمہارے گھر میں سونے چاندی، ریشم اور درندوں کی کھالوں کا استعمال ہے تو وہ انکار نہیں کر سکے تھے۔ یہ حدیث متعدد حوالہ جات کے ساتھ پہلے گذر چکی ہے۔ اِس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت مقدام رضی اللہ عنہ کی معلومات کے مطابق ایوانِ معاویہ میں سونے چاندی وغیرہ کے استعمال کی ناجائز صورتیں تھیں، اگر معاویہ ایسی ناجائز صورتوں سے اپنے اہل خانہ کو منع کرتے تو اُنہیں حضرت مقدام بن معدی کرب رضی اللہ عنہ سے یہ طعن نہ سننا پڑتا۔ مولانا خلیل احمد سہارنپوری لکھتے ہیں:

> قَالَ الْمِقْدَامُ: فَوَاللّٰهِ لَقَدْ رَأَيْتُ هٰذَا كُلَّهُ فِيْ بَيْتِكَ يَا مُعَاوِيَةُ أَيْ عَلٰى أَهْلِكَ، فِيْهِ أَنَّ مَا فِيْ بَيْتِ الْآدَمِيِّ مِنْ مَكْرُوْهٍ أَوْحَرَامٍ مَنْسُوْبٌ إِلٰى مَالِكِهٖ فِيْ كَوْنِهٖ لَا يُنْكِرُهٗ.
>
> ''حضرت مقدام رضی اللہ عنہ نے فرمایا: خدا کی قسم! اے معاویہ! میں یہ سب کچھ تمہارے گھر میں دیکھتا ہوں، یعنی تمہارے گھر والوں پر، اِس حدیث میں دلیل ہے کہ آدمی کے گھر میں مکروہ یا حرام جو کچھ بھی ہو وہ گھر کے سربراہ کی طرف منسوب ہوگا، کیونکہ وہ اِس سے منع نہیں کرتا''۔(۱)

(بذل المجهود في حل سنن أبي داود ج۱۳ ص۱۶۱)

---

(۱) اِس تشریح سے ضمناً یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ یا تو معاویہ کے حق میں مشہور دعائے نبوی ''اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ هَادِيًا مَّهْدِيًّا وَاهْدِ بِهٖ'' قبول نہیں ہوئی، یا پھر ماننا پڑے گا کہ یہ حدیث موضوع ہے۔

بتایئے! جس شخص نے دوسروں کے حقوق ووسائل سے اپنے محلّات کو مال وزر سے بھر رکھا ہو، اور پھر وہ اُسی مال میں سے کچھ دوسروں پر بھی خرچ کر دے تو وہ فیاض وسخی کیونکر ہوگیا؟ کیا دورِ حاضر میں عرب وعجم کے جن سلاطین ووزراء کے محلات سونے چاندی سے مزین ہیں حتیٰ کہ اُن کے بیت الخلاء وغیرہ مقامات پر بھی زروسیم کا استعمال ہے اور وہ حفظ ماتقدم کے طور پر اپنی پارٹی کے دوسرے لیڈران یا اپوزیشن لیڈرز پر بھی کبھی کبھی خزانے کا دروازہ کھول دیتے ہیں تو کیا اُن کے اس خرچ کو اُن کی عطا اور سخاوت سمجھا جائے؟ اِس قسم کے خرچ کو بدھو عوام تو سخاوتِ سلطانی سمجھتے ہیں مگر اصل حقائق سے آگاہ اور دیدہ ور حضرات اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ سلطان کا اصل حق کتنا ہے اور عوام کا کتنا، یہی وجہ ہے کہ اُس دور کے عوام تو معاویہ بن صخر کی طرف سے تھوڑا بہت مال ملنے پر اُس کی مدح وثنا میں زمین وآسمان کے قلابے ملاتے ہوئے اُس کی شان میں منظوم کلام اور قصیدے لکھ ڈالتے تھے مگر خواص سمجھتے تھے کہ یہ اونٹ کے منہ زیرہ کے برابر مال دے کر عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک مرتبہ موصوف اپنی دادودہش پر اظہارِ تشکر اور تحسین کے خواہاں ہوئے تو سیدنا ابن عباس ؓ نے اُنہیں بھری مجلس میں دوسری کھری کھری باتوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرمادیا تھا:

فَاَمَّا هٰذَا الْمَالُ فَلَيْسَ لَکَ مِنْهُ اِلَّا لِرَجُلٍ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ.

''اے معاویہ! اِس مال میں تمہارا حصہ ایک عام مسلمان سے زیادہ نہیں ہے''۔

(أنساب الأشراف ج۵ ص ۱۲۰، ۱۲۱)

تعجب کی بات یہ ہے کہ زیادہ اپنے لیے رکھ لینے اور تھوڑا بہت مسلمانوں کو دینے پر بھی وہ اپنا احسان سمجھتے تھے۔ چنانچہ علامہ بلاذری لکھتے ہیں:

قَالَ مُعَاوِيَةُ: اَلْأَرْضُ لِلّٰهِ وَأَنَا خَلِيْفَةُ اللهِ فَمَا أَخَذْتُ فَلِيْ، وَمَا تَرَكْتُهُ لِلنَّاسِ فَبِالْفَضْلِ مِنِّيْ، فَقَالَ صَعْصَعَةُ بْنُ صُوْحَانَ: مَاأَنْتَ وَأَقْصَى الْأُمَّةِ فِيْ ذٰلِكَ سَوَاءٌ وَلٰكِنْ مَنْ مَلَكَ اِسْتَأْثَرَ، فَغَضِبَ مُعَاوِيَةُ وَقَالَ: لَهَمَمْتُ، قَالَ صَعْصَعَةُ: مَا كُلُّ مَنْ هَمَّ فَعَلَ، قَالَ: وَمَنْ يَحُوْلُ بَيْنِيْ

وَبَيْنَ ذٰلِکَ ؟ قَالَ : الَّذِيْ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ.

''زمین اللہ کی ہے اور میں اللہ کا خلیفہ ہوں، سو جو میں نے لے لیا تو وہ میرا ہے اور جسے میں نے لوگوں کے لیے چھوڑ دیا تو وہ میرا احسان ہے۔ اس پر سیدنا صعصعہ بن صوحان رضی اللہ عنہ نے کہا: تم اور ایک اجنبی ترین امتی اِس معاملہ میں برابر ہیں، لیکن جو بادشاہ بنتا ہے تو وہ اپنے لیے مخصوص کر لیتا ہے۔ اِس پر معاویہ نے غضبناک ہو کر کہا: میں چاہتا ہوں، اِس پر صعصعہ بولے: ہر شخص جو چاہتا ہے کر نہیں گذرتا۔ معاویہ نے کہا: میرے اور اِس چاہت کے درمیان کیا رکاوٹ ہے؟ اُنہوں نے کہا: وہی ذات رکاوٹ ہے جو انسان اور اُس کے قلب کے مابین رکاوٹ ہے''۔

(أنساب الأشراف للبلاذري ج ٥ ص ٢٧، ٢٨)

اِسی خام خیالی کی وجہ سے وہ خود کو سیاہ و سفید کا مالک گردانتے تھے اور پھر جس کسی کو اُس کے حق میں سے کچھ دیتے تھے تو اپنا احسان سمجھتے تھے اور ''أَنَا ابْنُ الْهِنْد'' کا نعرہ لگاتے تھے۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّآ إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ. حیرت کی بات ہے کہ کچھ سفہاء قسم کے لوگ اب تک اُسی باطل خیال میں مبتلا ہیں اور معاویہ بن ابی سفیان کو حسنین کریمین علیہما السلام کا فیاض، سخی اور داتا گردانتے ہیں۔ پٹھی (اُلٹی) کھوپڑی سے خدا ہی محفوظ رکھے۔

امام حسن علیہ السلام پر الزام کیوں آئے گا؟

بعض متأخرین ہند نے معاویہ کی اہلیت و صلاحیت کو ثابت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اگر امیر معاویہ رضی اللہ تعالی عنہ العیاذ باللہ کافر یا فاسق تھے یا ظالم جائر تھے یا غاصب جابر تھے تو الزام امام حسن پر آتا ہے کہ اُنہوں نے کاروبارِ مسلمین و انتظامِ شرع دین باختیارِ خود ایسے شخص کو تفویض فرما دیا اور خیر خواہیٔ اسلام کو معاذ اللہ کام نہ فرمایا''۔

(فتاوی رضویه ج ٢٩ ص ٣٧٨)

خدا جانے کہ بعض متأخرین ہند معاویہ کے احوال سے اِس حد تک کیوں ناواقف تھے؟ اگر اُن کی

توجہ کتب حدیث، کتب سیر و تاریخ اور شروحِ حدیث کی طرف نہیں ہو سکی تو فقہ تو اُن کا خاص موضوع تھا اور کتب فقہ میں معاویہ کو، ظالم، جائر اور غیر عادل وغیرہ صاف صاف کہا گیا ہے۔ کفر کے علاوہ معاویہ کی طرف اُن تمام الفاظ کی نسبت کی گئی ہے جو بعض متأخرین ہند نے ذکر کیے ہیں۔ امام حسن علیہ السلام بھی موصوف کی ان تمام خرابیوں سے آگاہ تھے مگر وہ مجبور تھے، اُنہوں نے باختیارِ خود ایسے شخص کو ملک تفویض نہیں فرمایا کہ اُن پر الزام آئے۔ آیئے! ہم آپ کے سامنے موصوف کے بارے میں باری باری مذکورہ بالا تمام الفاظ پیش کر دیتے ہیں۔

امام البغاۃ اور فسق

مذکورہ جملہ میں بعض علماء ہند نے اِن چھ الفاظ کی طرف متوجہ کیا ہے: کافر، فاسق، ظالم، جائر، غاصب اور جابر۔ موصوف جس شخص سے اِن تمام الفاظ کی نفی کر رہے ہیں ان میں سے پہلے لفظ کے علاوہ باقی تمام الفاظ صحابہ کرام اور ائمہ عظام علیہم السلام سے اُس شخص کے بارے میں منقول ہیں۔ ائمہ کرام نے تصریح فرمائی ہے کہ ابنِ ہند سے جو بغاوت ہوئی اُس کی وجہ سے فقط اُن کی تکفیر جائز نہیں لیکن باقی تمام الفاظ کی نسبت اُن کی طرف کرنا جائز ہے۔ مثلاً مذکورہ بالا اقتباس میں لفظ کافر کے بعد لفظِ فاسق ہے اور ائمہ سے معاویہ بن ابی سفیان اور اُس کے پیروکاروں کے بارے میں یہ لفظ ثابت ہے، مثلاً سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

لَا تَقُوْلُوْا كَفَرَ أَهْلُ الشَّامِ وَلٰكِنْ قُوْلُوْا فَسَقُوْا أَوْ ظَلَمُوْا.

"یہ نہ کہو کہ اہل شام نے کفر کیا، لیکن کہو کہ اُنہوں نے فسق یا ظلم کیا"۔

(المصنّف لابن أبي شيبة ج۲۱ ص۴۰۷ حديث ۳۸۹۹۷، ۳۸۹۹۸؛ السنن الكبرى للبيهقي ج۸ ص۱۷۴، وط: ج۸ ص۳۰۲ حديث ۱۶۷۲۱؛ تعظيم قدر الصلاة للمروزي ج۲ ص ۵۴۶ حديث ۶۰۰؛ تاريخ دمشق ج۱ ص۳۴۶، ۳۴۷؛ مختصر تاريخ دمشق ج۱ ص۱۳۱؛ منهاج السنة لابن تيمية ج۵ ص۶۴۲)

بعض علماء عقائد نے لکھا ہے کہ نواصب کے علاوہ اکثر اہل سنت کا مذہب یہی ہے۔ چنانچہ سید شریف علی بن محمد جرجانی لکھتے ہیں:

وَالَّذِيْ عَلَيْهِ الْجَمْهُوْرُ مِنَ الْأُمَّةِ وَهُوَ أَنَّ الْمُخْطِيءَ قَتَلَةُ عُثْمَانَ وَ مُحَارِبُوْ عَلِيٍّ لِأَنَّهُمَا إِمَامَانِ فَيَحْرُمُ الْقَتْلُ وَالْمُخَالَفَةُ قَطْعًا إِلَّا أَنَّ بَعْضَهُمْ كَالْقَاضِيْ أَبِيْ بَكْرٍ ذَهَبَ إِلٰى أَنَّ هٰذِهِ التَّخْطِئَةَ لَا تَبْلُغُ إِلٰى حَدِّ التَّفْسِيْقِ وَمِنْهُمْ مَنْ ذَهَبَ إِلَى التَّفْسِيْقِ كَالشِّيْعَةِ وَكَثِيْرٍ مِنْ أَصْحَابِنَا.

''جمہور کا مذہب یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلین اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے لڑنے والے خطا کار تھے، کیونکہ وہ دونوں امام برحق تھے، پس ان کا قتل اور ان کی مخالفت قطعاً حرام ہے، مگر بعض اہل سنت جیسا کہ قاضی ابوبکر مالکی اس طرف گئے ہیں کہ یہ خطا حد فسق کو نہیں پہنچتی اور بعض کا مذہب ہے کہ یہ خطا حد فسق کو پہنچتی ہے جیسا کہ تمام شیعہ اور ہمارے کثیر اہل سنت''۔

(شرح المواقف ج۸ ص۴۰۶، ۴۰۷)

اس عبارت میں جس قاضی کا ذکر ہے، وہ قاضی ابن العربی مالکی متوفی ۵۴۳ھ ہے، جس نے اپنی کتاب ''**العواصم من القواصم**'' وغیرہ میں سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کو خود امام عالی مقام علیہ السلام کی غلطی قرار دیا ہے، سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے حق میں واردشدہ احادیث صحیحہ کی تکذیب کی ہے اور معاویہ کی شان میں جھوٹی روایات اور جعلی اقوال کو تقویت دینے کی فریب کاری کی ہے۔ یہ اور ایسی دوسری باتوں کی وجہ سے امام ابن دحیہ اور امام قرطبی مالکی نے اُسے غبی کہا ہے اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، مولانا عبدالرشید نعمانی دیوبندی اور دوسرے حضرات نے اُسے نواصب میں شمار کیا ہے۔

(فتاوی عزیزي ج۱ ص۱۰۷؛ حادثۂ کربلا کا پس منظر ص۵۸)

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے بھی ''فتاوی عزیزی کامل ص۴۱۳'' میں معاویہ بن ابی سفیان کو فاسق لکھا ہے، شاہ صاحب کی مکمل عبارت پیچھے گزر چکی ہے۔ علاوہ ازیں شاہ صاحب نے اپنی اُس معروف تصنیف جو خصوصاً تردید روافض میں لکھی گئی ہے، میں اس سے بھی سخت لکھا ہے، وہاں اُنہوں نے فسق اعتقادی تک کا شائبہ بھی ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''اور علوّ درجہ ایمان حضرت امیر ﷺ کا اور بہشتی ہونا اُن کا اور لائق خلافتِ پیغمبر کے ہونا ازروئے احادیث بلکہ آیاتِ قطعیہ متواترہ سے ثابت ہے، پس منکر اِن امور کا کافر ہوگا، اور لڑنا اُن سے از راہِ شامتِ نفس یا محبت مرتبہ اور جاہ کے، یا از راہ تاویل باطل اور شبہ فاسد کے، فسقِ عملی یا فسقِ اعتقادی ہے، یعنی بدعملی اور بداعتقادی ہے نہ کہ کفر''۔

(تحفه اثناعشریه ص ٨١٤،٨١٥)

نیز حدیث پاک میں ہے کہ مسلمان کو سبّ وشتم کرنا فسق ہے اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ معاویہ اور اُن کے متبعین سیدنا علی ﷺ کو سبّ وشتم اور لعنت کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے شرائط صلح میں باقاعدہ یہ شرط لکھوائی تھی کہ آئندہ تم ہمارے بابا کو سبّ وشتم نہیں کرو گے، لیکن وہ پھر بھی باز نہ آئے، وہ اپنے دورِ ملوکیت میں برابر اس قبیح طریقے پر قائم رہے اور بعد میں اُن کے متبعین بھی اس پر کاربند رہے حتیٰ کہ سیدنا عمر بن عبدالعزیز ﷺ نے آکر اِس بُرے تسلسل کو ختم کیا، جیسا کہ ہم گذشتہ صفحات میں باحوالہ لکھ چکے ہیں۔

امام البغاۃ اور ظلم

فتاویٰ رضویہ کے اقتباس میں لفظ فاسق کے بعد لفظِ ظالم ہے۔ یہ لفظ بھی ہمارے ائمہ کرام نے معاویہ بن ابی سفیان کے بارے میں استعمال کیا ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ ﷺ کے لائق ترین شاگرد امام محمد بن حسن شیبانی ﷺ نے معاویہ کو باغی اور متعدی کے ساتھ ساتھ ظالم بھی کہا ہے۔ چنانچہ امام عبدالقادر قرشی حنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

سَمِعْتُ عَمِّي (عَلِيَّ بْنَ مُوسٰى الْقُمِّيَّ) سَمِعْنَا أَبَا سُلَيْمَانَ الْجَوْزَجَانِيَّ ، سَمِعْتُ مُحَمَّدَ بْنَ الْحَسَنِ يَقُوْلُ: لَوْ لَمْ يُقَاتِلْ مُعَاوِيَةُ عَلِيًّا ظَالِمًا مُتَعَدِّياً بَاغِيًا كُنَّا لَا نَهْتَدِيْ لِقِتَالِ أَهْلِ الْبَغْيِ.

''میں نے اپنے چچا علی بن موسیٰ قمی سے سنا، اُنہوں نے فرمایا: ہم نے ابوسلیمان جوزجانی سے سنا، اُنہوں نے کہا: ہم نے امام محمد بن حسن شیبانی کو یہ فرماتے ہوئے سنا

کہ اگر معاویہ ظلم کرتے ہوئے، حد سے بڑھتے ہوئے اور بغاوت کرتے ہوئے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ جنگ نہ کرتا تو ہم اہل بغاوت کے ساتھ جنگ کی ہدایت نہ پاتے"۔

(الجواهر المضية للقرشي الحنفي ج٣ص٧٠، ٧١؛ حضرت علی اور قصاصِ عثمان رضی اللہ عنہ للعبد الرشيد النعماني الحنفي ص ٧٠)

امام قرطبی اور دوسرے متعدد علماء کرام نے مذاہب اربعہ کے محدثین اور متکلمین کی آراء جمع فرمائی ہیں اور جنگ صفین میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے خلاف برسر پیکار آنے والوں کو اجماعاً باغی اور ظالم لکھا ہے، اُن کی طویل عبارت کے آخری الفاظ یہ ہیں:

وَقَالُوْا أَيْضًا: بِأَنَّ الَّذِيْنَ قَاتَلُوْهُ بُغَاةٌ ظَالِمُوْنَ لَهُ، وَلٰكِنْ لَايَجُوْزُ تَكْفِيْرُهُمْ بِبَغْيِهِمْ.

"نیز اُنہوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جنہوں نے اُن کے ساتھ جنگ کی وہ باغی ظالم تھے، لیکن اُن کی بغاوت کی وجہ سے اُن کی تکفیر جائز نہیں"۔

(التذكرة للقرطبي ج٢ص٦٢٦، وط: ج٣ص١٠٨٨، ١٠٨٩؛ الفَرقُ بين الفِرَق للإسفرائيني ص٢٧٢؛ فيض القدير ج١٢ص٣٦٣٦، وط: علمية ج٦ص٤٧٤ حديث ٩٦٤٠؛ شرح الزرقاني على المواهب ج١٠ص١٥٣، ١٥٤)

اِس عبارت سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ فقط اُن کی تکفیر جائز نہیں باقی بغاوت میں سب کچھ آجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کامل ترین احتیاط کے باوجود امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ جنگ جمل میں مولا علی رضی اللہ عنہ کو دوسرے حضرات کے مقابلہ میں عدل پر سمجھتے تھے جبکہ صفین میں مولا علی علیہ السلام کے مدمقابل آنے والوں کو باغی فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ اُن سے جنگ جمل کے متعلق دریافت کیا گیا تو اُنہوں نے انتہائی جامعیت کے ساتھ جمل اور صفین دونوں جنگوں کے بارے میں اپنا موقف واضح فرمادیا۔ چنانچہ امام موفّق مکی اور امام کردری رحمۃ اللہ علیہما لکھتے ہیں:

سُئِلَ الْإِمَامُ عَنْ قِتَالِ يَوْمِ الْجَمَلِ، فَقَالَ: سَارَ عَلِيٌّ رضی اللہ عنہ فِيْهِ بِالْعَدْلِ، وَهُوَ

الَّذِيْ عَلَّمَ الْمُسْلِمِيْنَ السُّنَّةَ فِيْ قِتَالِ أَهْلِ الْبَغْيِ.

''امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ سے جنگِ جمل کے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: سیدنا علی رضی اللہ عنہ اُس میں عدل کے ساتھ چلے، اور وہی ہیں جنہوں نے مسلمانوں کو باغیوں کے خلاف جنگ کی سنت سکھائی ہے''۔

(مناقب أبي حنيفة للموفق المكي ج۲ ص۸۴ ؛ مناقب أبي حنيفة للكردري ج۲ ص۷۲)

اِس عبارت میں مولا علی علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا کہ وہ عدل کے ساتھ چلے، اور ظاہر ہے کہ عدل کی ضد ظلم ہے۔ یہی حقیقت امام ابو یوسف رضی اللہ عنہ نے بھی امام اعظم رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ چنانچہ قاضی ابوالعلاء صاعد بن محمد حنفی رحمۃ اللہ علیہ متوفّٰی ھ لکھتے ہیں:

وَرُوِيَ عَنْ أَبِيْ يُوْسُفَ رَحِمَهُ اللّٰهُ أَنَّهُ قَالَ: سَمِعْتُ أَبَا حَنِيْفَةَ رضی اللہ عنہ يَقُوْلُ: عَلِيُّ بْنُ أَبِيْ طَالِبٍ كَرَّمَ اللّٰهُ وَجْهَه حُجَّتُنَا عِنْدَ اللّٰهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَلَوْلَا عَلِيٌّ مَا عَلِمْنَا كَيْفَ قِتَالُ أَهْلِ الْبَغْيِ، أَوْ كَيْفَ نُقَاتِلُ أَهْلَ الْقِبْلَةِ.

''امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کی گئی ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کو فرماتے ہوئے سنا: سیدنا علی کرم اللہ وجہہ قیامت کے دن اللہ جل جلالہ کی بارگاہ میں ہماری دلیل ہیں، اور اگر سیدنا علی رضی اللہ عنہ نہ ہوتے تو ہم باغیوں کے خلاف جنگ کرنا کیسے جانتے یا اہل قبلہ کے ساتھ کیسے لڑتے؟''۔

(كتاب الاعتقاد للصاعد الحنفي ص۱۹۲)

بعض علماء ہند کے بقیہ الفاظ پر ہم تبصرہ کرنا ضروری نہیں سمجھتے، کیونکہ نتیجہ کے لحاظ سے لفظ فاسق و ظالم کے ضمن میں اُن تمام الفاظ کا مفہوم بھی آ جاتا ہے، سو جب کسی کا ظالم ہونا ثابت ہو گیا تو پھر اُس کے جائر و غاصب ہونے کو ثابت کرنے کی چنداں ضرورت نہیں رہتی، تاہم لفظ ''جـائـر'' صاحبِ ھدایہ کے علاوہ بہت سے فقہاء احناف نے استعمال کیا ہے، جیسا کہ ہم اپنی کتاب ''شرح خصائص علي رضی اللہ عنہ'' میں نقل کر چکے ہیں۔

اب آپ خود ہی انصاف فرمائیں کہ اتباع میں مقدم کون، فاضل بریلوی یا سیدنا عمار بن یاسر، امام اعظم ابو حنیفہ، امام محمد بن حسن شیبانی، امام ابو یوسف اور جمہور فقہاء و متکلمین رحمہم اللہ؟

معیارِ اہلیت میں صحابہ اور بعض علماءِ ہند میں اختلاف

بعض علماء ہند ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

''امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اگر خلافت کے اہل نہ ہوتے (تو) امام مجتبیٰ ہرگز اُنہیں تفویض نہ فرماتے''۔

(فتاوی رضویہ ج۲۹ ص۳۳۷)

بعض علماء ہند کا یہ قول عقلاً اور نقلاً دونوں لحاظ سے درست نہیں۔ عقلاً تو اس لیے درست نہیں ہے کہ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے دفعِ شر کے لیے خلافت سے دست برداری فرمائی تھی، جیسا کہ بعض علماء ہند نے خود مذکورالصدر عبارت سے دوسطریں قبل یوں لکھا ہے:

''اور اس سے صلح و بندشِ جنگ مقصود تھی''۔

(فتاوی رضویہ ج۲۹ ص۳۳۷)

خود امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے بھی واضح طور پر اپنی صلح کی وجہ یہی بیان فرمائی ہے، جیسا کہ اُن کے الفاظ: ''**لِحَقْنِ دِمَاءِ الْمُسْلِمِيْنَ**'' (تحفظِ خونِ مسلمین کی خاطر) سے ظاہر ہے، تو پھر اہلیت کا کیا سوال؟ تھوڑا سا غور و تدبر بھی کیا جائے تو عام عقل مند انسان بھی سمجھ سکتا ہے کہ وہ حالات اہلیت اور عدم اہلیت کو جانچنے کے نہیں تھے، اس لیے کہ اہلیت و عدم اہلیت کا تعلق انتخاب سے ہوتا ہے صلح سے نہیں، اور انتخاب کے لیے کم از کم ایک سے زائد افراد کا ہونا ضروری ہوتا ہے، کیونکہ فردِ واحد کا انتخاب تو نہیں ہوتا، لیکن صلح کے معاملہ میں اہل و نااہل کو نہیں دیکھا جاتا بلکہ صلح بہرحال اُسی شخص سے ہی کرنا ہوتی ہے جس سے تنازع ہو گیا ہو اور حالات کشیدہ ہو چکے ہوں۔ اب بھی اگر بات سمجھ نہ آئی ہو تو ہم امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے ایسے واضح الفاظ پیش کر دیتے ہیں جن کو پڑھنے کے بعد معمولی سی عقل والا آدمی بھی تذبذب کا شکار نہیں رہے گا۔ امام ابوالعباس المبرد صلح کے احوال قلم بند کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

ثُمَّ خَرَجَ الْحَسَنُ يُرِيْدُ الْمَدِيْنَةَ فَوَجَّهَ إِلَيْهِ مُعَاوِيَةُ وَقَدْ تَجَاوَزَ فِي طَرِيْقِهِ يَسْأَلُهُ أَنْ يَكُوْنَ الْمُتَوَلِّي لِمُحَارِبَتِهِمْ ، فَقَالَ الْحَسَنُ: وَاللّٰهِ لَقَدْ كَفَفْتُ عَنْكَ لِحَقْنِ دِمَاءِ الْمُسْلِمِيْنَ ، وَمَا أَحْسِبُ ذٰلِكَ يَسَعُنِي ، أَفَأُقَاتِلُ عَنْكَ قَوْماً ، أَنْتَ وَاللّٰهِ أَوْلىٰ بِالْقِتَالِ مِنْهُمْ.

''پھر امام حسن عازم مدینہ ہوئے تو معاویہ اُن کے پیچھے گئے اور امام پاک کافی راستہ طے کر چکے تھے، انہوں نے امام پاک سے درخواست کی کہ وہ خوارج کے خلاف جنگ کے سپہ سالار بنیں تو امام حسن علیہ السلام نے فرمایا: خدا کی قسم! میں نے تو تجھ سے بھی فقط مسلمانوں کے خون کی وجہ سے ہاتھ روکا ہے، میں اس کام کو مناسب نہیں سمجھتا، کیا میں تیری خاطر ایک قوم سے قتال کروں؟ اللہ کی قسم! اُن کی بہ نسبت تجھ سے جنگ کرنا زیادہ بہتر ہے''۔

(الكامل فی اللغة والأدب ص ۵۷۷، وط: ج۳ ص ۷۰؛ العقدالفريد ج۱ ص ۱۸۱)

اسی بات کو امام ابن اثیر جزری نے ۴۱ھ کے احوال میں ''ذكر خروج الخوارج على معاوية'' کے عنوان کے تحت بیان کیا ہے کہ جب فروہ بن نوفل خارجی نے معاویہ کے خلاف لشکر کشی کی تو معاویہ نے امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کو درخواست کی کہ وہ خوارج کے خلاف جنگ کے لیے نکلیں۔ وہ لکھتے ہیں:

فَكَتَبَ إِلَيْهِ مُعَاوِيَةُ يَدْعُوْهُ إِلىٰ قِتَالِ فَرْوَةَ ، فَلَحِقَهُ رَسُوْلُهُ بِالْقَادِسِيَةِ أَوْقَرِيْبًا مِنْهَا ، فَلَمْ يَرْجِعْ وَكَتَبَ إِلىٰ مُعَاوِيَةَ: لَوْآثَرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ أَحَدًا مِنْ أَهْلِ الْقِبْلَةِ لَبَدَأْتُ بِقِتَالِكَ ، فَإِنِّي تَرَكْتُكَ لِصَلَاحِ الْأُمَّةِ وَحَقْنِ دِمَائِهَا.

''پس معاویہ نے امام پاک کی طرف لکھا، اُنہیں فروہ کی طرف جنگ کے لیے بلایا تو اُس کے قاصد نے امام پاک کو قادسیہ یا اُس کے قریب جا کر پالیا تو امام پاک واپس تشریف نہ لائے اور معاویہ کی طرف لکھ بھیجا: اگر میں ترجیح دیتا کہ اہل قبلہ میں

سے کسی کے خلاف جنگ کروں تو میں جنگ کا آغاز تجھ سے کرتا، میں نے تجھے اُمت کی بھلائی اور اُس کے خون کی حفاظت کے لیے چھوڑ دیا ہے''۔

(الکامل فی التاریخ لابن أثیر الجزري ج۳ ص ۹)

اب بھی اگر کسی شخص کو حالات کی سنگینی اور امام پاک کی مجبوری سمجھ نہ آئی ہو تو پھر خدا ہی حافظ ہے، مذہبی متعصب میں مبتلا شخص کو یہ حقیقت سمجھ آئے یا نہ آئے لیکن محلّہ کا عام آدمی بھی سمجھتا ہے کہ صلح اور سمجھوتہ دفعِ مصیبت کے لیے ہوتا ہے جبکہ اہلیت کا تعلق انتخاب اور حصولِ مفاد سے ہوتا ہے۔ دفعِ مصیبت کے لیے مجبوراً کوئی فیصلہ کرنے میں اور مدمقابل کی اہلیت کو مدنظر رکھتے ہوئے کوئی فیصلہ کرنے میں فرق کو سمجھنے کے لیے یہاں اُس صحیح حدیث میں غور و فکر کرنا بہت مفید ثابت ہوگا جو پہلے بھی استنباطی تناظر میں کئی بار آ چکی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''دو عورتیں تھیں، اُن میں سے ہر ایک کے ساتھ اپنا اپنا بچہ تھا۔ بھیڑیا آیا اور اُن میں سے ایک کے بچے کو کھا گیا۔ ایک نے دوسری سے کہا: بھیڑیے نے تمہارے بچے کو کھایا ہے، دوسری نے کہا: نہیں، بلکہ تمہارے بچے کو کھایا ہے، دونوں حضرت داود علیہ السلام کے پاس فیصلہ کے لیے گئیں تو اُنہوں نے بڑی کے حق میں فیصلہ دیا۔ پھر وہ دونوں سیدنا سلیمان بن داود علیہما السلام کے پاس گئیں اور اُنہیں ماجرا عرض کیا تو اُنہوں نے فرمایا: چھری لاؤ، میں اس بچے کے دو ٹکڑے کر دیتا ہوں۔ اس پر چھوٹی کہنے لگی: اللہ تعالیٰ آپ پر رحمت فرمائے، آپ ایسا نہ کریں: **''ھُوَ ابْنُھَا، فَقَضیٰ بِهٖ لِلصُّغْریٰ''** (یہ اسی کا بیٹا ہے، تو اُنہوں نے چھوٹی کے حق میں فیصلہ دے دیا)''۔

(بخاري: کتاب أحادیث الأنبیاء، باب قول اللہ تعالیٰ: وَوَهَبْنَا لِدَاوُدَ سَلَيْمَانَ إلخ، حدیث ۳۴۲۷، و کتاب الفرائض، باب إذا ادعت المرأة ابنًا، ص ۹۳۲ حدیث ۶۷۶۹؛ مسلم: کتاب الأقضیة، باب بیان اختلاف المجتهدین، حدیث ۱۷۲۰؛ سنن النسائي: کتاب آداب القضاة، باب حکم الحاکم بعلمه ص ۸۱۲، ۸۱۳ حدیث ۵۴۰۳، ۵۴۰۴)

خود سوچئے! چھوٹی عورت اپنے حقیقی بیٹے کے حق سے دست بردار ہونے پر اور اپنا حق بڑی عورت کو دینے پر کیوں آمادہ ہوگئی تھی؟ آیا وہ بڑی عورت کی اہلیت کے پیش نظر اپنے لختِ جگر سے ہاتھ کھڑے کرنے پر تیار ہوئی تھی یا وہ اپنے بچے کے وجود کی سلامتی کے لیے یہ کڑوا گھونٹ پینے کو تیار ہوئی تھی؟ **فَافْهَمْ وَلَا تَكُنْ مِنَ الْغَافِلِيْنَ!**

نوٹ:

اِس سے قبل ہم ابتدائی صفحات میں **"طلقاء منصب کے اہل نہیں تھے"** عنوان کے تحت سیدنا عمر، سیدنا علی المرتضیٰ، اُم المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ، سیدنا عمار بن یاسر، سیدنا ابن عباس، سیدنا عبدالرحمان بن غنم اشعری رضی اللہ عنہم اور دوسرے حضرات کے اقوال نقل کر چکے ہیں کہ طلقاء کسی بھی منصب کے اہل نہیں تھے، خصوصاً سیدنا عمر رضی اللہ عنہ تو اپنی حیات مبارکہ کے آخری ایام میں یزید بن ابی سفیان اور معاویہ بن ابی سفیان کو منصب پر برقرار رکھنے پر نادم ہو گئے تھے، لہٰذا بتایا جائے کہ اہل اسلام اِن اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال کی اتباع کریں یا پاک و ہند کے بعض علماء کی؟

معاذ اللہ، کیا اسلاف کرام فاجر تھے؟

یوں محسوس ہوتا ہے کہ ابن صخر کے بارے میں بعض علماء ہند کی معلومات محدود تھیں اور وہ اِس مسئلہ میں متقدمین فقہاء اور متکلمین کرام کے اقوال سے خاطر خواہ آگاہ نہیں تھے، یہی وجہ ہے کہ اُن کے قلم سے ایسے سخت ترین اقوال صادر ہوئے جن کی زد سے اسلاف کرام بھی محفوظ نہیں رہ سکے۔ مثلاً وہ ایک مقام پر لکھتے ہیں:

"فرقِ مراتب بے شمار اور حق بدستِ حیدرِ کرار، مگر معاویہ بھی ہمارے سردار، طعن اُن پر بھی کارِ فجار"۔

(فتاوی رضویہ ج ۱۰ ص ۲۰۱)

طعن سے اعلیٰ حضرت کی کیا مراد ہے؟ یقیناً جن صفاتِ ذمیمہ سے موصوف ابن صخر کو پاک سمجھتے تھے،

اُن صفات سے اُنہیں متصف سمجھنا ہی اُن کے نزدیک طعن ہوگا اور چند سطور قبل لکھا جاچکا ہے کہ وہ معاویہ بن ابی سفیان کو فسق، ظلم اور جور وغیرہ سے مبراء سمجھتے تھے۔ یقیناً اس کا نتیجہ یہی نکلے گا کہ جن اسلاف کرام ﷺ نے معاویہ کی طرف فسق، ظلم اور جور وغیرہ کی نسبت کی ہے تو وہ فاجر قرار پائیں گے، لامحالہ اِس فتویٰ کی زد سے سیدنا عمار بن یاسر، امام اعظم ابوحنیفہ، امام محمد بن حسن شیبانی اور امام ابو یوسف بھی محفوظ نہیں رہ سکتے، بلکہ امام قرطبی وغیرہ کی عبارات کے مطابق مذاہب اربعہ کے جمہور فقہاء و متکلمین سب اِس کی فتوی کی زد میں آتے ہیں۔ العیاذ باللہ!

اِس فتوی کی زد میں آنے والے بطور نمونہ چند نمایاں شخصیات کے اسماء اور اُنہوں نے جس لفظ سے معاویہ پر نکیر یا طعن کیا ہے وہ بھی ملاحظہ فرمائیے:

- سیدنا عمار بن یاسر ﷺ نے معاویہ کو فاسق، ظالم اور ضلالت پر کہا تھا۔
- سیدنا قیس بن سعد رضی اللہ عنہما نے معاویہ کو امامِ ضلالت کہا۔
- سیدنا خزیمہ بن ثابت ﷺ نے اُس پورے گروہ کو گمراہ کہا۔
- سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے حکومتِ معاویہ کو فتنہ کہا۔
- سیدنا امام حسین علیہ السلام نے معاویہ کے اقتدار کو سب سے بڑا فتنہ کہا۔
- ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اقتدارِ معاویہ کو اقتدارِ فرعون پر قیاس کیا۔
- ام المومنین سیدہ ام سلمہ اور سیدنا جابر بن عبداللہ ﷺ نے بیعتِ معاویہ کو بیعتِ ضلالت کہا۔
- امام اعظم ابوحنیفہ ﷺ نے اُنہیں باغی اور غیر عادل کہا۔
- امام محمد بن حسن شیبانی ﷺ نے اُنہیں ظالم، متعدی اور باغی کہا۔

الغرض متعدد صحابہ و تابعین، اکثر فقہاء احناف اور مذاہب اربعہ کے علماء کرام نے مذکورہ بالا الفاظ میں سے کوئی نہ کوئی ایسا لفظ اُن کے بارے میں استعمال کیا ہے جس کے استعمال کو بعض علماء ہند اُن پر طعن سمجھتے ہیں۔ پوچھنا یہ ہے کہ اگر صحابہ کرام اور علماء اسلام کے ایسے تمام الفاظ طعن کے زمرہ میں آتے ہیں تو پھر کیا بعض علماء ہند کی اتباع میں ان تمام صحابہ اور علماء اسلام کو فجار سمجھا جائے؟

"وَمَنْ يَّكُنْ يَطْعَنُ فِيْ مُعَاوِيَةَ" کا جائزہ

اعلیٰ حضرت کے قلم سے بے دھیانی میں ایک اور بھی ایسا سنگین قول نقل ہو گیا جس کی زد سے نواصب کے علاوہ کوئی بھی نہیں بچ سکتا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> "علامہ شہاب الدین خفاجی نسیم الریاض شرح شفائے قاضی عیاض میں فرماتے ہیں: جو حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر طعن کرے وہ جہنم کے کتوں میں سے ایک کتا ہے"۔

(فتاوی رضویه ج۲۹ ص ۳۶۳)

ظاہر ہے کہ معاویہ بن ابی سفیان کی طرف ضلالت، بدعت، بغاوت، ظلم، فسق، جور، خطا اور فساد وغیرہ کی نسبت کرنا اُن پر طعن کے زمرہ میں آئے گا، اور اِس کا نتیجہ انتہائی خطرناک ہے، کیونکہ امام اعظم ابو حنیفہ نے معاویہ بن ابی سفیان کو باغی، امام ابو یوسف نے باغی، امام محمد بن حسن شیبانی نے باغی متعدی اور ظالم کہا ہے، اور امام برہان الدین مرغینانی حنفی، قاضی خاں اوزجندی حنفی، امام ابوالمعین نسفی حنفی، امام برھان الدین ابو المعالی حنفی، امام ابن الہمام حنفی، زین الدین ابن نجیم مصری حنفی، سراج الدین ابن نجیم حنفی، امام اکمل الدین بابرتی حنفی، امام عینی حنفی، امام فخر الدین زیلعی حنفی، امام شہاب الدین شلبی حنفی، امام ابن الشحنہ حنفی، ملا جیون حنفی اور علامہ عبد الحی لکھنوی حنفی وغیر ہم نے جائر اور غیر عادل لکھا ہے، جبکہ ملا علی قاری نے ظاہراً قصاص عثمان رضی اللہ عنہ کا بہانہ کرنے والا اور باطناً باغی، طاغی اور کتاب و سنت کا تارک کہا ہے۔ شاہ عبد العزیز محدث دہلوی نے مرتکب کبیرہ اور فاسق عملی اور اعتقادی کہا ہے۔ یہ فقط احناف ہیں باقی مذاہب کے فقہاء ان کے علاوہ ہیں۔ باحوالہ اِن سب کے اقوال کے لیے مجھ عاجز کی کتاب "الفئة الباغية" کا انتظار فرمائیں، تاہم اِن میں سے اکثر علماء اسلام کی عبارات مذاہب اربعہ کے حوالہ سے "شرح خصائص علی رضی اللہ عنہ" میں بھی آ گئی ہیں۔ فقہاء و متکلمین کے ایسے تمام اقوال کو مدنظر رکھتے ہوئے بتایا جائے کہ اہل سنت کس کی اتباع کریں؟ اگر بعض علماء ہند کے فتوی کی اتباع کریں تو معاذ اللہ مذکورہ بالا تمام علماء اسلام کو جہنم کے کتے ماننا پڑے گا، اور اگر بعض علماء ہند کے قول سے روگردانی کریں تو پھر سنیت سے خارج۔

امید ہے کہ اہل سنت کے اربابِ عقد وحل اِس مسئلہ کا کوئی حل ضرور نکالیں گے، کیونکہ مذکورہ بالا فقہاء کرام (بشمول امام اعظم اور صاحبین ﷭) کے اقوال کو تو مجبوراً چھوڑا جاسکتا ہے مگر سیدنا علی ﷛ نے جو معاویہ کو باطل پر کہا اور سیدنا عمار بن یاسر ﷛ نے ایک مقام پر ضلالت پر قرار دیا اور دوسرے مقام پر ظالم اور فاسق کہا۔ ذوالشہادتین سیدنا خزیمہ بن ثابت ﷛ نے بھی گمراہ کہا، اِن ہستیوں کے اقوال کا کیا کیا جائے؟ کیا معاذ اللہ انہیں بھی ''فذاک کلب من کلاب الهاوية'' کا مصداق سمجھا جائے؟

نیکی وبدی کی جزاوسزا کا تعیّن، کس کا منصب؟

بعض علماء ہند نے امام خفاجی کے حوالے سے جو یہ بات لکھی ہے:

''جو حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر طعن کرے وہ جہنم کے کتوں میں سے ایک کتا ہے''۔

(فتاوی رضویہ ج۲۹ ص۳۶۳)

یہ کسی مجہول شاعر کے شعر کا ترجمہ ہے جو امام خفاجی رحمۃ اللہ علیہ نے لفظ ''قِيلَ'' سے نقل کیا ہے، اُنہوں نے اس کو نسیم الریاض ''فصل ومن توقيره وبره ﷺ توقير أصحابه وبرهم، ج۳ ص ۴۳۰، وط: ج٤ ص ٥٢٥'' پر نقل کیا ہے۔ اس شعر میں ایک بدعملی اور اُس پر عذاب کا ذکر ہے، اور اصول یہ ہے کہ کسی نیکی کی جزا اور کسی برائی پر سزا کا تعین کوئی غیر نبی انسان نہیں کرسکتا۔ کسی شخص کو کسی نیکی پر کتنا ثواب ملے گا اور کسی بدی پر کتنا عذاب ہوگا؟ اس کا علم عقل سے نہیں سماعت اور نقل سے ہے۔ چنانچہ امام مازری، قاضی عیاض اور حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہم لکھتے ہیں:

مَذْهَبُنَا أَنَّ إِثَابَةَ اللّٰهِ تَعَالیٰ لِمَنْ أَطَاعَهُ وَلَمْ يَعْصِهِ تَفَضُّلٌ ، وَلَا تَثْبُتُ إِلَّا بِالسَّمْعِ ، وَكَذٰلِكَ اِنْتِقَامُهُ مِمَّنْ عَصَاهُ وَلَمْ يُطِعْهُ عَدْلٌ ، وَلَا يَثْبُتُ مِنْهُ شَيْءٌ إِلَّا بِالسَّمْعِ.

''ہمارا مذہب یہ ہے کہ اللہ ﷻ کا اُس شخص کو ثواب دینا جس نے اُس کی اطاعت کی اور نافرمانی نہ کی فضل ہے، اور یہ سماعت (نقلی دلیل) کے بغیر ثابت نہیں ہوتا، اور اسی طرح اُس کا اُس شخص کو سزا دینا جس نے اُس کی نافرمانی کی اور اطاعت

نہ کی عدل ہے، اوراس میں سے کوئی چیز ثابت نہیں ہوتی ماسوا سماعت کے"۔

(المعلم بفوائد مسلم للمازري: كتاب صفة القيامة والجنة والنار، باب لن يدخل أحد الجنة بعمله، ج٣ص ٣٥١؛ إكمال المعلم بفوائد مسلم للقاضي عياض ج٨ص ٣٥٢؛ فتح الباري ج ١٤ص ٥٩٩ حديث ٦٤٦٣؛ فتح المنعم للموسىٰ شاهين لاشين ج ١٠ ص ٤٣١)

بتائیے! جس غاوی شاعر نے ایک مخصوص شخص پر طعن کرنے کی معیّن سزا کا ذکر کیا ہے وہ اُس نے کس سے سنی؟ اس کے پاس کون سی آیت اور حدیث ہے؟ کسی بھی نیکی اور بدی کی جزا و سزا تعیّن کرنا شاعر کا نہیں بلکہ شارع کا منصب ہے اور جو شارع بیان فرماتا ہے وہ شریعت ہوتی ہے اور اُس کا تعلق عقل سے نہیں نص سے ہوتا ہے، اور منصوص کلام فقط دو ہیں: کلامِ الٰہی اور کلام نبوی یعنی کتاب وسنت، البتہ کسی بات پر کامل و مکمل اجماعِ امت ہو جائے تو وہ بھی شریعت کے زمرہ میں آتی ہے، تاہم کسی نیکی اور بدی کے ثواب وعذاب کا تعیّن فقط شریعت سے ہوتا ہے شعر سے نہیں۔ چنانچہ علامہ نووی لکھتے ہیں:

اِعْلَمْ أَنَّ مَذْهَبَ أَهْلِ السُّنَةِ أَنَّهُ لَا يَثْبُتُ بِالْعَقْلِ ثَوَابٌ وَلَا عِقَابٌ وَلَا إِيْجَابٌ وَلَا تَحْرِيْمٌ ، وَلَا غَيْرُهُمَا مِنْ أَنْوَاعِ التَّكْلِيْفِ وَلَا تَثْبُتُ هٰذِهٖ كُلُّهَا وَلَا غَيْرُهَا إِلَّا بِالشَّرْعِ.

"جان لیجئے کہ مذہب اہل سنت یہ ہے کہ عقل سے کوئی ثواب، عذاب، وجوب اور حرمت ثابت نہیں ہوتی اور نہ ہی ان کے علاوہ کسی قسم کا کوئی عمل ثابت ہوتا ہے، یہ سب اُمور اور اِن کے علاوہ کوئی بھی چیز شریعت کے بغیر ثابت نہیں ہوتی"۔

(شرح صحيح مسلم للنووي: كتاب صفات المنافقين وأحكامهم، باب لن يدخل أحد الجنة بعمله، ج١٧ ص ٢٣٢ حديث ٢٨١٦؛ تفسير الخازن: سورة النحل، آيت: ٢٨ ج٣ ص ٧٥؛ شرح صحيح مسلم للسعيدي ج٧ص ٦٥٢، ٦٥٣؛ فتح المنعم للموسىٰ شاهين لاشين ج١٠ ص ٤٣١)

لہٰذا خود ہی سوچیے کہ ایک مجہول شاعر کے قول سے کسی مخصوص شخص پر طعن کرنے کی معین سزا کو قبول

کرتے ہوئے اُسے آگے بیان کرنا کہاں کی دانش مندی اور شریعت فہمی ہے؟ بعض علماء ہند نے لکھا تھا:

''ہمیں معاویہ سے کیا رشتہ، خدانخواستہ اُن کی حمایت بے جا کریں مگر ہاں اپنی سرکار کی طرف داری اور ان کا الزام بدگویاں سے بری رکھنا منظور ہے''۔

مگر افسوس کہ وہ اُن کی بے جا حمایت میں اس قدر آگے نکل گئے کہ اُنہیں شرعی اصول ہی یاد نہ رہا اور اُنہوں نے شارع علیہ السلام کے فرامین کی بجائے ایک مجہول شاعر کے قول کو سند سمجھتے ہوئے یوں نقل کر دیا جس طرح کتاب وسنت کی تصریحات کو نقل کیا جاتا ہے۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّآ إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ.

اِس ضابطہ کی روشنی میں محدث ابن المبارک رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب اُس قول کی قلعی بھی کھل گئی جس کو یوں بیان کیا جاتا ہے:

''حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ جس گھوڑے پر سوار ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معیت میں شریکِ جہاد ہوئے اُس گھوڑے کی ٹاپ سے اُڑ کر جو غبار گھوڑے کی نتھنوں میں داخل ہوا ہے وہ بدرجہا حضرت عمر بن عبد العزیز سے بہتر ہے''۔

(فضائل حضرت امیر معاویہ للقاضي غلام محمود هزاروي ص ٦٢)

امام ابن المبارک رحمۃ اللہ علیہ کو کسی معین شخص کا یہ ثواب اور درجہ کیسے معلوم ہو گیا؟ نام لے کر دو شخصوں میں تقابل کرنا اور اُن میں وثوق کے ساتھ اِس قدر تفاوت بیان کرنا تو نبی کا مقام ہے، کسی اُمتی کو کیا خبر کہ دو معلوم شخصوں کے درجات میں کتنا فرق ہے؟ ہاں اگر وہ نام زد کیے بغیر مطلقاً کسی صحابی اور غیر صحابی کے مابین ایسا فرق بیان کرتے تو قابل فہم ہوتا۔

صحابی غیر عادل اور تابعی عادل تو افضل کون؟

یاد رکھنا چاہیئے کہ اپنے لیے حکومت کرنے اور عدل وانصاف کے قیام کے لیے حکومت کرنے میں زمین وآسمان سے بھی زیادہ فرق ہوتا ہے۔ بعض احادیث مبارکہ میں عادل شخص کے ایک دن کو ستر سال کی عبادت سے بھی بہتر فرمایا گیا ہے، اور حضرت عمر بن عبد العزیز کے عادل ہونے پر امت مسلمہ کا اتفاق ہے اور معاویہ بن ابی سفیان کو صحابہ، تابعین، فقہاء اور علماء کلام نے امام ضلالۃ، غیر عادل، ظالم، جائر، قاتل اور

فاسق کہا ہے، جیسا کہ گذشتہ صفحات میں باحوالہ لکھا جاچکا ہے۔ سو آپ ہی بتائیے کہ عادل اور غیر عادل کا کوئی موازنہ بنتا ہے؟ اور یہ بھی بتائیے کہ کوئی غیر صحابی شخص سراپا عدل وانصاف پر مبنی حکومت کرنے میں کامیاب ہوجائے اور صحابی کہلانے والا شخص کامیاب نہ ہوسکے تو پھر اُس کے لیے صحابیت وبال ہوئی یا کمال؟

معاویہ بن صخر صحابی، کاتب وحی اور خال المومنین کہے جانے کے باوجود عادل حکومت قائم کرنے میں اس حد تک ناکام ہوئے کہ اُن کا شمار خلفاء راشدین اور ائمہ میں نہ ہوسکا اور عمر بن عبدالعزیز صحابی نہ ہونے، کاتب وحی نہ ہونے اور خال المؤمنین نہ ہونے کے باوجود ایسی عادلانہ حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے کہ اُنہیں خلفاء راشدین اور ائمہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ چنانچہ امام ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کرتے ہیں کہ اُنہوں نے فرمایا:

اَلْخُلَفَاءُ: أَبُوْبَكْرٍ وَعُمَرُ وَعُثْمَانُ وَعَلِيٌّ وَعُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيْزِ.

''خلفاء: حضرات ابوبکر، عمر، عثمان، علی اور عمر بن عبدالعزیز ؒ ہیں''۔

کبھی فرماتے:

اَلْأَئِمَّةُ: أَبُوْبَكْرٍ وَعُمَرُ وَعُثْمَانُ وَعَلِيٌّ وَعُمَرُبْنُ عَبْدِالْعَزِيْزِ، وَمَا سِوٰى ذٰلِكَ فَهُمْ مُنْتَزُوْنَ.

''ائمہ: حضرات ابوبکر، عمر، عثمان، علی اور عمر بن عبدالعزیز ؒ ہیں اور جو اُن کے ماسوا ہیں وہ برائی میں جلدی کرنے والے ہیں''۔

(جامع بيان العلم وفضله ج۲ ص۱۱۷۳)

اِس جملہ کے آخر میں ''مُنْتَزُوْنَ'' کا لفظ آیا ہے، علماءِ لغت نے اِس کا معنیٰ یہ کیا ہے:

''انتزى ينتزي کا معنی ہے برائی اور شر کی طرف جلدی کرنا''۔

(النهاية في غريب الحديث والاثر ص۹۱۱؛ مصباح اللغات ص۸۶۹)

اور ظاہر ہے کہ ظلم، جور، فسق، بدعت اور بغاوت وغیرہ شر ہیں خیر نہیں۔ کیا یہ سارے شر سیدنا عمر بن عبدالعزیز ؒ کی حکومتی زندگی میں ثابت کیے جاسکتے ہیں؟ اگر نہیں تو بتائیے اُنہوں نے وہ خیر و بھلائی کہاں

سے سیکھی یا حاصل کی جس کی بدولت وہ خلفاء راشدین میں شمار ہوگئے؟ اور یہ بھی بتائیے کہ معاویہ بن ابی سفیان ایسی خیر و بھلائی سے کیوں محروم رہے کہ اُن کا شمار خلفاء راشدین میں نہ ہوسکا؟ دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ اُن میں وہ شر کہاں سے آ گیا تھا جس کی وجہ سے اُن کے بارے میں وہ الفاظ استعمال کیے گئے جو ابھی ابھی صحابہ وائمہ سے نقل کیے جاچکے ہیں حتیٰ کہ اُن کا شمار خلفاء راشدین کی بجائے "مُنتَزُوْنَ" میں ہوگیا؟ جب اصل حقائق یہ ہیں تو پھر کیوں سمجھا جاتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اُن کے گھوڑے کے نتھنوں میں گھسنے والی غبار سے بھی کمتر ہیں؟ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا تھا کہ عمر بن عبدالعزیز افضل یا معاویہ بن ابی سفیان، وہ کوئی زیرک و دانا آدمی تھا۔

عمر بن عبدالعزیز افضل یا معاویہ، یہ سوال کیوں پیدا ہوا؟

یہاں اُن لوگوں سے سوال ہے جو پہلے سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ اور معاویہ کے مابین مفاضلہ پر مبنی متقدمین کے سوال و جواب کو نقل کرتے ہیں پھر شانِ معاویہ میں مبالغہ بازی کی تمام حدیں پھلانگ جاتے ہیں۔ وہ بتائیں کہ کون نہیں جانتا کہ مطلقاً کسی صحابی اور غیر صحابی میں کوئی تقابل اور مفاضلہ بنتا ہی نہیں؟ یہ اِس قدر بدیہی بات ہے کہ معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والا شخص بھی اِس سے بے خبر نہیں، لہٰذا ہر عقل مند مسلم کو چاہیئے کہ وہ اُن وجوہات کو جاننے کی کوشش کرے جن کے باعث سائل کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ افضل یا معاویہ؟

ان وجوہات کے بیان کی زحمت ہم اُن لوگوں کو دینا چاہتے ہیں جو ایک طرف تو سیدنا عمر بن عبد العزیزؒ کو معاویہ کے گھوڑے کی ٹاپ سے اُٹھنے والی گرد و غبار سے بھی کمتر سمجھتے ہیں اور دوسری طرف وہ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کو تو خلفاء راشدین میں شمار کرتے ہیں لیکن معاویہ کو خلفاء راشدین میں سے نہیں سمجھتے۔ ایسے لوگوں میں سے بعض حضرات نے ایک سوال کے جواب میں لکھا ہے:

> "خلافتِ راشدہ: وہ خلافت کہ منہاج نبوت (یعنی نبوی طریقے) پر ہو جیسے حضرات خلفائے اربعہ و امام حسن و امیر المومنین عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے کی اور اب میرے خیال میں ایسی خلافتِ راشدہ امام مہدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی قائم

کریں گے"۔

(ملفوظات اعلیٰ حضرت ص ۱۶۰،مکتبۃالمدینہ کراچی؛بہارِشریعت ج۱ حصہ(الف) ص۲۵۷،مکتبۃالمدینۃ،کراچی؛حضرت سیدناعمربن عبد العزیز کی 425حکایات ص ۱۲۹،منجانب:دعوتِ اسلامی شعبہ اصلاح،مکتبۃالمدینہ،کراچی)

سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی خلافت کے فوراً بعد اُس شخص کا نام خلفاء راشدین میں کیسے آ گیا جس کو امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی دست برداری سے ساٹھ (۶۰) سال بعد اقتدار ملا، اور اُس شخص کا نام خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کی فہرست میں کیوں نہ شامل ہو سکا جس کو امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی دست برداری سے فوراً بعد اُسی دن ہی مکمل اقتدار مل گیا تھا؟ وجہ کیا ہے؟ صحابی، کاتبِ وحی، خال المومنین اور زمانی لحاظ سے خلافتِ راشدہ سے متصل شخص کو خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کی فہرست میں شمولیت ہی نہ ملی، اور جو صحابی نہیں، کاتب وحی نہیں، خال المومنین نہیں اور دورِ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم سے ساٹھ برس دور ہے، اُس کو خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کی فہرست میں شامل ہونا نصیب ہو گیا، وجہ کیا ہے؟؟

اعلیٰ حضرت اور مولانا امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہما دونوں اُس کے خلیفہ راشد ہونے کے قائل نہیں ہیں اور بعض تنظیمات بھی قائل نہیں۔ چنانچہ بعض تنظیمات کے شعبہ اصلاحی کتب کے قلمکار حضرات لکھتے ہیں:

> "حضرت سیدنا عمر بن عبد العزیز علیہ رحمۃ اللہ العزیز کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ خلافتِ اسلامیہ کو خلافتِ راشدہ کی طرز پر قائم کر کے عہد صدیقی اور عہد فاروقی کو دنیا میں پھر واپس لے آئے تھے۔ تجدید و اصلاح کے اسی کارنامے کی بدولت آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا زمانہ خلافتِ راشدہ میں شمار کیا جاتا ہے"۔

(حضرت سیدنا عمر بن عبد العزیز کی 425حکایات ص۱۲۹)

پوچھنا یہ تھا کہ جس عہدِ صدیقی و فاروقی کو سیدنا عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ دنیا میں پھر واپس لے آئے تھے، اُس عہد کو ختم یا پامال کس نے کیا تھا؟ نیز وفاتِ معاویہ سے تقریباً ۳۹ سال بعد، سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی دست برداری سے ساٹھ سال بعد اور وصالِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ۹۰ سال بعد اُس عہد کو حضرت عمر بن عبد

العزیز ﷺ تو واپس لے آئے مگر ایک صحابی اور کاتبِ وحی شخص اُس نظام کو قائم ہی کیوں نہ رکھ سکا؟ وہ مکمل اختیارات کے ساتھ بیس برس تک حکومت کرنے کے باوجود اُس نظام کو کیوں نہ سنبھال سکا اور خلیفہ راشد کے ٹائٹل سے کیوں محروم رہا، آخر اِس محرومی کی وجوہات کیا ہیں؟؟؟

وکلائے طلقاء حقانیت پر مبنی وجوہات بیان کریں گے تو حقیقت عیاں ہو جائے گی اور وہ بیان نہ بھی کریں تو عقل مندوں پر تو از خود یہ حقیقت عیاں ہے کہ ۔

عمل سے زندگی بنتی ہے، جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری

قارئین کرام یقین فرمایئے! اگر ایمان داری اور انصاف و دیانت کے ساتھ اِن وجوہات کا جواب وکلائے طلقاء نے دے دیا تو یقیناً بڑے بڑے عقدے کھل جائیں گے اور سارے بھرم ٹوٹ جائیں گے۔ پھر کوئی عقل منداور شریعت پسند شخص بعض مجہول اور غاوی شعراء کے اِس قسم کے اشعار سے استدلال کرنے کی جسارت نہیں کرے گا:

ومن یکن یطعن في معاویة
فذاک کلب من کلاب الهاویة

سیدنا عمر بن عبد العزیز ﷺ اور معاویہ کے مابین مفاضلہ پر امام ابن المبارک وغیرہ کے قول پر بحث ونظر کے لیے راقم الحروف کی کتاب **"الأحادیث الموضوعة في فضائل معاویة"** کا مطالعہ بھی بہت مفید ثابت ہوگا۔

سبّ شروع کرنے اور بند کرنے والا برابر؟

قارئین کرام! آپ نواصبِ زمانہ کے سامنے یہ سادہ سا سوال رکھیں کہ اگر ایک صحابی کہلانے والا شخص سیدنا علی ﷺ پر سبّ وشتم شروع کرائے اور غیر صحابی اُس سبّ وشتم کو بند کرائے تو افضل کون ہوگا؟ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ عام مسلمان کو سبّ کرنا فسق ہے اور سیدنا علی ﷺ کو سبّ کرنا نبی کریم ﷺ پر سبّ کرنا ہے، لہٰذا خود ہی سمجھ لینا چاہیئے کہ سب وشتم شروع کرانے والا کتنا بڑا مجرم ہوگا اور سبّ وشتم

بند کرانے والا کتنا بڑا احمق؟

نوٹ:

بعض غیر ملکی مداریوں نے "حضرت معاویہ خلیفۂ راشد" کے نام سے ایک کتاب لکھ ماری ہے، میں نے اُس کا مطالعہ کیا ہے، انتہائی کمزور، بد دیانتی اور تاویلاتِ فاسدہ پر مبنی تحریر ہے، اِس لیے میں نے اُس کی تردید میں دلچسپی نہیں لی، کیونکہ کسی غیر اہم تحریر کی تردید کی جائے تو اُس کی عمر بڑھ جاتی ہے۔

تعصب سے حقائق اوجھل ہو جاتے ہیں

قرائن واحوال سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض علماء ہند سے ایسی سنگین غلطی جو سراسر کتاب وسنت کے منافی ہے اِس لیے سرزد ہوگئی کہ وہ تردیدِ روافض میں بہت ہی سخت تھے، اور بسا اوقات انسان مذہبی تعصب میں فریقِ مخالف کی سچی باتوں پر بھی ہاتھ صاف کرنے سے گریز نہیں کرتا۔ چنانچہ علامہ ابن تیمیہ بھی روافض کی تردید میں تنقیصِ مرتضوی کے مرتکب ہو گئے تھے، جیسا کہ امام سبکی رحمۃ اللہ علیہ نے اِس حقیقت سے پردہ اُٹھایا ہے اور حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے یوسف بن حسین بن مطہر الحلّی کے حالات میں اُن کے قول کی تائید فرمائی ہے۔ دیکھیے!

(لسان الميزان للعسقلاني ج٧ص٥٢٩، ٥٣٠؛الأجوبة الفاضلة للأسئلة العشرة الكاملة للكنوي ص١٧٤، ١٧٥)

اگر کچھ لوگوں کو مجھ عاجز کی یہ بات حقیقت کے منافی محسوس ہو رہی ہو تو میں اُن کے سامنے ایک ناقابل تردید نظیر پیش کر دیتا ہوں۔ بعض علماء ہند سے لاہور کے بعض لوگوں نے دو سوال کیے، سوال کا مکمل رُخ معاویہ کی طرف ہے، اُس میں اہل جمل کا ذکر تک نہیں مگر چونکہ سوال میں روافض کا ذکر آ گیا ہے، اِس لیے بعض علماء ہند کی توجہ سوال کے مندرجات پر مرکوز نہ رہی اور اُنہوں نے روافض کو کوسنا شروع کر دیا، پھر جس شخص اور جس جنگ کے بارے میں اُن سے سوال کیا گیا تھا اُس کا جواب دینے کی بجائے وہ ایسی بحث میں کھو گئے جو سائل کا مقصود ہی نہیں تھا۔ آیئے! مکمل سوال وجواب خود پڑھ لیجئے:

''مسئلہ'': از لاہور، مسجد بیگم شاہی اندرون دروازہ مستی، مرسلہ صوفی احمد الدین طالب علم، ۲۶ صفر ۱۳۳۸ھ۔

حضرت ہادی ورہنمائے سالکاں قبلہ دو جہاں دام فیضہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ، مسائلِ ذیل میں حضرت کیا فرماتے ہیں:

۱۔ حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ایک روز خفا ہوئے، اور روافض کہتے ہیں: یہی وجہ ہے باغی ہونے کی۔ پھر ایک کتاب مولانا حاجی صاحب کی تصنیف اعتقاد نامہ ہے جو بچوں کو پڑھایا جاتا ہے، اس میں یہ شعر بھی درج ہے۔

حق در آنجا بدست حیدر بود
جنگ با او خطا و منکر بود

(حق وہاں حیدر کرار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ میں تھا، ان کے ساتھ
جنگ غلط وناپسندیدہ تھی)

۲۔ امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خلافت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سپرد کی تھی واسطے دفع جنگ کے۔

الجواب:

۱۔ روافض کا قول کذب محض ہے۔ عقائد نامہ میں خطا و منکر بود نہیں ہے بلکہ خطائے منکر بود۔ اہل سنت کے نزدیک امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خطا خطاءِ اجتہادی تھی، اجتہاد پر طعن جائز نہیں ہے۔ خطاءِ اجتہادی دو قسم ہے: مقرر و منکر۔ مقرر وہ جس کے صاحب (مرتکب) کو اُس پر برقرار رکھا جائے گا اور اُس سے تعرض نہ کیا جائے گا، جیسے حنفیہ کے نزدیک شافعی المذہب مقتدی کا امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنا، اور منکر وہ جس پر انکار کیا جائے گا جبکہ اس کے سبب کوئی فتنہ پیدا ہوتا ہو، جیسے اجلہ اصحابِ جمل

رضی اللہ تعالیٰ عنہم کہ قطعی جنتی ہیں اور اُن کی خطا یقیناً اجتہادی جس میں کسی نام سنیت لینے والے کو محل لب کشائی نہیں، بااین ہمہ اُس پر انکار لازم تھا جیسا امیر المومنین مولیٰ علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم نے کیا، باقی مشاجرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں مداخلت حرام ہے۔ حدیث میں ہے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ (وآلہ) وسلم فرماتے ہیں: ''اِذَا ذُکِرَ اَصْحَابِیْ فَاَمْسِکُوْا'' (جب میرے صحابہ کا ذکر آئے تو زبان روکو) دوسری حدیث میں فرماتے ہیں صلی اللہ تعالیٰ علیہ (وآلہ) وسلم ''سَتَکُوْنُ لِاَصْحَابِیْ بَعْدِیْ زَلَّۃٌ یَغْفِرُھَا اللّٰہُ لَھُمْ لِسَابِقَتِھِمْ ، ثُمَّ یَأْتِیْ مِنْ بَعْدِھِمْ قَوْمٌ یَکُبُّھُمُ اللّٰہُ عَلٰی مَنَاخِرِھِمْ فِی النَّارِ'' (قریب ہے کہ میرے اصحاب سے کچھ لغزش ہوگی جسے اللہ بخش دے گا اس سابقہ کے سبب جو اُن کو میری سرکار میں ہے، پھر اُن کے بعد کچھ لوگ آئیں گے جن کو اللہ تعالیٰ ناک کے بل جہنم میں اوندھا کر دے گا) یہ وہ ہیں جو اُن لغزشوں کے سبب صحابہ پر طعن کریں گے، اللہ ﷻ نے تمام صحابہ سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ (وآلہ) وسلم کو قرآن عظیم میں دو قسم کیا: مومنین قبل فتح مکہ و مومنین بعد فتح۔ اول کو دوم پر تفضیل دی اور صاف فرما دیا: وَ کُلًّا وَّعَدَ اللّٰہُ الْحُسْنٰی'' سب سے اللہ نے بھلائی کا وعدہ فرما لیا اور ساتھ ہی اُن کے افعال کی تفتیش کرنے والوں کا منہ بند فرما دیا ''وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ'' (اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کرنے والے ہو) بااین ہمہ وہ تم سب سے بھلائی کا وعدہ فرما چکا پھر دوسرا کون ہے کہ اُن میں سے کسی کی بات پر طعن کرے۔ واللہ الہادی، واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۔ بیشک امام مجتبیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلافت سپرد فرمائی، اور اس سے صلح و بندشِ جنگ مقصود تھی اور یہ صلح و تفویضِ خلافت اللہ و رسول کی پسند سے ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ (وآلہ) وسلم نے امام حسن کو گود میں لے کر فرمایا تھا: ''ان ابني هذا سيد و لعل اللّٰه أن يصلح به بين فئتين عظيمتين

من المسلمین" (میرا یہ بیٹا سید ہے میں امید کرتا ہوں کہ اللہ اس کے سبب سے مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرادے گا) امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اگر خلافت کے اہل نہ ہوتے (تو) امام مجتبیٰ ہرگز اُنہیں تفویض نہ فرماتے، نہ اللہ و رسول اسے جائز رکھتے۔ واللہ تعالیٰ اعلم"۔

(فتاویٰ رضویہ ج۲۹ ص ۳۳۵، ۳۳۷)

قارئین کرام! اِس سوال و جواب کے الفاظ میں آپ خود بھی غور فرمالیں اور یہ عاجز بھی چند امور کو واضح کرنا چاہتا ہے:

۱۔ سوال نمبر[۱] میں معاویہ کے باغی ہونے کے متعلق دریافت کیا گیا اور اُس میں اُن کے باغی ہونے کی ایک صحیح یا غلط وجہ بھی مذکور ہے، لیکن بعض علماء ہند اس سوال کے جواب کو گول کر گئے۔

۲۔ اسی سوال میں ایک فارسی شعر میں "جنگ با او خطا و منکر بود" میں حرفِ واو زیادہ تھا تو فاضلِ بریلی اس غلطی کو روافض کی غلطی گردانتے ہوئے اُن پر برس پڑے اور کہا: "**روافض کا قول کذب محض ہے**"۔ حالانکہ سائل نے یہ شعر روافض کی طرف سے نہیں اپنی طرف سے نقل کیا ہے، کیونکہ سائل نے یہ نہیں کہا کہ روافض نے بطور دلیل یہ شعر بھی پیش کیا ہے، لیکن چونکہ موصوف ردِ روافض میں خاصی دل چسپی لیتے تھے اس لیے اُن سے جواب کا آغاز ہی تردید سے ہو گیا اور اُنہیں دھیان نہ رہا کہ جس بات کو وہ "**روافض کا قول کذب محض ہے**" کہہ رہے ہیں وہ کذب ہے یا غلطی، اور اگر واقعی وہ کذب یا غلطی ہے تو کس کی طرف سے ہے، سائل کی جانب سے ہے یا روافض کی جانب سے؟

۳۔ اس کے بعد لفظِ باغی سے صرفِ نظر کرتے ہوئے فاضل بریلی کی توجہ شعر میں مذکور لفظِ منکر پر مرکوز ہو گئی تو اُنہوں نے اس کی دو قسمیں بیان کیں اور جس باغی شخص یا جس کی خطائے منکر کے متعلق سوال کیا گیا تھا اُسے آٹے سے بال کی طرح نکال لیا اور اُن قطعی جنتی ہستیوں (جنگ جمل کے اکابر رضی اللہ عنہم) کا ذکر شروع کر دیا جن کا سوال میں نام اور ذکر ہی نہیں ہے۔

۴۔ اُن اصحابِ جمل (ام المومنین سیدتنا عائشہ صدیقہ، سیدنا زبیر بن العوام اور سیدنا طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہم)

کے اقدام کو خطاء منکر قرار دے کر اُن پر انکار کو لازم کہا اور اِسی لیے اُن کے خلاف سیدنا علیؓ کے اقدام کو حق کہا۔

۵۔ اس کے بعد اُنہیں یکا یک خیال آ گیا کہ "مشاجراتِ صحابہؓ میں دخول حرام ہے" اور اس پر اُنہوں نے احادیث بھی درج کر ڈالیں۔ اگر یہی بات تھی تو اوّلاً ہی سائل کو جواب میں یہی احادیث پیش کر کے فرما دیتے: خاموش! "مشاجراتِ صحابہؓ میں دخول حرام ہے" لیکن افسوس کہ اُنہوں نے اِن احادیث کے باوجود قطعی جنتی ہستیوں کا ذکر چھیڑ دیا اور اُن کے اقدام کو خطائے منکر بھی قرار دے دیا، حالانکہ ان کے متعلق سائل نے سوال ہی نہیں کیا تھا اور حیرت کی بات ہے کہ سائل نے جس صاحب کے متعلق سوال کیا ہے فاضل موصوف اُس کی طرف گئے ہی نہیں۔ اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر "إِذَا ذُكِرَ أَصْحَابِي فَأَمْسِكُوْا" کے الفاظ حدیث نبوی ہیں تو کیا یہ الفاظ فقط طلقاء کے دفاع کے لیے آئے ہیں، عشرہ مبشرہ اور قدیم صحابہ کرامؓ کے دفاع کے لیے نہیں آئے؟

۶۔ فاضل بریلی نے مذکور الصدر حدیث اور درجِ ذیل حدیث کو معاویہ کے دفاع میں نقل کیا ہے، کیونکہ سوال فقط معاویہ کے متعلق تھا، لیکن اُن کا یہ استدلال بہت سی احادیث کے خلاف ہے، کیونکہ احادیث مبارکہ میں جہاں بھی لفظ "أَصْحَابِيْ" سے نبی کریم ﷺ نے کوئی فضیلت، تنبیہ یا نصیحت فرمائی ہے وہاں طلقاء مراد نہیں بلکہ سابقون اولون صحابہ کرامؓ مراد ہیں۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ راقم الحروف کی کتاب "الصحابة والطلقاء" میں اِس کی تفصیل آئے گی۔

۷۔ فاضل بریلی نے درجِ ذیل حدیث بھی معاویہ کی شان اور دفاع میں پیش کی:

سَتَكُوْنُ لِأَصْحَابِيْ بَعْدِيْ زَلَّةٌ يَغْفِرُهَا اللّٰهُ لَهُمْ لِسَابِقَتِهِمْ ، ثُمَّ يَأْتِيْ مِنْ بَعْدِهِمْ قَوْمٌ يَكُبُّهُمُ اللّٰهُ عَلىٰ مَنَاخِرِهِمْ فِي النَّارِ.

"قریب ہے کہ میرے اصحاب سے کچھ لغزش ہوگی جسے اللہ بخش دے گا، اس سابقہ کے سبب جو اُن کو میری سرکار میں ہے، پھر اُن کے بعد کچھ لوگ آئیں گے جن کو اللہ تعالیٰ ناک کے بل جہنم میں اوندھا کر دے گا"۔

اُن کا یہ استدلال بھی درست نہیں ہے، کیونکہ اِس حدیث میں دو قسم کے لوگوں کا ذکر ہے اور دونوں کے لیے الفاظ الگ الگ ہیں، پہلے والوں کے لیے لفظ "أَصْحَابِيْ" ہے اور دوسروں کے لیے لفظ "قَوْمٌ" استعمال فرمایا گیا ہے، ذرا توجہ سے دوبارہ پڑھ لیجئے!

سَتَكُوْنُ لِأَصْحَابِيْ بَعْدِيْ زَلَّةٌ يَغْفِرُهَا اللّٰهُ لَهُمْ لِسَابِقَتِهِمْ" اِس جملہ میں لفظ "تَكُوْنُ" سے پہلے "س" کا ہونا پھر اُس کے بعد لفظ "أَصْحَابِيْ" کا آنا پھر لفظ "بَعْدِيْ" (میرے بعد) پھر لفظ "زَلَّةٌ" پھر "لِسَابِقَتِهِمْ" کے الفاظ اہلِ علم کی خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔

"سَتَكُوْنُ" سے یہ بتایا گیا ہے کہ زیادہ عرصہ نہیں گذرے گا بلکہ میرے بعد مستقبل قریب ہی میں عام لوگوں سے نہیں بلکہ میرے صحابہ کرام ﷺ سے لغزش ہوگی۔ پھر ان کے بعد آنے والوں کے لیے فرمایا: "ثُمَّ يَأْتِيْ مِنْ بَعْدِهِمْ قَوْمٌ يَكُبُّهُمُ اللّٰهُ عَلٰى مَنَاخِرِهِمْ فِي النَّارِ" فاضل بریلی نے اِن الفاظ سے اُن لوگوں کو مراد لیا ہے جن کی طرف سائل نے اشارہ کیا ہے، یعنی اعلیٰ حضرت کے دور کے لوگ۔ اہل علم سے درخواست ہے کہ وہ ایک طرف "ثُمَّ يَأْتِيْ مِنْ بَعْدِهِمْ قَوْمٌ" میں "ثُمَّ" اور "مِنْ بَعْدِهِمْ" کے الفاظ میں توجہ فرمائیں اور پھر پہلے جملے کے الفاظ "لِأَصْحَابِيْ" اور پھر دو مرتبہ ضمیر "هُمْ" میں غور فرمائیں اور بتائیں کہ کیا "أَصْحَابِيْ" کے بعد لفظ "ثُمَّ" سے جس قوم کے آنے کا ذکر ہے اُس سے چودھویں صدی کے وہ لوگ مراد ہیں جن سے صحابہ کی طرح "زَلَّةٌ" (لغزش) واقع ہوگی یا وہ لوگ مراد ہیں جو اُن صحابہ کرام ﷺ کے زمانے میں اُن کے فوراً بعد اُسی طرح کی لغزش کا ارتکاب کریں گے؟

اصل بات یہ ہے کہ پہلے تو یہ حدیث انتہائی ضعیف ہے اور اِس سے استدلال درست نہیں، لیکن اگر اِس سے استدلال جائز بھی ہو تو پھر اِس سے ایسی قوم مراد ہے جو نمودار تو ہوگی صحابہ کرام ﷺ کے فوراً بعد اور وہ اُن ہی کی طرح کا عمل کرے گی مگر اُن کا عمل "زَلَّةٌ" (لغزش) نہیں ہوگا بلکہ جرم ہوگا، اسی لیے اُن کے لیے "يَغْفِرُهَا اللّٰهُ" کے الفاظ نہیں بلکہ "النَّارُ" کا لفظ ہے، اور یہ وہی قوم ہے جس کے لیے یہی لفظ حسبِ ذیل حدیث میں بھی آیا ہے:

وَيْحَ عَمَّارٍ، تَقْتُلُهُ الْفِئَةُ الْبَاغِيَةُ، يَدْعُوْهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ، وَيَدْعُوْنَهُ إِلَى النَّارِ.

''عمار پر رحمت ہو، اس کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا، یہ اُن کو جنت کی طرف بلائے گا
اور وہ اس کو دوزخ کی طرف بلائیں گے''۔

(بخاري ص۷۸ حديث ٤٤٧، وص ٤٦٦ حديث ۲۸۱۲)

خیال رہے کہ اس معنوی اطلاق سے کچھ لوگوں کو مستثنیٰ سمجھا جاسکتا ہے، کیونکہ ہر شخص کا معاملہ اُس کی نیت کے مطابق ہوتا ہے، جیسا کہ خود سیدنا علی ﷺ کا یہ اِرشادِ عدل اِس پر شاہد ہے:

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ وَجْهَ اللّٰهِ مِنَّا وَمِنْهُمْ نَجَا.

''ہم میں سے اور اُن میں سے جس نے رضائے الٰہی کا ارادہ کیا وہی نجات پائے گا''۔

(تاريخ دمشق ج۱ ص ۳٤٦؛ مختصر تاريخ دمشق ج۱ ص ۱۳۱)

دوسری حدیث میں سیدنا علی علیہ السلام سے جو الفاظ منقول ہیں وہ فقط مقتولین کے لیے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

مَنْ قُتِلَ مِنَّا وَمِنْهُمْ يُرِيْدُ وَجْهَ اللّٰهِ وَالدَّارَ الآخِرَةِ ، دَخَلَ الْجَنَّةَ.

''ہم میں سے اور اُن میں سے جو رضائے الٰہی اور دارِ آخرت کے لیے شہید ہو گیا وہ جنت میں داخل ہوا''۔

(سنن سعيد بن منصور، باب جامع الشهادة ج۲ ص ۳٤٤، ۳٤٥ حديث ۲۹٦۸)

نیز بعض علماء ہند کا زیر بحث ضعیف حدیث ''سَتَكُوْنُ لِأَصْحَابِيْ بَعْدِيْ زَلَّةٌ يَغْفِرُهَا اللّٰهُ لَهُمْ لِسَابِقَتِهِمْ'' کو طلقاء کی شان میں لانا قرآن مجید کی درجِ ذیل آیات کے بھی خلاف ہے:

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّأْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضَاعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا. وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَا أَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ.

''اے نبی کی بیبیو جو تم میں صریح حیا کے خلاف کوئی جرأت کرے اس پر اوروں سے دونا عذاب ہوگا اور یہ اللہ پر آسان ہے، اور جو تم میں فرماں بردار رہے اللہ اور رسول

کی اور اچھا کام کرے ہم اُسے اوروں سے دونا ثواب دیں گے"۔

(الأحزاب: ۳۰، ۳۱)

کیا بعض طلقاء امہات المومنین رضی اللہ عنہن سے زیادہ صحبت یافتہ تھے؟ یہ آیات تو بتلا رہی ہیں کہ جس طرح کسی صحابی کو اُس کی کسی نیکی پر اجر دوگنا دیا جائے گا اسی طرح اُس کی برائی پر عذاب بھی دوگنا دیا جائے گا۔

﴿وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى﴾ سے استدلال کا جائزہ

فاضل بریلی نے بعض طلقاء کو ﴿وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى﴾ میں بھی شامل کر دیا ہے لیکن اُن کا یہ استدلال مردود و باطل ہے، کیونکہ سورۃ الحدید فتح مکہ سے پہلے نازل ہوئی ہے، حتیٰ کہ یہ اختلاف بھی ہے کہ یہ سورت مکی ہے یا مدنی، بعض نے کہا ہے کہ اس کا کچھ حصہ مکی ہے اور کچھ حصہ مدنی، بہر حال یہ فتح مکہ سے پہلے نازل ہوئی تھی اور معاویہ بن ابی سفیان فتح مکہ کے بعد مجبوراً اسلام لائے تھے۔ سورۃ الحدید کی اِس آیت میں جو لفظ "الفتح" آیا ہے اُس کی تفسیر معلوم کرنے کے لیے اگر آپ کتب تفسیر کو کھنگالنا شروع کریں گے تو آپ کو نقل در نقل کے طور پر فتح مکہ کے قائلین کی تعداد زیادہ ملے گی مگر اہلِ تحقیق مفسرین نے اِس سے فتح مکہ نہیں بلکہ صلح حدیبیہ کی فتح مراد لی ہے اور اسی کو صحت کے قریب اور راجح قرار دیا ہے۔ چنانچہ امام ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ فتح مکہ اور فتح حدیبیہ دونوں کے بارے میں تفسیری اقوال نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> وَأَوْلَى الْأَقْوَالِ فِيْ ذٰلِکَ بِالصَّوَابِ عِنْدِيْ أَنْ يُقَالَ: مَعْنىٰ ذٰلِکَ: لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ أَيُّهَا النَّاسُ مَنْ أَنْفَقَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مِنْ قَبْلِ فَتْحِ الْحُدَيْبِيَةِ، لِلَّذِيْ ذَكَرْنَا مِنَ الْخَبَرِ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ، الَّذِيْ رَوَيْنَاهُ عَنْ أَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ عَنْهُ.
>
> "اور میرے نزدیک اِن اقوال میں سے صحیح یہ ہے کہ اس آیت کا معنیٰ یوں کیا جائے: اے لوگو! تم اُن کے برابر نہیں ہو جنھوں نے تم میں سے فتح حدیبیہ سے قبل راہِ

الٰہی میں خرچ کیا ہے، اس لیے کہ ہم اِس کی دلیل میں رسول اللہ ﷺ کا وہ ارشاد نقل کر چکے ہیں جو آپ ﷺ سے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے"۔

(جامع البیان ج۲۲ ص ۳۹۵)

امام ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ نے اِس سے قبل جو حدیث نبوی نقل فرمائی ہے وہ یہ ہے:

عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ، قَالَ: قَالَ لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَامَ الْحُدَيْبِيَةِ: يُوْشِكُ أَنْ يَأْتِيَ قَوْمٌ تَحْقِرُوْنَ أَعْمَالَكُمْ مَعَ أَعْمَالِهِمْ، قُلْنَا: مَنْ هُمْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ، أَقُرَيْشٌ هُمْ؟ قَالَ: لَا، وَلٰكِنْ أَهْلُ الْيَمَنِ، أَرَقُّ أَفْئِدَةً، وَأَلْيَنُ قُلُوْبًا. فَقُلْنَا: هُمْ خَيْرٌ مِّنَّا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ فَقَالَ: لَوْ كَانَ لِأَحَدِهِمْ جَبَلٌ مِنْ ذَهَبٍ فَأَنْفَقَهُ، مَا أَدْرَكَ مُدَّ أَحَدِكُمْ وَلَا نَصِيْفَهُ، أَلَا إِنَّ هٰذَا فَصْلٌ مَّا بَيْنَنَا وَبَيْنَ النَّاسِ ﴿لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ﴾ إِلٰى قَوْلِهِ: ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ﴾.

"سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حدیبیہ کے سال ارشاد فرمایا: عنقریب تمہارے پاس ایک قوم آئے گی جن کے اعمال کے مقابلہ میں تم اپنے اعمال کو حقیر سمجھو گے۔ ہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! وہ کون ہیں، کیا قریش ہیں وہ؟ فرمایا: نہیں، لیکن وہ اہل یمن ہیں جو بہت زیادہ رقیق القلب اور نرم خو ہیں۔ ہم نے پھر عرض کیا: یارسول اللہ! کیا وہ ہم سے بہتر ہیں؟ فرمایا: اگر اُن میں سے کسی کے پاس سونے کا پہاڑ ہو پھر وہ اُس کو خرچ کر دے تو وہ تمہارے ایک اور آدھے مُد کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتا۔ سنو! ہمارے اور لوگوں کے درمیان یہ آیت حدِّ فاصل ہے: ﴿تم میں سے کوئی برابری نہیں کر سکتا اُن کی جنہوں نے فتح سے پہلے خرچ کیا اور جنگ کی، اُن کا درجہ بہت بڑا ہے اُن سے جنہوں نے فتح کے بعد مال خرچ کیا اور جنگ کی، اور سب کے ساتھ اللہ نے وعدہ کیا ہے بھلائی کا، اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو اُس

سے بخوبی خبردار ہے﴾"۔

(جامع البيان ج٢٢ص٣٩٤؛تفسير ابن أبي حاتم ج١٠ص٣٣٣٦)

اس حدیث کی سند میں سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے علاوہ پانچ راوی ہیں:

۱۔ یونس بن عبدالاعلیٰ مصری، یہ امام ابن جریر طبری کے مشائخ میں سے ہیں۔حافظ ابن حجر عسقلانی ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ ثقہ ہیں۔

(تقريب التهذيب ص١٠٩٨)

۲۔ ابن وھب: ان کی توثیق کے بارے میں پہلے لکھا جا چکا ہے۔

۳۔ ہشام بن سعد: ان کے بارے میں حافظ نے تمام اقوال کا خلاصہ اِن الفاظ میں درج کیا ہے:

صَدُوقٌ لَهُ أَوْهَامٌ ، وَرُمِيَ بِالتَّشَيُّعِ.

"یہ سچا ہے، اس کے کچھ اوہام تھے اور اس پر تشیع کی تہمت لگائی گئی ہے"۔

(تقريب التهذيب ص١٠٩٨)

لیکن یہاں اس بات کا خیال رہے کہ اِس حدیث میں ایسی کوئی بات نہیں جس سے تشیع کو تقویت ملے، نیز یہ حدیث انہوں نے زید بن اسلم سے روایت کی ہے، اور ان سے روایت میں وہ تمام لوگوں سے زیادہ مضبوط تھے۔چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی ہی لکھتے ہیں:

قَالَ الآجُرِيُّ ، عَنْ أَبِي دَاوُدَ: هِشَامُ بْنُ سَعْدٍ أَثْبَتُ النَّاسِ فِي زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ.

"محدث آجری امام ابوداود سے روایت کرتے ہیں کہ اُنہوں نے فرمایا: ہشام بن سعد زید بن اسلم سے روایت کرنے میں تمام لوگوں سے زیادہ مضبوط ہیں"۔

(تهذيب التهذيب ج٦ص٦٤١)

۴۔ زید بن اسلم عدوی رحمہ اللہ: یہ سیدنا عمر کے غلام ہیں۔حافظ عسقلانی لکھتے ہیں: یہ ثقہ عالم تھے۔

(تقريب التهذيب ٣٥٠)

۵۔ عطاء بن یسار ابومحمد مدنی ہلالی: یہ سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا کے غلام تھے۔حافظ عسقلانی ان کے بارے میں لکھتے ہیں: یہ ثقہ فاضل تھے۔

(تقریب التهذيب ٦٧٩)

امام سیوطی نے سورۃ الفتح کی تفسیر میں محدث عبد بن حمید سے اِس سے بھی زیادہ واضح حدیث نقل فرمائی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

عَنْ عَامِرِ الشَّعْبِيِّ ، أَنَّ رَجُلًا سَأَلَ النَّبِيَّ ﷺ يَوْمَ الْحُدَيْبِيَةِ: أَفَتْحٌ هٰذَا ؟ قَالَ: وَأُنْزِلَتْ عَلَيْهِ: ﴿إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا﴾ فَقَالَ النَّبِيُّ: نَعَمْ، عَظِيمٌ. قَالَ: وَكَانَ فَصْلٌ مَا بَيْنَ الْهِجْرَتَيْنِ فَتْحَ الْحُدَيْبِيَةِ، فَقَالَ: ﴿لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ﴾".

''حضرت عامر شعبی ؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے حدیبیہ کے دن دریافت کیا: کیا یہ فتح ہے؟ راوی کہتے ہیں: اور آپ پر آیت ﴿إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا﴾ نازل کی گئی تھی۔پس نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ہاں عظیم فتح ہے۔فرمایا: دو ہجرتوں کے درمیان فرق حدیبیہ کی فتح ہے، پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: ﴿لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ﴾''۔

(الدر المنثور ج ١٣ ص ٤٦١)

اصل فتح صلحِ حدیبیہ ہے، قولِ محقق

اِس تفسیرِ نبوی ﷺ کے بعد کوئی ابہام باقی نہ رہا کہ سورۃ الحدید کی آیت نمبر دس ﴿لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ﴾ میں جس فتح کا ذکر ہے اُس سے صلح حدیبیہ کی فتح مراد ہے۔ اب اِس سلسلہ میں اگرچہ تفسیری اقوال نقل کرنے کی حاجت نہیں ہے، تاہم بعض لوگوں کی تسلی کے لیے چند حوالہ جات پیش کرتا ہوں۔امام ابوحیان اندلسی نے اِس قسم کے دلائل کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کو قولِ جمہور قرار دیا ہے۔چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

وَقَالَ الْجَمْهُوْرُ: هُوَ فَتْحُ الْحُدَيْبِيَةِ ، وَقَالَهُ السُّدِيُّ وَالشَّعْبِيُّ وَالزُّهْرِيُّ. قَالَ ابْنُ عِطْيَةَ: وَهُوَ الصَّحِيْحُ.

''جمہور نے کہا: یہ فتح حدیبیہ ہے ،اور یہی سدی، شعبی اور زُہری کا قول ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہی صحیح ہے''۔

(البحر المحيط ج۸ص۸۹)

علامہ محمود آلوسی حنفی نے اِس مقام پر تفصیلی کلام کیا ہے اور فرمایا ہے کہ قبل از فتح اور بعد از فتح سے مراد صلح حدیبیہ سے قبل اور صلح حدیبیہ کے بعد ہے۔ پہلے اُنہوں نے مشہور حدیث ''لَا تَسُبُّوْا أَصْحَابِيْ'' درج فرمائی ہے، اِس میں حضرت عبد الرحمان بن عوف اور حضرت خالد بن ولید کے تنازع کا ذکر ہے، اِن میں سے اول الذکر قدیم الاسلام ہیں اور مؤخر الذکر صلح حدیبیہ کے بعد مسلمان ہوئے تھے۔ پھر اُنہوں نے آیت میں جو لفظ ﴿أُولٰئِکَ أَعْظَمُ دَرَجَةً﴾ آیا ہے اُس سے اُنہوں نے حدیبیہ سے پہلے والے قدیم الاسلام صحابہ کرام ﷺ کو مراد لیا ہے اور ﴿مِنَ الَّذِيْنَ أَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوْا﴾ سے صلح حدیبیہ سے بعد والوں کو مراد لیا ہے۔ پھر اُنہوں نے نتیجہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

ثُمَّ فِی الْحَدِيْثِ تَأْيِيْدٌ مَا لِكَوْنِ ﴿أُولٰئِکَ﴾ هُمُ الَّذِيْنَ أَنْفَقُوْا قَبْلَ الْحُدَيْبِيَةِ ، لِأَنَّ إِسْلَامَهُ ﷺ كَانَ بَيْنَ الْحُدَيْبِيَةِ وَفَتْحِ مَكَّةَ كَمَا فِي "التَّقْرِيْبِ" وَغَيْرِهِ ، وَالزَّمَخْشَرِيُّ فَسَّرَ الْفَتْحَ بِفَتْحِ مَكَّةَ ، فَلَا تَغْفَلْ.

''پھر اِس حدیث (لَا تَسُبُّوْا) میں اِس بات کی تائید ہے کہ ﴿ أُولٰئِکَ أَعْظَمُ﴾ میں اُن لوگوں کا ذکر ہے جو صلح حدیبیہ سے پہلے مسلمان ہوئے ، کیونکہ حضرت خالد ﷺ صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیانی عرصہ میں اسلام لائے تھے، جیسا کہ ''تقریب التہذیب'' وغیرہ کتب میں ہے،اور علامہ زمخشری نے الفتح کی تفسیر فتح مکہ سے کی ہے، لہٰذا غفلت کا شکار نہ ہونا''۔

(روح المعاني ج۲٦ص۲۱۲)

پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق کے مطابق سورۃ الحدید کا نزول ہی فتح مکہ سے پہلے ہوا، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''اس کی آیات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نزول غزوۂ اُحد اور صلح حدیبیہ کے درمیانی عرصہ میں ہوا''۔

(ضياء القرآن ج٥ ص١٠٤)

پیر صاحب نے سورۃ الفتح کی پہلی آیت کی تفسیر میں بھی دوسرے اقوال نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:
''اس فتحِ مبین سے مراد صلح حدیبیہ ہے''۔

(ضياء القرآن ج٤ ص٥٣١)

مولانا نعیم الدین مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ سورۃ الفتح کی پہلی آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:
''اکثر مفسرین فتح سے صلح حدیبیہ مراد لیتے ہیں''۔

(خزائن العرفان ص٥٢٠)

نواب صدیق حسن قنوجی لکھتے ہیں:
وَقَالَ الشَّعْبِيُّ وَالزُّهْرِيُّ : فَتْحُ الْحُدَيْبِيَةِ ، وَهُوَ الرَّاجِحُ قَالَهُ الْكَرْخِيُّ.
''امام شعبی اور زہری نے فرمایا: فتح حدیبیہ مراد ہے اور امام کرخی نے فرمایا: یہی راجح ہے''۔

(فتح البيان في مقاصد القرآن ج١٣ ص٤٠١)

حدیبیہ کی بجائے فتح مکہ کیوں مشہور ہوگئی؟

یوں محسوس ہوتا ہے کہ بعض غرض مندوں نے اِس آیت کی تفسیر میں فتح مکہ کو اِس قدر شہرت دی کہ عام لوگوں نے اسی کو ہی اصل فتح سمجھ لیا، جبکہ قدیم الاسلام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نزدیک صلح حدیبیہ اصل فتح تھی۔ چنانچہ امام بخاری حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ اُنہوں نے فرمایا:

تَعُدُّوْنَ أَنْتُمُ الْفَتْحَ فَتْحَ مَكَّةَ ، وَقَدْ كَانَ فَتْحُ مَكَّةَ فَتْحًا وَنَحْنُ نَعُدُّ الْفَتْحَ بَيْعَةَ الرِّضْوَانِ يَوْمَ الْحُدَيْبِيَةِ.

''تم لوگ فتح مکہ کو فتح سمجھتے ہو، بیشک فتح مکہ بھی ایک فتح تھی، جبکہ ہم حدیبیہ کے دن بیعتِ رضوان کو فتح سمجھتے ہیں''۔

(بخاري: كتاب المغازي، باب غزوة الحديبية، ص ٥٦٧ حديث ٤١٥٠؛ تاريخ الإسلام للذهبي ج١ ص ٣٧٤)

خدا جانے کہ سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ کو کن لوگوں کے سامنے اور کیوں یہ وضاحت کرنا پڑی ہوگی کہ اصل فتح کون سی ہے، اُن کے سالِ وفات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنہیں یہ وضاحت اُس دور میں کرنا پڑی ہوگی جب بعض طلقاء خود کو فتح مکہ کے بعد والے مجاہدین باور کراتے ہوں گے تا کہ سادہ لوگ اُنہیں بھی ہیرو سمجھنے پر مجبور ہوں۔ ہمارے اِس خیال کی صحت کی ایک دلیل تو سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ کا طلقاءِ بنو امیہ کے دورِ ملوکیت تک زندہ رہنا اور اُن کے دور کا مشاہدہ کرنا ہے، کیونکہ اُن کی وفات ۷۲ھ میں ہوئی تھی، اور دوسری دلیل حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ کا وہ تلخ تجربہ ہے جو اُنہیں شام کی سرزمین میں حاصل ہوا۔ امام طبرانی عبدالرحمان بن میسرہ سے روایت کرتے ہیں کہ اُنہوں نے بیان کیا:

مَرَّ بِالْمِقْدَادِ بْنِ الْأَسْوَدِ رَجُلٌ فَقَالَ: لَقَدْ أَفْلَحَتْ هَاتَانِ الْعَيْنَانِ رَأَتَا رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ، فَاجْتَمَعَ الْمِقْدَادُ غَضَبًا وَقَالَ: يَا أَيُّهَا النَّاسُ! لَا تَتَمَنَّوْا أَمْرًا قَدْ غَيَّبَهُ اللّٰهُ، فَكَمْ مِّمَّنْ قَدْ رَآهُ وَلَمْ يَنْتَفِعْ بِرُؤْيَتِهِ.

''سیدنا مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ کے قریب سے ایک شخص گذرا تو وہ کہنے لگا: اُن آنکھوں نے کامیابی پائی جو رسول اللہ ﷺ کی زیارت سے مشرف ہوئیں۔ اس پر سیدنا مقداد رضی اللہ عنہ انتہائی غضب ناک ہوئے اور فرمایا: لوگو! اُس امر کی تمنا مت کرو جسے اللہ تعالیٰ نے مخفی رکھا ہے، بہت سے لوگوں نے آپ ﷺ کو دیکھا لیکن اُنہوں نے آپ کے دیدار سے فائدہ نہ اٹھایا''۔

(مسند الشاميين للطبراني ج٢ ص ١٤٨، ١٤٩ حديث ١٠٨١؛ المعجم الكبير ج٢٠ ص ٢٥٨ حديث ٦٠٨؛ تاريخ دمشق (مفصلاً) ج٦٠ ص ١٨٠؛ مختصر تاريخ دمشق ج٢٥ ص ٢٢١)

بظاہر اُس آدمی کے جملہ میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی جس کو سبب غصہ سمجھا جائے، لیکن چونکہ اُس دور کے لوگوں کے سامنے بعض طلقاء نے خود کو غیر معمولی طور پر چڑھا رکھا تھا اِس لیے وہ اس انداز میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے تھے۔ حضرت مقداد رضی اللہ عنہ چونکہ ایسی حیرت وتعجب کے پس پردہ چال سے آشنا ہو چکے تھے اِس لیے وہ نہ صرف یہ کہ غضبناک ہوئے بلکہ ساتھ ہی "فَكَمْ مِمَّنْ قَدْ رَآهُ وَلَمْ يَنْتَفِعْ بِرُؤْيَتِهِ" کے الفاظ سے اُن سرداروں پر تعریض وطنز بھی فرما دی جو صحابیت کے ٹائٹل سے ناجائز فوائد تو حاصل کرتے تھے مگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اُسوہ حسنہ سے محروم تھے۔ فی الجملہ یہ کہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے ایک خاص دور میں وضاحت فرما دی تھی کہ اصل فتح صلحِ حدیبیہ کی فتح تھی۔

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے نزدیک بھی فتح مبین سے مراد صلح حدیبیہ کی فتح ہے۔ چنانچہ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے سورۃ الفتح کی پہلی آیت تلاوت کی اور پھر فرمایا: یہ حدیبیہ کی فتح ہے"۔

(بخاري: كتاب التفسير، باب سورة الفتح، ص ٦٨٥ حديث ٤٨٣٤؛ دلائل النبوة للبيهقي ج ٤ ص ١٥٧)

اوپر ہم سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کر چکے ہیں کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کی صلح کو فتح فرمایا ہے، اسی طرح حضرت مجمع بن جاریہ نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ صلح حدیبیہ فتح ہے۔

(دلائل النبوة للبيهقي ج ٤ ص ١٥٧)

نیز حضرت عروہ نے متعدد صحابہ سے نقل کیا ہے کہ لوگوں نے حدیبیہ کے دن کہا: ہمیں مکہ جانے سے روک دیا گیا، لہٰذا صلح حدیبیہ کوئی فتح نہیں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات پہنچی تو آپ نے فرمایا:

بِئْسَ الْكَلَامُ! هٰذَا أَعْظَمُ الْفَتْحِ.

"بری بات! یہ عظیم ترین فتح ہے"۔

(دلائل النبوة للبيهقي ج ٤ ص ١٦٠؛ تاريخ الإسلام للذهبي ج ١ ص ٣٩٧؛ الدر المنثور ج ١٣ ص ٤٥٩)

امام صالحی شامی لکھتے ہیں:

وَكَانَ أَبُوبَكْرٍ ﷺ يَقُولُ: مَا كَانَ فَتْحٌ فِي الْإِسْلَامِ أَعْظَمَ مِنْ صُلْحِ الْحُدَيْبِيَةِ.

''سیدنا ابوبکرؓ فرمایا کرتے تھے: اسلام میں صلح حدیبیہ سے بڑھ کر کوئی فتح نہیں ہے''۔

(سبل الهدى والرشاد ج٥ ص٦٤)

سیدنا جابر بن عبداللہؓ کے نزدیک تو صلح حدیبیہ کے علاوہ فتح کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ چنانچہ امام ابومنصور ماتریدی حنفی اور امام ابن جریر طبری وغیرہما لکھتے ہیں:

وَعَنْ جَابِرٍ أَنَّهُ قَالَ: مَا كُنَّا نَعُدُّ الْفَتْحَ إِلَّا يَوْمَ الْحُدَيْبِيَةِ.

''سیدنا جابرؓ فرماتے ہیں: ہم یوم حدیبیہ کے علاوہ کسی چیز کو فتح شمار ہی نہیں کرتے تھے''۔

(تأويلات أهل السنة للماتريدي ج٩ ص١٩١؛ جامع البيان ج٢١ ص٢٤٢؛ تفسير ابن كثير ج٧ ص٣٢٥)

غور کیا جائے تو درحقیقت یہ تفسیرِ قرآن بالقرآن ہے، چنانچہ علامہ ابن عاشور کے درج ذیل کلام سے بھی اِس حقیقت کی تائید ہوتی ہے۔ وہ سورۃ الحدید کی آیت نمبر ۱۰ کی تفسیر میں متعدد اقوال نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

وَقِيلَ الْمُرَادُ بِالْفَتْحِ: صُلْحُ الْحُدَيْبِيَةِ، وَهٰذَا قَوْلُ أَبِي سَعِيدِ الْخُدْرِيِّ ﷺ، وَالزُّهْرِيِّ، وَالشَّعْبِيِّ، وَعَامِرِ بْنِ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ، وَاخْتَارَهُ الطَّبْرِيُّ. وَيُؤَيِّدُهُ مَا رَوَاهُ الطَّبْرِيُّ عَنْ أَبِي سَعِيدِ الْخُدْرِيِّ: أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ تَلَا هٰذِهِ الْآيَةَ عَامَ الْحُدَيْبِيَةِ، وَهُوَ الْمُلَائِمُ لِكَوْنِ هٰذِهِ السُّورَةِ بَعْضُهَا مَكِّيٌّ وَبَعْضُهَا مَدَنِيٌّ فَيَقْتَضِي أَنَّ مَدَنِيَّهَا قَرِيبُ عَهْدٍ مِنْ مُدَّةِ إِقَامَتِهِمْ بِمَكَّةَ، وَإِطْلَاقُ الْفَتْحِ عَلٰى صُلْحِ الْحُدَيْبِيَةِ وَارِدٌ فِي قَوْلِهِ تَعَالٰى: ﴿إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا﴾.

''ایک قول یہ ہے کہ فتح سے مراد صلح حدیبیہ ہے، اور یہ حضرت ابوسعید خدری،

زہری، شعبی اور عامر بن سعد بن ابی وقاص ﷺ کا قول ہے، اور امام ابن جریر طبری نے اِسی کو اختیار کیا ہے، اور اس تفسیر کی تائید اُس حدیث سے ہوتی ہے جو امام طبری نے از ابوسعید خدری ﷺ روایت فرمائی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت حدیبیہ کے سال تلاوت فرمائی، اور یہ تفسیر اس بات سے بھی مناسبت رکھتی ہے کہ اِس سورت کا کچھ حصہ مکی ہے اور کچھ مدنی۔ پھر اس کا مدنی ہونا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ یہ مسلمانوں کی مکہ مکرمہ میں مدتِ اقامت کے قریب کے دور میں نازل ہوئی، اور صلح حدیبیہ پر فتح کا اطلاق اِس ارشادِ الٰہی میں بھی وارد ہوا ہے: ﴿بیشک ہم نے آپ کو کھلم کھلا فتح عطا فرمادی﴾"۔

(التحریر والتنویر لابن عاشور ج۲۷ ص ۳۷٤)

مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب نے بھی یہی تفسیر کی ہے، حتیٰ کہ اُنہوں نے جس ترجمۂ قرآن پر حاشیہ لکھا ہے اُس کے مترجم (مولانا محمود الحسن صاحب) سے بھی اختلاف کر دیا ہے۔ غالباً مترجم نے شہرت کی پیروی میں آیت مبارکہ کے اِس ٹکڑے کا ترجمہ یوں کیا ہے:

لَا يَسْتَوِيْ مِنكُمْ مَّنْ أَنفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ.

"برابر نہیں تم میں جس نے کہ خرچ کیا فتح مکہ سے پہلے"۔

(الحدید: ۱۰)

اِس پر علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب نے حاشیہ میں نمبر۲ کے تحت لکھا ہے:

"اور بعض نے فتح سے مراد صلح حدیبیہ لی ہے اور بعض روایات سے اسی کی تائید ہوتی ہے"۔

(تفسیر عثماني ج۳ ص ٦٢٧)

سو جب اصل فتح صلح حدیبیہ کی فتح ہے تو پھر آیت میں جن لوگوں کی فضیلت کا ذکر ہے اُن سے وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے حدیبیہ کی صلح سے قبل اور فتح مکہ سے پہلے راہِ الٰہی میں خرچ کیا اور جہاد کیا، لہٰذا اس

فضیلت میں فتح مکہ کے بعد مجبوراً مسلمان ہونے والے لوگوں کو شامل سمجھنا عدم تدبر کا نتیجہ اور حلوائی کی دکان پر نانا جی کی فاتحہ کے مترادف ہے۔

خیال رہے کہ فتح مکہ کے بعد جن اہل مکہ نے مجبوراً اسلام قبول کیا تھا اُنہیں طلقاء کہا جاتا ہے، اور طلقاء بعد والے غزوات میں جہاد تو کیا کرتے اُلٹا شکست کا سبب بنے تھے۔ چنانچہ غزوۂ حنین میں سب سے پہلے پشت پھیر کر بھاگنے والے لوگ طلقاء تھے، دوسرے لوگ بھی اُنہیں بھاگتا دیکھ کر میدان چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اِس کی مدلل و مکمل تفصیل کے لیے راقم الحروف کی کتاب "**الصحابۃ والطلقاء**" کا مطالعہ انتہائی مفید ثابت ہوگا۔

﴿وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى، الخ﴾ کی حیران کن تفسیر

بعض علماءِ ہند لکھتے ہیں:

> "اللہ عزوجل نے تمام صحابہ سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ (وآلہ) وسلم کو قرآن عظیم میں دو قسم کیا: مومنین قبل فتح مکہ و مومنین بعد فتح۔ اول کو دوم پر تفضیل دی اور صاف فرمادیا: ﴿وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى﴾ سب سے اللہ نے بھلائی کا وعدہ فرمالیا اور ساتھ ہی اُن کے افعال کی تفتیش کرنے والوں کا منہ بند فرمادیا ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ﴾ (اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کرنے والے ہو) بااین ہمہ وہ تم سب سے بھلائی کا وعدہ فرما چکا پھر دوسرا کون ہے کہ اُن میں سے کسی کی بات پر طعن کرے"۔

(فتاویٰ رضویہ ج۲۹ ص۳۳۶)

بعض علماء ہند سطورِ بالا سے قبل یہ بھی لکھ چکے ہیں:

> "پھر اُن کے بعد کچھ لوگ آئیں گے جن کو اللہ تعالیٰ ناک کے بل جہنم میں اوندھا کردے گا) یہ وہ ہیں جو اُن لغزشوں کے سبب صحابہ پر طعن کریں گے"۔

(فتاویٰ رضویہ ج۲۹ ص۳۳۶)

یہ سب کچھ وہ بے دھیانی میں لکھ گئے، اُنہیں معلوم نہیں کہ جن صاحب کا وہ دفاع کر رہے ہیں اُن پر

قطعی جنتی ہستیاں بھی طعن فرما چکی ہیں، جیسا کہ ہم سیدنا علی، سیدنا عمار بن یاسر، ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ اور ام المومنین سیدہ ام سلمہ ﷺ کے حوالے سے لکھ چکے ہیں۔ نیز تابعین اور مذاہب اربعہ کے فقہاء و متکلمین کی ایسی عبارات بھی نقل کی جا چکی ہیں جن میں فاضل بریلی کے ممدوح کو امامِ ضلالت، فاسق، ظالم، جائر اور بدعتی وغیرہ تک کہا گیا ہے، حتیٰ کہ امام ابو منصور ماتریدی رحمۃ اللہ علیہ کی بعض عبارات میں اُن کے قدریہ ہونے کا اشارہ بھی ملتا ہے، ان شاء اللہ امام ماتریدی کی عبارت ہم اپنی کتاب "الفئة الباغية" میں درج کریں گے۔ بتایئے! یہ طعن ہے یا حقیقت؟ اگر یہ طعن ہے تو کیا اِن سب طاعنین کو اللہ تعالیٰ ناک کے بل جہنم میں اوندھا کر دے گا؟

فی الجملہ یہ کہ فاضل بریلی کا درجِ ذیل جملہ:

> "سب سے اللہ نے بھلائی کا وعدہ فرما لیا اور ساتھ ہی اُن کے افعال کی تفتیش کرنے والوں کا منہ بند فرما دیا ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ﴾ (اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کرنے والے ہو) با ایں ہمہ وہ تم سب سے بھلائی کا وعدہ فرما چکا پھر دوسرا کون ہے کہ اُن میں سے کسی کی بات پر طعن کرے"۔

(فتاویٰ رضویہ ج۲۹ ص۳۳۶)

کتاب وسنت دونوں کے خلاف ہے، اس لیے کہ سورۃ الحدید فتح مکہ سے قبل نازل ہوئی، اور اگر اِس کا نزول فتح مکہ کے بعد ہی مان لیا جائے تو تب بھی آٹھ (۸) ہجری سے لے کر کم از کم ساٹھ (۶۰) ہجری تک سب صحابہ کہلانے والوں کو جنتی ماننا ہوگا، اور اُن سے گذشتہ نصف صدی میں جو کچھ ہوتا رہا سب معاف ماننا ہوگا۔ اس صورت میں حضرت عثمان ﷺ کے قاتلین میں سے بعض سرغنوں کو بھی جنتی ماننا ہوگا، کیونکہ وہ بھی فتح مکہ کے بعد اسلام لانے والوں میں سے تھے بلکہ بعض تو بیعتِ رضوان میں بھی شامل تھے، جیسا کہ عبد الرحمان بن عدیس۔ اسی طرح سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کا قاتل ابو الغادیہ جہنی بھی صحابی تھا، اُسے بھی جنتی ماننا ہوگا حالانکہ صحیح حدیث میں ہے:

قَاتِلُ عَمَّارٍ وَسَالِبُهُ فِي النَّارِ.

''عمار کا قاتل اور اُن کا سامان لوٹنے والا آگ میں ہے''۔

(المستدرك، كتاب معرفة الصحابة، ذكر شهادة عمار بن ياسر رضی اللہ عنہ ج۳ ص۳۸۷؛ سلسلة الأحاديث الصحيحة للألباني ج۵ ص۱۸، ۱۹ حديث۲۰۰۸؛ عمار بن ياسر رضی اللہ عنہ رجل المحنة وميزان الفتنة، لأسامة بن أحمد ص۱۸۵، ۱۸۶)

نوٹ:

ابوالغادیہ کے دفاع میں بعض نامور محدثین سے سنگین غلطی ہوئی ہے، ان شاء اللہ ہم اُن کی غلطی پر اپنی کتاب ''الفئة الباغية'' میں کلام کریں گے۔

طلقاء کو بھی مکمل مستقبل معاف؟

بعض متأخرینِ ہند خصوصاً جس صاحب کی خاطر یہ پاپڑ بیلتے رہے وہ صاحب فتح مکہ کے بعد جب مجبوراً مسلمان ہوئے تو مسجد یا کسی حجرہ کے کونے میں بیٹھ کر محض عبادت و ریاضت ہی نہیں کرتے رہے بلکہ وہ بیس سال تک گورنر رہے اور پھر بیس سال تک مطلق العنان بادشاہ بھی رہے۔ اِس عرصہ میں اُنہوں نے کیا کیا کیا؟ ذرا ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ مولا علی علیہ السلام کے مدمقابل آ کر جنگ کی اور اُن کے ساتھ جنگ کو آقا کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ساتھ جنگ قرار دیا تھا۔

۲۔ ہزاروں لوگوں کے علاوہ سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو بھی قتل کیا اور سیدنا عمار رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا کہ اُنہیں کپڑوں سمیت دفن کیا جائے وہ قیامت کے دن معاویہ کے بارے میں بارگاہِ الٰہی میں احتجاج کریں گے۔

۳۔ سیدنا حجر بن عدی رضی اللہ عنہ اور اُن کے ہم نواؤں کو باندھ کر ناحق قتل کیا، اُنہوں نے بھی سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی طرح وصیت فرمائی تھی کہ اُنہیں زنجیروں اور کپڑوں سمیت دفن کیا جائے، کیونکہ وہ قیامت کے دن معاویہ کے خلاف بارگاہِ الٰہی میں احتجاج کریں گے۔

۴۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ ہی کی خلافت کے دوران بسر بن ابی ارطاۃ جو کہ طلقاء میں سے تھا، کی کمان میں مکہ

مکرمہ اور مدینہ منورہ پر حملہ کیا اور وہاں کے باشندوں کو قتل کیا اور خوف زدہ کیا، اور یقیناً اِن بلدین مکرمین کے باشندوں کو حراساں کرنے کے وبال وعذاب سے اعلیٰ حضرتؒ بے خبر نہیں ہوں گے۔

۵۔ اسی بسر بن ابی ارطاۃ کے ذریعے یمن پر حملے کیے اور وہاں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کے نابالغ بھتیجوں کو قتل کیا، جس سے بنو ہاشم اور خصوصاً سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو اذیت پہنچی، اور حدیث شریف میں ہے: ''مَنْ آذیٰ عَلِیًّا فَقَدْ آذَانِيْ'' (جس نے علی کو اذیت پہنچائی تو اُس نے مجھے اذیت پہنچائی) [المستدرك ج۳ص ۱۲۱؛ مجمع الزوائد ج۹ص ۱۲۹)

۶۔ بسر بن ابی ارطاۃ کے اُنہی حملوں میں مسلم اور آزاد خواتین کو لونڈی بنا کر بازار میں برائے فروخت کھڑا کیا گیا۔

۷۔ سیدنا علی اور اہل بیت کرام علیہم السلام کے دوسرے حضرات پر منبروں پر سب وشتم کیا گیا۔

۸۔ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے ساتھ جو شرائط طے کیں اُنہیں پورا نہ کیا۔

۹۔ کھلم کھلا عہد شکنی کی اور عہد شکن کے بارے میں آیات واحادیث سے کون واقف نہیں؟

۱۰۔ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی شہادتِ فاجعہ کو مصیبت نہ سمجھا اور جس نے اُس شہادتِ عظیمہ کو مصیبت سمجھ کر اُس پر ''اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ'' پڑھا اُس پر اُلٹا تعجب کیا۔

۱۱۔ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کو اُن کے سامنے ''جَمْرَةٌ'' (انگارہ) کہا گیا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے بلکہ اُلٹا اُس بکواس کرنے والے کو پیسے دیے۔

۱۲۔ اُن کے روبرو بدبخت ابن یامین نے کعب بن اشرف کے قتل کے معاملہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف غداری کی نسبت کی تو وہ خاموش رہے۔

۱۳۔ سودی معاملہ کیا، اور اس سلسلے میں جب اُنہیں حدیث پیش کی گئی تو کہنے لگے: ''مَا أَرٰی بِمِثْلِ هٰذَا بَأْسًا'' (میں تو اِس جیسے معاملہ میں کوئی حرج نہیں سمجھتا)۔

۱۴۔ انصار رضی اللہ عنہم پر دوسرے لوگوں کو ترجیح دی، اِس پر انصار رضی اللہ عنہم نے فرمایا: ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اِس قسم کے ترجیحی سلوک کی پیش گوئی فرمائی تھی اور فرمایا تھا: تم صبر کرنا۔ اِس پر موصوف نے طنزاً کہا: پھر تم کرو نہ

صبر۔

۱۵۔ رشوت اور دھونس دھمکیوں کے ذریعے یزید پلید کو اُمت پر مسلط کر کے قیامت تک کے لیے امت کو انتشار و افتراق سے دوچار کر دیا۔

اِن تمام باتوں کی تفصیل مع حوالہ جات ہماری کتاب "**الأحاديث الموضوعة في فضائل معاوية**" میں ملاحظہ فرمائی جائے۔

یقیناً بادشاہوں سے اُن کے دور میں اچھے کام بھی ہوتے ہیں لیکن کیا کسی بادشاہ سے مذکورہ بالا تمام مظالم اور اعمالِ سیۂ سرزد ہوئے ہوں تو اُس سے فقط اس لیے باز پرس نہیں ہوگی کہ وہ صحابی تھا؟ اگر کسی مقتدر صحابی کا دوسرے صحابہ اور تابعین پر ہر طرح کا ظلم معاف اور جنت اُس کے لیے واجب تو کیا پھر شریعت کا قانون فقط غیر صحابہ کے لیے ہے؟ بے ادبی معاف! ایسا اندھا نظام ہند و پاک کا تو ہو سکتا ہے مگر شریعتِ مصطفیٰ ﷺ میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔

کتاب وسنت کے منافی تفسیر

یاد رکھیے گا! کسی بھی غزوہ میں خرچ کرنے، جہاد کرنے، مقتول ہونے یا غازیانہ شان سے گھر لوٹ آنے والوں کو مطلقاً مغفور نہیں فرمایا گیا، ماسوا غزوہ بدر کے غازیوں کے۔ بعض علماء نے تو بعض بدری صحابہ پر بھی نفاق کی تہمت لگا دی ہے، جیسا کہ معتب بن قشیر انصاری، لہٰذا جو لوگ ﴿وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى الخ﴾ سے استدلال کرتے ہوئے قبل از فتح اور بعد از فتح کے تمام صحابہ کو جنتی قرار دیتے ہیں وہ کتاب وسنت پر جرأت کرتے ہیں۔ یہاں ہم چند احادیث کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن میں غور فرما کر آپ خود ہی یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ واقعی یہ جسارت ہے۔ امام بخاری حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں:

> "ایک شخص نبی کریم ﷺ کے سامان پر معین تھا، اُسے کرکرہ کہا جاتا تھا، اُس کا انتقال ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: وہ آگ میں ہے۔ لوگوں نے جا کر اُس کو غور سے دیکھا تو اُنہیں ایک چادر ملی جو اُس نے چرائی تھی"۔

(بخاري: كتاب الجهادوالسير، باب الغلول، ص ٤١٥ حديث ٣٠٧٤)

خیال رہے کہ اِس حدیث میں اُس شخص کے کافر ہونے کا ذکر نہیں ہے۔ چنانچہ اس سے پہلی حدیث میں ہے کہ آقائے کائنات ﷺ نے تمام صحابہ کرام ؓ کو فرمایا:

''مجھے تمہارا اِس حال میں ملنا پسند نہیں کہ تم میں سے کسی کی گردن پر بکری میماتی ہوئی سوار ہو یا گھوڑا گردن پر سوار ہو اور وہ مجھ سے عرض کرے:

يَارَسُوْلَ اللّٰهِ أَغِثْنِيْ، فَأَقُوْلُ لَا أَمْلِكُ لَكَ شَيْئًا قَدْ أَبْلَغْتُكَ.

''یارسول اللہ! میری مدد فرمایئے: تو میں کہوں گا: میں تیرے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا، میں تجھے تبلیغ کر چکا ہوں''۔

(بخاري: كتاب الجهاد والسير، باب الغلول، ص ٤١٥ حديث ٣٠٧٣)

ایک اور حدیث میں ہے:

''غزوۂ خیبر کے بعد جب وادیٔ قریٰ میں پہنچے تو ایک صحابی جس کو مدعم کہا جاتا تھا، اُسے کہیں سے ایک تیر آ لگا تو لوگوں نے کہنا شروع کر دیا: ''هَنِيْئًا لَهُ الشَّهَادَةُ'' (اُس کو شہادت مبارک ہو) اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قسم اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، بلکہ جو چادر اُس نے خیبر کے روز مالِ غنیمت سے تقسیم کے بغیر لے لی تھی وہ اس پر آگ بن کر بھڑکے گی''۔

(بخاري، كتاب المغازي، باب غزوة خيبر، حديث ٤٢٣٤)

اِس حدیث میں صاف ظاہر ہے کہ وہ شخص مسلمان اور صحابی تھا، اگر وہ مسلمان نہ ہوتا تو صحابہ کرام ؓ اُس کے حق میں ''هَنِيْئًا لَهُ الشَّهَادَةُ'' کے الفاظ استعمال نہ فرماتے اور اگر وہ مسلمان نہ ہوتا تو نبی کریم ﷺ بھی اس بات کی وضاحت فرما دیتے، جیسا کہ ایک اور حدیث میں وضاحت فرمادی تھی۔ چنانچہ بخاری شریف میں ہے:

''کسی جنگ میں ایک شخص نے انتہائی بہادری سے جہاد کیا تو صحابہ کرام ؓ نے اُس کی تعریف کی۔ آقا نے فرمایا: جہنم کی طرف بڑھ رہا ہے۔ بالآخر زخموں کی تاب نہ

لا کر اُس نے خودکشی کر لی۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لوگوں میں اعلان کر دو:

إِنَّهُ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ إِلَّا نَفْسٌ مُسْلِمَةٌ.

''مسلم شخص کے علاوہ کوئی انسان جنت میں داخل نہیں ہوگا''۔

(بخاري، كتاب الجهاد والسير، باب: إن الله ليؤيد الدين بالرجل الفاجر، حديث ٣٠٦٢)

سو جب قبل از فتح والوں کے لیے کلیۃً مغفور ہونے کا قول احادیث کے منافی ہے تو پھر بعد از فتح والوں کے لیے کیونکر درست ہو سکتا ہے، جب ایک چادر کی چوری صحابی کو جہنم میں لے گئی تو پھر قتلِ ناحق اور مسلسل بیس برس تک شاہانہ اونچ نیچ کا کوئی حساب نہیں ہوگا؟ اصحابِ بدر ﷺ کے علاوہ اگر دوسرے صحابہ بھی یکسر حساب و کتاب سے مستثنیٰ ہوتے تو پھر امہات المومنین کو ﴿يُضَاعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ﴾ اور ﴿نُؤْتِهَآ أَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ﴾ [الأحزاب: ٣٠، ٣١] آیات کیوں سنائی جاتیں؟

تفسیرِ رضوی سے اکابر صحابہ و تابعین ﷺ کی بے خبری

معاویہ بن صخر کی بیجا حمایت میں بعض متاخرینِ ہند نے سورۃ الحدید کی آیت نمبر دس کی جو یوں تفسیر کی ہے:

> ''سب سے اللہ نے بھلائی کا وعدہ فرما لیا اور ساتھ ہی اُن کے افعال کی تفتیش کرنے والوں کا منہ بند فرما دیا ''وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ'' (اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کرنے والے ہو) باایں ہمہ وہ تم سب سے بھلائی کا وعدہ فرما چکا پھر دوسرا کون ہے کہ اُن میں سے کسی کی بات پر طعن کرے''۔

(فتاویٰ رضویہ ج۲۹ ص۳۳۶)

اِس تفسیر کو پڑھنے کے بعد یوں معلوم ہوتا ہے کہ اکابر صحابہ و تابعین ﷺ فہمِ قرآن سے محروم تھے، حتیٰ کہ ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بلکہ مولا علی ﷺ کی فہم کی رسائی بھی وہاں تک نہ ہو سکی جہاں تک ہمارے اعلیٰ حضرت کی فہم پہنچی، بلکہ معاذ اللہ یہ معاملہ نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس تک بھی پہنچتا ہے۔ وہ کیسے؟ اِس کی تفصیل ہم سطورِ ذیل میں پیش کر رہے ہیں۔ پہلے ہم یہ بیان کریں گے کہ اِس تفسیر سے

بعض تابعین کی (معاذ اللہ) کم فہمی کیسے ثابت ہوتی ہے، پھر بعض صحابہ کی، پھر اُم المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ اور امیر المومنین مولیٰ علی علیہ السلام تک اس کا اثر پہنچتا ہوا دِکھلائیں گے اور آخر میں خاکم بدہن یہ واضح کریں گے کہ اگر اِس تفسیر کو درست مانا جائے تو معاذ اللہ آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں بھی یہ تأثر پیدا ہوگا کہ آپ بھی قرآن مجید کو سمجھنے سے قاصر رہے۔

امام حسن بصری رضی اللہ عنہ کی بے خبری

سب سے پہلے اُس ہستی کا اِس تفسیر بے خبر ہونا ملاحظہ فرمائیں جو تصوف کے تمام سلاسلِ طریقت میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے، یعنی امام حسن بصری رضی اللہ عنہ وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ سیدنا حجر بن عدی رضی اللہ عنہ کے قاتل کے لیے ہلاکت ہوگی۔ چنانچہ امام ابن عبد البر اور دوسرے حضرات مبارک بن فضالہ سے روایت کرتے ہیں کہ اُنہوں نے فرمایا:

سَمِعْتُ الْحَسَنَ يَقُوْلُ: وَ قَدْ ذَكَرَ مُعَاوِيَةَ وَقَتْلَهُ حُجْرًا وَّ أَصْحَابَهُ: وَيْلٌ لِّمَنْ قَتَلَ حُجْراً وَأَصْحَابَ حُجْرٍ.

”میں نے حسن بصری رضی اللہ عنہ کو سنا، جبکہ اُنہوں نے معاویہ کے تذکرہ میں اُس کا حجر بن عدی اور اُن کے ساتھیوں کو قتل کرنا بیان کیا تو فرمایا: حجر بن عدی اور اُن کے اصحاب رضی اللہ عنہم کے قاتل کے لیے ہلاکت ہے“۔

(الاستيعاب في معرفة الأصحاب ج۱ ص۱۹۹؛ بغية الطلب ج۵ ص۲۱۱۱؛ أنساب الأشراف للبلاذري ج۵ ص۲۷۳)

ظاہر ہے کہ سیدنا حجر بن عدی اور اُن کے رفقاء رضی اللہ عنہم کا قاتل معاویہ بن صخر تھا، سو اگر حضرت امام حسن بصری رضی اللہ عنہ کو سورۃ الحدید کی آیت نمبر دس کی ایسی تفسیر معلوم ہوتی تو وہ سیدنا حجر بن عدی رضی اللہ عنہ کے قاتل کے لیے ہلاکت کا قول نہ کرتے۔ کیونکہ وہ قاتل تو صحابی تھا اور صحابہ تو قبل از فتح والے ہوں یا بعد از فتح والے سب کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کا وعدہ فرما چکا ہے، پھر دوسرا کون ہے کہ اُن میں سے کسی کی بات پر طعن کرے؟ لیکن امام حسن بصری رضی اللہ عنہ معاذ اللہ اِس تفسیرِ بے نظیر سے اِس حد تک بے خبر تھے کہ وہ نہ صرف یہ کہ

قتلِ حجر بن عدی رضی اللہ عنہ پر طعن اور ہلاکتِ معاویہ کا ذکر کرتے بلکہ وہ اُن کی دوسری زیادتیوں کو بھی شامل کر لیتے تھے۔ چنانچہ متعدد علماء کرام لکھتے ہیں کہ وہ فرمایا کرتے تھے:

أَرْبَعُ خِصَالٍ كُنَّ فِي مُعَاوِيَةَ ، لَوْلَمْ يَكُنْ فِيْهِ مِنْهُنَّ إِلَّا وَاحِدَةٌ لَكَانَتْ مُوْبِقَةً: اِنْتِزَاءُهُ عَلٰى هٰذِهِ الْأُمَّةِ بِالسُّفَهَاءِ حَتّٰى ابْتَزَّهَا أَمْرَهَا بِغَيْرِ مَشْوَرَةٍ مِنْهُمْ وَفِيْهِمْ بَقَايَا الصَّحَابَةِ وَذُو الْفَضِيْلَةِ ، وَاسْتِخْلَافُهُ ابْنَهُ بَعْدَهُ سِكِّيْرًا خَمِيْرًا ، يَلْبَسُ الْحَرِيْرَ وَيَضْرِبُ بِالطَّنَابِيْرِ ، وَإِدِّعَاءُهُ زِيَادًا ، وَقَدْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ، وَلِلْعَاهِرِ الْحَجَرُ ، وَقَتْلُهُ حُجْرًا ، وَيْلًا لَهُ مِنْ حُجْرٍ مَرَّتَيْنِ.

''چار باتیں معاویہ میں تھیں، اگر اُن میں سے فقط کوئی ایک بات بھی اُن میں ہوتی تو وہ اُن کی ہلاکت کے لیے کافی ہوتی:

۱۔ اُن کا اُمت پر بلا مشورہ بے وقوف لوگوں کو چڑھا دینا، یہاں تک کہ اُنہوں نے اُمت کا حق زبردستی چھین لیا، جبکہ اُمت میں بقایا صحابہ رضی اللہ عنہم اور اربابِ فضیلت بھی موجود تھے۔

۲۔ اُن کا اپنے بعد اپنے نشئی اور شرابی بیٹے کو خلیفہ بنانا، وہ ریشم پہنتا تھا اور مزامیر بجاتا تھا۔

۳۔ اُن کا زیاد ابن ابیہ کو ابو سفیان کا بیٹا بنا دینا، جبکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: بچہ شوہر کا ہوتا ہے اور زانی کے لیے پتھر ہوتے ہیں۔

۴۔ اور اُن کا سیدنا حجر بن عدی رضی اللہ عنہ کو قتل کرنا، حجر بن عدی رضی اللہ عنہ کی وجہ سے اُن کے لیے دوہری ہلاکت ہے''۔

(تاریخ الرسل والملوك والأمم ج٥ ص٢٧٩؛ مرآة الزمان ج٧ ص٢٣٨؛ الكامل فی التاريخ ج٣ ص٨٢؛ البداية والنهاية ج١١ ص٤٢٨)

کاش! امام حسن بصری ﷺ کو ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ﴾ کی مذکورہ بالا تفسیرِ رضوی معلوم ہوتی تو وہ ایک صحابی کے لیے ہلاکت کا قول نہ کرتے اور اُن پر طعن سے محفوظ رہتے۔

سیدنا حجر بن عدی رضی اللہ عنہ کی بے خبری

خود سیدنا حجر بن عدی ﷺ بھی امام حسن بصری ﷺ کی طرح مذکورہ تفسیر سے بے خبر تھے، چونکہ وہ اِس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ وہ قیامت کے دن معاویہ بن ابی سفیان سے بدلہ لیں گے۔ چنانچہ اُنہوں نے اپنی شہادت سے قبل بایں الفاظ وصیت فرمائی تھی:

لا تُطْلِقُوْا عَنِّيْ حَدِيْدًا ، وَلَا تَغْتَسِلُوْا عَنِيْ دَماً ، فَإِنِّيْ مُلَاقٍ مُعَاوِيَةَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلَى الْجَادَةِ ، وَإِنِّيْ مُخَاصِمٌ.

''بعداز وفات میرے جسم سے بیڑیاں نہ کھولنا، میرا خون نہ دھونا، کیونکہ میں میدانِ محشر میں اسی حال میں معاویہ سے ملوں گا اور احتجاج کروں گا''۔

(كتاب المحن للتميمي ص۱۲۳، ۱۲٤؛ أنساب الأشراف للبلاذري ج٥ ص۲٦۹؛ الاستيعاب ج۱ ص۱۹۸؛ أسد الغابة ج۱ ص٦۹۸؛ المنتظم لابن الجوزي ج٥ ص۲٤۲؛ تاريخ دمشق ج۱۲ ص۲۱٥، ۲۲٦، ۲۲۸؛ مرآة الزمان ج۷ ص۲۳۳، ۲۳٦؛ تاريخ الإسلام للذهبي ج٤ ص۱۹٤؛ سير أعلام النبلاء ج۳ ص٤٦٦؛ تاريخ ابن خلدون ج۳ ص۱۷؛ الإصابة ج۲ ص۳۲؛ بغية الطلب في تاريخ حلب ج٥ ص۲۱۱٤؛ المبسوط للسرخسي ج۲ ص۵۰، وج۱۰ ص۱۳۱؛ المحيط البرهاني لابن مازه ج۲ ص۱٦۱)

اگر اُنہیں فتاوی رضویہ میں کی گئی مذکورہ بالا تفسیر معلوم ہوتی کہ قبل از فتح مکہ اور بعداز فتح مکہ کے تمام کے تمام صحابہ کے ساتھ بھلائی کا وعدہ ہو چکا ہے تو وہ ایسی وصیت نہ فرماتے۔

سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی بے خبری

اسی طرح سابقون اولون صحابہ کرام ﷺ میں سے ایک عظیم صحابی سیدنا عمار بن یاسر ﷺ بھی اِس تفسیر

سے بے خبر تھے، کیونکہ اُنہوں نے بھی اپنی شہادت سے قبل اسی طرح وصیت فرمائی تھی۔ چنانچہ امام سرخسی حنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

وَلَمَّا اسْتُشْهِدَ عَمَّارُ بْنُ يَاسِرٍ بِصِفِّيْنَ قَالَ: لَا تَغْسِلُوْا عَنِّيْ دَمًا وَلَا تَنْزِعُوْا عَنِّيْ ثَوْبًا ، فَإِنِّيْ أَلْتَقِيْ مُعَاوِيَةَ بِالْجَادَةِ ، وَهٰكَذَا نُقِلَ عَنْ حُجْرِ بْنِ عَدِيٍّ.

''جب سیدنا عمار بن یاسر ﷛ جنگ صفین میں شہید ہونے لگے تو فرمایا: میرا خون نہ دھونا اور میرے کپڑے نہ اُتارنا، میں اسی حال میں معاویہ سے میدانِ محشر میں ملوں گا، اور ایسا سیدنا حجر بن عدی ﷛ سے بھی منقول ہے''۔

(المبسوط للسرخسي ج۲ ص ۵۰؛ الطبقات الکبریٰ لابن سعد ج۳ ص ۲۴۲، ۲۴۳؛ تاریخ دمشق لابن عساکر ج۴۳ ص ۴۷۹،۷۷؛ مختصر تاریخ دمشق ج۱۸ ص ۲۳۲)

کاش! اُنہیں معلوم ہوتا کہ قیامت کے دن کوئی شنوائی نہیں ہوگی، کیونکہ وہ جس کے خلاف قیامت کے دن احتجاج کا منصوبہ بنا رہے تھے اُس کے لیے تو پہلے ہی طے ہو چکا تھا کہ وہ فتح مکہ کے بعد جو کچھ بھی کرتا رہے گا اُس کے لیے ''حُسْنٰی'' (جنت) ہے تو وہ ایسی بیکار وصیت نہ کرتے۔ یہاں بطورِ خاص یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ سیدنا عمار بن یاسر ﷛ کے بارے میں آیا ہے کہ شہادت سے قبل اُن کی مبارک عقل کامل طور پر کام کر رہی تھی۔ چنانچہ امام ابن سعد اور دوسرے علماء کرام حبیب بن ابی ثابت سے سند کے ساتھ نقل کرتے ہیں کہ اُنہوں نے بیان کیا:

قُتِلَ عَمَّارٌ يَوْمَ قُتِلَ وَهُوَ مُجْتَمِعُ الْعَقْلِ.

''جس دن عمار بن یاسر شہید کیے گئے تو اُن کی عقل مکمل طور پر کام کر رہی تھی''۔

(الطبقات الکبریٰ لابن سعد ج۳ ص ۲۴۳؛ تاریخ دمشق ج۴۳ ص ۴۷۷؛ مختصر تاریخ دمشق ج ۱۸ ص ۲۳۲)

کیوں نہ اُن کی عقل مکمل کام کر رہی ہوتی جبکہ اُن کے حق میں زبانِ نبوی ﷺ سے ضمانت مل چکی

تھی کہ اللہ تعالیٰ اُنہیں شیطان سے محفوظ رکھے گا، لیکن افسوس کہ اُن کے سامنے ہمارے اعلیٰ حضرت کی کتب تھیں اور نہ ہی وہ مسلکِ اعلیٰ حضرت سے آگاہ تھے، اگر وہ مسلکِ رضا سے آگاہ ہوتے تو یقیناً سورۃ الحدید کی آیت نمبر دس [۱۰] کی مذکور الصدر تفسیر سے ضرور باخبر ہوتے اور لامحالہ مذکورہ بالا غلط وصیت سے باز رہتے۔

امام عالی مقام علیہ السلام کی بے خبری

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ سیدنا حجر بن عدی رضی اللہ عنہ نے اپنی شہادت سے قبل وصیت فرمائی تھی کہ اُنہیں زنجیروں کے ساتھ دفن کیا جائے تو لوگوں نے اُن کی وصیت پر عمل کیا۔ ابن کثیر لکھتے ہیں:

وَرُوِيَ أَنَّ الْحَسَنَ بْنَ عَلِيٍّ قَالَ: أَصَلُّوا عَلَيْهِ وَدَفَنُوا فِي قُيُودِهِ؟ قَالُوا نَعَمْ. قَالَ حَجَّهُمْ وَاللّٰهِ.

''روایت کیا گیا ہے کہ سیدنا امام حسن بن علی (بقول ابن کثیر: امام حسین) رضی اللہ عنہ نے پوچھا: کیا لوگوں نے اُس کی نماز جنازہ پڑھی اور اُنہوں نے اُن کو بیڑیوں کے ساتھ دفن کیا؟ اُنہوں نے عرض کیا: ہاں، فرمایا: خدا کی قسم! وہ حجت قائم کر گیا''۔

(البدایۃ والنہایۃ ج ۱۱ ص ۲۳۶؛ تاریخ دمشق ج ۱۲ ص ۲۲۶)

کس پر حجت قائم کر گیا؟ ظاہر ہے کہ اپنے قاتل پر، اور اُن کا قاتل معاویہ بن صخر تھا۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام عالی مقام سیدنا حسین رضی اللہ عنہ سورۃ الحدید کی آیت نمبر ۱۰ کی مذکورہ تفسیر سے بے خبر تھے، اگر اُنہیں یہ رضوی تفسیر معلوم ہوتی کہ فتح مکہ سے بعد والوں کے لیے جنت کا وعدہ ہو چکا ہے، خواہ وہ جو بھی کرتے رہیں تو وہ حجت قائم کرنے کی بات نہ فرماتے۔

اُم المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی بے خبری

متعدد محدثین وعلماء کرام لکھتے ہیں:

عَنْ أَبِي الْأَسْوَدِ قَالَ: دَخَلَ مُعَاوِيَةُ عَلٰى عَائِشَةَ فَقَالَتْ: مَا حَمَلَكَ

عَلٰی قَتْلِ أَهْلِ عَذْرَاءَ حُجْرٍ وَّأَصْحَابِهِ ؟ فَقَالَ: يَا أُمَّ الْمُؤْمِنِيْنَ! إِنِّي رَأَيْتُ قَتْلَهُمْ إِصْلَاحًا لِلْأُمَّةِ ، وَأَنَّ بَقَاءَ هُمْ فَسَادٌ ، فَقَالَتْ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: سَيُقْتَلُ بِعَذْرَاءَ نَاسٌ يَغْضِبُ اللّٰهُ لَهُمْ وَأَهْلُ السَّمَاءِ.

''حضرت ابوالاسود بیان کرتے ہیں کہ معاویہ اُم المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہاں حاضر ہوا تو اُنہوں نے فرمایا: تمہیں کس بات نے اہل عذراء حجر اور اُن کے ساتھیوں کے قتل پر اُبھارا؟ اُس نے عرض کیا: یا ام المومنین! میں نے اُن کے قتل میں امت کی اصلاح اور اُن کی بقاء میں امت کا فساد سمجھا تھا۔ ام المومنین نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا تھا: عنقریب عذراء کے مقام پر کچھ لوگ قتل کیے جائیں گے، اُن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اور اہل آسمان غضب ناک ہوں گے''۔

(المعرفة والتاريخ للفسوي ج۳ ص۴۱۷؛ دلائل النبوة للبيهقي ج٦ ص٤٥٧؛ تاريخ دمشق ج ١٢ ص ٢٢٧؛ البداية والنهاية ج٩ ص٢٢٦؛ الخصائص الكبرى ج٢ ص ٢٤٠؛ وط: بتحقيق خليل هراس، ج٢ ص ٥٠٠؛ سبل الهدى ج١٠ ص١٥٦؛ كنز العمال ج١١ ص١٢٦ حديث ٣٠٨٨٧ وص ١٩٤ حديث ٣١١٩٢ وج١٣ ص٥٨٨ حديث ٣٧٥١٠)

یقیناً اُم المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بھی مذکورہ تفسیر سے بے خبر تھیں، اگر وہ باخبر ہوتیں تو ایسی حدیث بیان نہ فرماتیں، کیونکہ جب قرآن میں آ گیا کہ فتح مکہ کے بعد انفاق اور جہاد کرنے والوں کے لیے بھی ''الحُسْنیٰ'' (جنت) کا وعدہ ہو چکا ہے تو پھر کیونکر تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ قرآن حکیم سے متضاد حدیث سنا کر اللہ تعالیٰ اور اہل آسمان کے غضب کا ذکر فرماتیں؟ ہائے افسوس! وہ قرآن کی صحیح تفسیر اور مسلکِ اعلیٰ حضرت سے بے خبر تھیں۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بے خبری

ام المومنین رضی اللہ عنہا کی طرح یہ حدیث صدر المفسرین سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے۔ چنانچہ امام فسوی اور دوسرے محدثین کرام عبداللہ بن رزین غافقی سے روایت کرتے ہیں کہ اُنہوں نے بیان کیا:

سَمِعْتُ عَلِيًّ بْنَ أَبِي طَالِبٍ يَقُوْلُ: يَا أَهْلَ الْعِرَاقِ سَيُقْتَلُ مِنْكُمْ سَبْعَةُ نَفَرٍ بِعَذْرَاءَ ، مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ أَصْحَابِ الْأُخْدُوْدِ ، فَقُتِلَ حُجْرُ بْنُ عِدِيٍّ وَأَصْحَابُهُ.

میں نے سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو بیان کرتے ہوئے سنا: اے اہل عراق! عنقریب تم میں سے سات افراد کو عذراء کے مقام پر قتل کیا جائے گا، اُن کی مثال ایسی ہے جیسی "أصحاب الأخدود" کی، پس سیدنا حجر بن عدی اور اُن کے ساتھی رضی اللہ عنہم قتل کیے گئے"۔

(المعرفة التاريخ للفسوي ج٣ ص٤١٦؛ تاريخ دمشق ج١٢ ص٢٢٧)

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

قُلْتُ: عَلِيٌّ رضي الله عنه لا يَقُوْلُ مِثْلَ هٰذَا إِلَّا بِأَنْ يَّكُوْنَ سَمِعَهُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ ، وَقَدْ رُوِيَ عَنْ عَائِشَةَ بِإِسْنَادٍ مُرْسَلٍ مَرْفُوْعًا.

"میں کہتا ہوں: سیدنا علی رضی اللہ عنہ ایسی بات نہیں کہہ سکتے ماسوا اس کے کہ اُنہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہو، اور بیشک ایسا سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بھی مرسل سند کے ساتھ مرفوعاً روایت کیا گیا ہے"۔

(دلائل النبوة للبيهقي ج٦ ص٤٥٦)

حافظ ابن کثیر، امام سیوطی اور علامہ علی متقی ہندی نے امام بیہقی کے قول کو مقرر رکھا ہے:

البداية والنهاية ج٩ ص٢٢٥؛ الخصائص الكبرى ج٢ ص٢٤١؛ وط: بتحقيق خليل هراس، ج٢ ص٥٠١؛ كنز العمال ج١٢ ص٤٠٥ حديث ٣٥٤٣٧)

ہر چند کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ بابُ مدینۃ العلم تھے، صدر المفسرین تھے، سَلُوْنِيْ قَبْلَ أَنْ تَفْقِدُوْنِيْ (اس سے قبل کہ مجھے نہ پاؤ مجھ سے سوال کرلو) کا دعویٰ کرنے والے تھے اور قرآن مجید کے علم ظاہر و باطن کے عالم تھے مگر اس سب کچھ کے باوجود سورۃ الحدید کی آیت نمبر دس کی رضوی تفسیر سے بے خبر تھے۔ اگر باخبر ہوتے تو

سیدنا حجر بن عدی رضی اللہ عنہ اور اُن کے ہمنواؤں کو کھائی میں شہید کیے جانے والوں کی مانند اور اُن کے قاتل کو اُس دور کے ظالم و کافر بادشاہ کی مانند نہ فرماتے۔ اہل علم سے اپیل ہے کہ وہ اصحاب الاخدود کے واقعہ کو اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمۂ قرآن کے حاشیہ پر چھپی ہوئی تفسیر "خزائن العرفان" میں ضرور پڑھ لیں، تا کہ اُنہیں معلوم ہو کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے مسلکِ اعلیٰ حضرت سے بے خبر ہونے کی وجہ سے سیدنا حجر بن عدی اور اُن کے رفقاء رضی اللہ عنہم کے قاتل کو حدیث کی رو سے کیا سمجھ رکھا تھا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی (معاذ اللہ) بے خبری

قارئین کرام آپ پڑھ چکے ہیں کہ محدثین کرام نے مقام عذراء میں شہید کیے جانے والوں کے متعلق جو حدیث نقل فرمائی ہے اُسے حکماً مرفوع مانا ہے اور ام المومنین اور مولیٰ علی علیہما السلام کی روایت کردہ حدیثوں کو ایک دوسری کی مؤید فرمایا ہے، اِس لحاظ سے یہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوا۔ نیز اِس سے قبل بخاری شریف کے حوالہ سے تین احادیث ذکر ہو چکی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعض غزوات میں مقتول ہونے والے بعض صحابہ کے بارے میں فرمایا کہ وہ آگ میں ہیں اور وہ بھی معمولی سی چوری کے سبب، لہٰذا اِس صورت میں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی معاذ اللہ سورۃ الحدید کی آیت نمبر دس کی تفسیر سے بے خبر قرار پاتے ہیں۔ اندازہ لگائیے! بعض طلقاء کی بے جا حمایت کا نتیجہ کس قدر بھیانک ہے؟

﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ﴾ کی صحیح تفسیر

بعض علماء ہند نے اِس جملہ کی جو تفسیر کی ہے وہ غلط ہی نہیں بلکہ سراسر باطل ہے، کیونکہ قرآن وسنت کے خلاف ہے۔ آیئے! دیکھتے ہیں کہ اِس جملہ کی صحیح تفسیر کیا ہے؟ بعض علماء ہند نے تو یہ سمجھا ہے کہ اِس جملہ میں فقط یہ بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ ہر اُس عمل سے باخبر ہے جو تم کرو گے مگر وہ تم سب سے بھلائی کا وعدہ فرما چکا ہے، یعنی اُن کے نزدیک اِس جملہ میں فقط وعدہ کا ذکر ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اِس آیت میں بعد میں ایمان لانے والوں کو تسلی دی گئی ہے کہ وہ جو کچھ بھی راہِ الٰہی میں خرچ کریں اور جہاد کریں اُن کو بھی اجر دیا جائے گا، اگرچہ سابقین کے برابر نہیں ہوگا تاہم بھلائی کا وعدہ سب کے ساتھ ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ

اِس آیت میں پہلے یا بعد میں ایمان لانے کا ذکر نہیں ہوا بلکہ فقط پہلے یا بعد میں خرچ کرنے اور جہاد کرنے کا ذکر ہورہا ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص قدیم الاسلام تو ہو مگر قدیم الانفاق نہ ہو تو اُس کا شمار بعد میں خرچ کرنے اور جہاد کرنے والوں میں ہوگا۔ یہاں سے ظاہر ہوتا ہے کہ آیت میں ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ﴾ فرمانے میں نیت واخلاص کی طرف بھی باریک اشارہ ہے، یعنی دیکھا جائے گا کہ کسی قدیم الاسلام شخص نے پہلے خرچ نہیں کیا تھا اور اب خرچ کرنے لگا ہے تو اِس کی وجہ کیا ہے؟ فی الجملہ یہ کہ بتادیا گیا ہے کہ پہلے یا بعد میں جس کسی نے بھی صدق واخلاص کے ساتھ انفاق اور جہاد کیا اُس کا اجر ضائع نہیں ہوگا، ہر ایک کے ساتھ زمانی عسر ویسر اور اُس کے اخلاص کے مطابق بھلائی کا وعدہ ہے۔ اب یہاں اِس وضاحت کی ضرورت تو نہیں ہے کہ پہلے یا بعد جو کوئی بھی خلوص سے عاری ہو کر انفاق اور جہاد کرے تو اُس کے لیے کسی قسم کے اجر اور بھلائی کا وعدہ نہیں ہوتا۔ سو آیت کے اِس جملہ میں لفظ ﴿خَبِيْرٌ﴾ سے تین چیزوں کو مدنظر رکھے جانے کا ذکر ہے:

۱۔ اخلاص ونیت

۲۔ حال ومستقبل میں اچھے اعمال پر بھلائی کا وعدہ

۳۔ اور حال ومستقبل میں برے اعمال پر وعید۔

اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے جو اِس آیت کو مستقبل کے ساتھ مقید اور فقط وعدہ کے ساتھ خاص کر دیا ہے، خواہ مستقبل میں کوئی صحابی جس قدر بھی برے عمل کرتا رہے اُس کے ساتھ بھلائی کا وعدہ ہوگیا، یہ قرآن مجید کی دوسری آیات اور سینکڑوں احادیث نبویہ کے خلاف ہے۔ حق بات یہ ہے کہ آیت میں فقط وعدہ کا نہیں بلکہ وعد اور وعید دونوں کا ذکر ہے۔ چنانچہ علامہ ابن عطیہ اور علامہ ابوحیان اندلسی لکھتے ہیں:

﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ﴾ قَوْلٌ فِيْهِ وَعْدٌ وَوَعِيْدٌ.

”﴿اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو اُس سے بخوبی خبردار ہے﴾ اِس قول میں وعدہ اور وعید دونوں ہیں“۔

(المحرر الوجيز في تفسير الكتاب العزيز ج۸ ص ۲۲٤؛ البحر المحيط ج۸ ص ۲۱۹)

علامہ محمود آلوسی حنفی لکھتے ہیں:

عَالِمٌ بِظَاهِرِهٖ وَبَاطِنِهٖ وَيُجَازِيكُمْ عَلىٰ حَسْبِهٖ ، فَالْكَلَامُ فِيهِ وَعْدٌ وَوَعِيدٌ.

''وہ بندے کے ظاہر وباطن کو جاننے والا ہے اور وہ اسی کے مطابق تمہیں جزا دے گا، پس اِس کلام میں وعدہ اور وعید دونوں مذکور ہیں''۔

(روح المعاني ج٢٦ ص٤١١)

علامہ عبدالحمید کشک لکھتے ہیں:

أَيْ عَالِمٌ بِأَعْمَالِكُمْ ، مُطَّلِعٌ عَلىٰ خَفَايَاكُمْ وَنَوَايَاكُمْ ، وَمُجَازِيكُمْ عَلَيْهِ، وَفِي الآيَةِ وَعْدٌ وَوَعِيدٌ.

''وہ تمہارے اعمال سے آگاہ، تمہارے مخفی امور اور تمہاری نیتوں پر مطلع اور اُسی کے مطابق تمہیں جزا دینے والا ہے، اور اِس آیت میں وعدہ اور وعید دونوں ہیں''۔

(في رحاب التفسير ج٢٧ ص٦١٧٥)

اِس جملہ کی تفسیر میں اُس امام نے تو کمال ہی کر دیا ہے جن کی نسبت سے ہم سنی حنفی کے ساتھ ساتھ ماتریدی بھی کہلاتے ہیں، یعنی امام ابو منصور محمد بن محمد بن محمود ماتریدی حنفی رحمۃ اللہ علیہ، متوفّٰی ٣٣٣ھ، وہ لکھتے ہیں:

وَقَوْلُهُ تَعَالىٰ ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ﴾ فِيهِ تَرْغِيبٌ وَتَرْهِيبٌ فِي مَا يَرْغَبُ فِيهِ وَيَرْغَبُ عَنْهُ.

''ارشادِ الٰہی: ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ﴾ میں ترغیب و ترہیب دونوں ہیں، پسندیدہ اعمال کی ترغیب اور ناپسندیدہ اعمال سے ترھیب (وارننگ) کا ذکر ہے''۔

(تأويلات أهل السنة لأبي منصور الماتريدي ج٥ ص٤٣)

جب اِس آیت میں وعدو وعید اور ترغیب و ترہیب دونوں مذکور ہیں اور جزا و سزا کا معاملہ بھی اسی کے مطابق ہوگا تو پھر کسی عالم دین کے لکھ دینے سے وہ ذات جل جلالہ اپنا قانون تو تبدیل نہیں کرے گی جس نے

یہاں تک فرمایا ہے:

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ، وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ.

''تو جو ایک ذرہ بھر بھلائی کرے اُسے دیکھے گا اور جو ایک ذرہ بھر برائی کرے اُسے دیکھے گا''۔

(الزلزال:۷،۸)

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَّاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا وَكَفٰى بِنَا حَاسِبِيْنَ.

''اور ہم عدل کی ترازوئیں رکھیں گے قیامت کے دن تو کسی جان پر کچھ ظلم نہ ہوگا، اور اگر کوئی چیز رائی کے دانے کے برابر ہو تو ہم اُسے لے آئیں گے اور ہم کافی ہیں حساب کو''۔

(الأنبياء:۴۷)

سو اُس وقت تک جن لوگوں نے صلح حدیبیہ سے قبل اور بعد یا فتح مکہ سے ہی قبل اور بعد انفاق اور جہاد کیا یا بعد میں جو لوگ انفاق و جہاد کرتے رہیں گے اللہ تعالیٰ جس طرح اُن کے ساتھ کیے ہوئے اجر کے وعدہ کو پورا فرمائے گا اُسی طرح وہ ذرہ ذرہ کے حساب کی وعید کو بھی پورا فرمائے گا، ورنہ سیدنا حجر بن عدی رضی اللہ عنہ ایسے بے گناہ حضرات جنہیں کسی حد یا جنگ میں نہیں بلکہ ''صَبْرًا'' (باندھ کر) قتل کیا گیا اُن کا حساب کس کے ذمہ ہوگا؟

بعض طلقاء کی خاطر ترجمہ میں تبدیلی

قارئین کرام! خدا گواہ ہے کہ میں یہ سطور انتہائی کرب و اضطراب کے ساتھ لکھ رہا ہوں۔ میں انتہائی معذرت کے ساتھ کہتا ہوں کہ اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے معاویہ بن ابی سفیان کے مستقبل پر لکیر کھینچ کر اُسے جنتی قرار دینے کی خاطر فتاوی رضویہ میں آیت کے ترجمہ کو جو مستقبل کے ساتھ خاص کیا ہے، یہ اُن کا نرا تحکم ہے۔ فتاوی رضویہ میں بعض طلقاء کی خاطر اُنہوں نے ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ﴾ کا ترجمہ یوں کیا ہے:

''اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کرنے والے ہو''۔

(فتاوی رضویہ ج۲۹ ص۳۳۶)

جبکہ کنز الایمان میں اِس جملہ کا ترجمہ اُنہوں نے ایسا شان دار کیا ہے کہ اُس میں ماضی ، حال اور مستقبل کی کوئی قید ہی نظر نہیں آتی۔ وہ لکھتے ہیں:

﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ﴾

''اور اللہ کو تمہارے کاموں کی خبر ہے''۔

(الحدید: ۱۰)

ایک اور مقام پر اِسی لفظ کا ترجمہ یوں کیا ہے:

''اور اللہ تمہارے کاموں سے خبردار ہے''۔

(آل عمران: ۱۸۰)

جب اِن دونوں مقامات پر ترجمہ کو مستقبل کے ساتھ خاص نہیں کیا تو فتاوی رضویہ میں کیوں کیا؟ اس کی حکمت کسی پاسبانِ مسلکِ رضا سے ضرور معلوم کیجئے گا!

بے جا حمایت میں حد ہی کردی

بعض علماءِ ہند نے فرمایا تو یہ تھا:

''ہم تو بحمد اللہ سرکار اہل بیت کے غلامانِ خانہ زاد ہیں۔ ہمیں معاویہ سے کیا رشتہ، خدانخواستہ اُن کی حمایت بے جا کریں مگر ہاں اپنی سرکار کی طرفداری''۔

(فتاوی رضویہ ج۲۹ ص۳۷۸)

لیکن وہ اپنے لکھے پر قائم نہیں رہ سکے اور ابن ہند کی بے جا ہی نہیں کی بلکہ خلافِ شریعت حمایت کے مرتکب ہو گئے۔ کبھی اُن کے دفاع میں بعض مجہول شعراء کے شعر کو شریعت کا درجہ دے دیا اور کبھی اُن کے چالیس سالہ اقتدار کی جملہ زیادتیوں پر عفو کا ایسا قلم پھیرا کہ کتاب وسنت کی سینکڑوں آیات واحادیث ہی عبث نظر آنے لگیں۔ اگر اُنہیں اپنی سرکار کی طرف داری اس حد تک منظور تھی کہ بعض طلقاء کی حمایت میں

اُنہیں آیات واحادیث یاد نہ رہیں اور اُنہوں نے اُس خاندان کو بلا حساب وکتاب جنتی قرار دے دیا جو اعلانِ نبوت کے بعد مسلسل اکیس (۲۱) برس تک پیغمبرِ اسلام ﷺ کو پریشان کرتا رہا اور پھر بعد از وصالِ نبوی ﷺ آپ کے اہل بیت کرام علیہم السلام کو اذیتیں پہنچاتا رہا، تو پھر اُنہوں نے اپنی سرکار کی طرف داری کا کچھ حصہ اُس شخص کے لیے بھی ظاہر کیا ہوتا جس نے اپنے مکمل کنبہ کو حمایتِ نبوی ﷺ میں لگا دیا تھا، شعب ابی طالب میں محصور ہو کر فاقہ کشی کرتا رہا، اُس کا کنبہ حمایتِ اسلام میں کفر سے لڑتا رہا اور پھر اُسی کا کنبہ بعد از وصالِ نبوی ﷺ بھی ظلم وستم کا شکار رہا۔ اگر اپنی سرکار کی طرف داری کرتے ہوئے حمایتِ معاویہ میں آیات واحادیث نظر انداز ہو گئیں تو حمایتِ ابی طالب میں مرسل ومنقطع روایات کو کیوں نہیں چھوڑا جا سکتا؟ اگر بقول کسے سیدنا ابو طالب رضی اللہ عنہ نے علی الاعلان خود کلمہ نہیں پڑھا تو کیا اِس میں کوئی حکمت نہیں ہو سکتی؟ اگر وہ کفر پر دِل سے ڈٹے ہوئے ہوتے تو پھر اُنہوں نے کبھی اپنے کنبہ کے کسی فرد کے اسلام قبول کرنے پر برہمی نہیں تو کم از کم خفگی اور ناگواری کا اظہار تو کیا ہوتا!

سیدنا ابو طالب رضی اللہ عنہ عجیب کافر تھے کہ اُن کی زوجہ اُن کا دین چھوڑ کر مسلمان ہو گئیں تو وہ خفا نہ ہوئے، سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اُن کے دین کے برعکس اظہارِ اسلام فرما دیا تو وہ ناراض نہ ہوئے، سیدنا جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے اُن کے دین کو خیر باد کہہ کر اسلام قبول کر لیا تو وہ ٹس سے مس نہ ہوئے بلکہ فرمایا: اپنے چچا زاد کے دست و بازو بن جاؤ! اور سیدنا حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ نے طیش میں آ کر اعلانِ اسلام فرما دیا تو اُنہیں فرمایا: تم نے جو فیصلہ کیا ہے اس پر ثابت قدم رہنا اور پھر خود بھی اپنے دین کے دشمن بھتیجے کی اس قدر رزوردار حمایت کرتے رہے کہ اُن کے پیارے بھتیجے ﷺ اُن کے انتقال کے بعد بھی اُن کی حمایت کو بھلا نہ سکے۔

کیا دنیا میں ایسے کافر کی کوئی نظیر پیش کی جا سکتی ہے جو اپنے دین کے دشمن کو اُس کے بچپن سے جانتا ہو اور بشمول بحیریٰ راہب متعدد اہل کتاب علماء واحبار سے سن رکھا ہو کہ اُس کا یہ بھتیجا رب العالمین کا رسول ہے، رحمۃ للعالمین اور خاتم النبیین ہے اور پھر بھی وہ اُس کی نہ صرف یہ کہ اُس کے بچپن سے پرورش کرتا رہا ہو بلکہ اُس کے اعلانِ نبوت کے بعد اپنے اور قوم کے دین کی کھلی بغاوت کو دیکھنے کے باوجود اُس کے مشن کی حمایت کرتا رہا ہو اور اپنے پورے کنبہ کو بھی اُس کی حمایت میں لگا دیا ہو؟ اگر کرۂ ارضی پر کوئی ایسا کافر گزرا ہو

تو بطورِ نمونہ کوئی مثال تو پیش فرمایئے!

خلاصہ یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت فاضلِ بریلی رحمۃ اللہ علیہ نے معاویہ بن ابی سفیان کی بے جا حمایت کی ہے، اُن کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ کسی طرف جھکتے تو پروا نہیں کرتے تھے اور دوسری سمت کا خیال نہیں رکھتے تھے۔ اِس مقام پر مجھے اعتراف کرنا ہی پڑے گا کہ درجِ ذیل مصرع اُن پر پورا پورا صادق آتا ہے بع

جس سمت آ گئے ہو سکے بٹھا دیے ہیں

اتباع میں مقدم کون، بزرگ یا حق؟

جمود و تعطل میں جکڑا ہوا انسان ہمیشہ حق کو مؤخر اور اپنے پیرو و بزرگ کو مقدم سمجھتا ہے، اگرچہ اُس کا پیرو بزرگ نفسِ مسئلہ میں غلط ہی کیوں نہ ہو۔ اِسی صورتِ حال کا شکار وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جو کسی شخصیت کو مذہب و مسلک کی پہچان بنا لیتے ہیں، مثلاً ہمارے دور میں بعض طبقات نے پہلے بعض علماء ہند کو بانی مسلک تصور کر لیا اور پھر خود کو اُن کے مسلک کا علمبردار سمجھ لیا، حالانکہ وہ بعض علماء امامِ مذہب تھے اور نہ ہی امام عقیدہ، وہ مذہباً حنفی اور عقیدۃً ماتریدی تھے، وہ خود کو کسی مسلک کا امام، واضع یا بانی تصور نہیں کرتے تھے، لیکن جو لوگ اُن کے نام سے دکان داری کرتے ہیں، اُن کے جبر و ظلم کا عالم یہ ہے کہ وہ اُن کی ہر ہر بات کو منوانا لازم سمجھتے ہیں اور جو نہ مانے اُسے اہل سنت سے خارج سمجھتے ہیں، جبکہ خود اُس عالم دین نے جا بجا لکھا ہے کہ قرآن کے علاوہ کوئی کتاب اغلاط سے پاک نہیں اور انبیاء کرام علیہم السلام کے علاوہ کوئی انسان غلط وخطا سے معصوم نہیں، لہٰذا خطا، لغزش اور غلطی کسی بھی غیر نبی انسان سے ممکن ہے۔ جب حقیقت یہ ہے تو پھر جان لیجئے کہ زیر بحث مسئلہ میں اُن بعض علماءِ ہند پر حق واضح نہیں ہو سکا۔ اِس مسئلہ میں حق وہ نہیں جو اُنہوں نے سمجھا بلکہ حق وہ ہے جو اُن کے اور ہم سب کے ائمہ نے سمجھا۔

قوتِ اقتدار کا سحر

یقین فرمایئے! میں حیرت میں ڈوب جاتا ہوں اور سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہوں جب دیکھتا ہوں کہ قد آور علماء وفضلاء کسی بادشاہ کے ناجائز دفاع میں اِس حد تک آگے چلے جاتے ہیں کہ بہت سی آیات واحادیث

بھی اُنہیں یاد نہیں رہتیں اور ترجمۂ قرآن کو بھی ایک مخصوص رُخ پر معین کرنے میں اُنہیں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوتی۔ بسیار سوچ و بچار کے بعد میں اِس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ اُن کا قصور نہیں بلکہ یہ اوّلین ملوکیت کا جادو ہے جس کی وجہ سے بڑی بڑی عقلیں متأثر ہوگئیں۔ اوّلین دورِ اقتدار کے قریبی لوگ جس سحرِ اقتدار سے متأثر ہوئے تھے یہ اُسی کی نحوست ہے جس سے اب تک جان نہیں چھوٹی۔ متأخرین کی اکثریت اُسی جادو سے متأثر ہے جس سے متقدمین متأثر ہوئے تھے۔ قوتِ اقتدار اور سحرِ اقتدار کی بدولت ہر شعبہ زندگی کے لوگ کھچے چلے آتے ہیں۔ سلطان کے اردگرد ایسے نام نہاد دانشور، شعراء، خطباء، علماء اور فقہاء کی ایک کھیپ تیار ہوجاتی ہے جو حرام کو حلال اور ظلم کو عدل باور کرانے میں مہارت رکھتی ہے۔ یہ بات نہیں کہ اُنہیں برے بھلے، حلال وحرام اور خیر وشر کی تمیز نہیں ہوتی، وہ سب کچھ جانتے بوجھتے ہیں مگر دنیوی منفعت میں اندھے ہو جاتے ہیں۔ ایسے ظالم لوگ اپنے علم وفن سے شر کو خیر اور ظلم کو عدل دِکھلانے میں اتنا مہارت رکھتے ہیں کہ اربابِ تقویٰ اہل علم ودانش بھی اُن کے دھوکے میں آجاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنی امت کے معاملے میں ایسے پڑھے لکھے ماہرین کو سب سے بڑا خطرہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ خلیفہ ثانی سیدنا عمرؓ بیان کرتے ہیں:

سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ: إِنَّ أَخْوَفَ مَا أَخَافُ عَلَيْكُمْ كُلُّ مُنَافِقٍ عَلِيْمِ اللِّسَانِ.

''میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا تھا: میں تمہارے بارے میں ہر منافق عالم زبان آور کو سب سے بڑا خطرہ سمجھتا ہوں''۔

(صفة النفاق ونعت المنافقين لأبي نعيم ص ١٦٢، ١٦٣، حديث ١٥٠)

ایسے ماہرین کی مہارت اُس وقت خوب آشکار ہوتی ہے جب اُنہیں اُن کے علم وفن کے خریدار مل جاتے ہیں۔ نیز ایسے ماہرین صرف ہمارے دور میں ہی نہیں بلکہ دورِ نبوی ﷺ میں بھی چھپے ہوئے تھے لیکن اُن کے سودے کا خریدار کوئی نہیں تھا، پھر جب خلافتِ راشدہ کے اختتام پر اُنہیں اُن کے قدردان مل گئے تو اُن کی پانچوں گھی میں تھیں۔ چنانچہ امام بخاری لکھتے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس کچھ لوگوں

نے آکر کہا:

إِنَّا نَدْخُلُ عَلَىٰ سُلْطَانِنَا فَنَقُوْلُ لَهُمْ بِخِلَافِ مَا نَتَكَلَّمُ إِذَا خَرَجْنَا مِنْ عِنْدِهِمْ ، قَالَ: كُنَّا نَعُدُّهَا نِفَاقًا.

''ہم اپنے سلطان کے پاس جاتے ہیں تو اُن کے لیے ایسی گفتگو کرتے ہیں جو ہماری باہر کی گفتگو کے خلاف ہوتی ہے، اُنہوں نے فرمایا: ہم اس کو نفاق شمار کرتے تھے''۔

(بخاري: كتاب الأحكام، باب مايكره من ثناء السلطان وإذاخرج قال غير ذلك، حديث ۷۱۷۸)

عروہ بن زبیر بیان کرتے ہیں کہ میں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما کو عرض کیا:

إِنَّا نَحْضُرُ الإِمَامَ فَيَحْكُمُ بِالْحُكْمِ نَرَاهُ جَوْرًا ، فَنَقُوْلُ: وَفَّقَكَ اللّٰهُ، وَنَنْظُرُ إِلَى الرَّجُلِ مِنَّا فَيُثْنِيْ عَلَيْهِ بِذٰلِكَ ، قَالَ ابْنُ عُمَرَ: إِنَّامَعْشَرَ أَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ كُنَّا نَعُدُّ هٰذَا نِفَاقًا ، فَأَمَّا أَنْتُمْ فَمَا أَدْرِيْ مَا تَعُدُّوْنَهُ.

''ہم جب اپنے امام (نام نہاد خلیفہ) کے پاس جاتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ کوئی ظالمانہ فیصلہ کرتا ہے تو ہم کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ تجھے اچھی توفیق دے، اور ہم اپنے ساتھیوں میں سے بعض کو دیکھتے ہیں کہ وہ اُس کے اُس فیصلہ پر اُس کی تعریف کرتے ہیں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ہم رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کی جماعت اِس کو منافقت شمار کرتے تھے، لیکن میں نہیں جانتا کہ تم لوگ اب اس کو کیا سمجھتے ہو''۔

(صفة النفاق ونعت المنافقين لأبي نعيم ص ۱۲۵ حديث ۹۵)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ دورِ صحابہ میں ایسے کون سے حکمران ہوں گے جن کی مجلس میں اُن کی جھوٹی تعریف کی جاتی ہوگی؟ اِس کا کچھ اندازہ درجِ ذیل حدیث سے ہوسکتا ہے۔ حافظ ابن عساکر اور امام ذہبی لکھتے ہیں:

كَانَ عُبَادَةُ بْنُ الصَّامِتِ مَعَ مُعَاوِيَةَ بْنِ أَبِي سُفْيَانَ فِي عَسْكَرِهِ، فَأَذَّنَ يَوْمًا فَقَامَ خَطِيبٌ يَمْدَحُ مُعَاوِيَةَ وَيُثْنِي عَلَيْهِ، فَقَامَ عُبَادَةُ بِتُرَابٍ فِي يَدِهِ، فَحَثَاهُ فِي فَمِ الْخَطِيبِ، فَغَضِبَ مُعَاوِيَةُ، فَقَالَ لَه عُبَادَةُ: إِنَّكَ لَمْ تَكُنْ مَعَنَا حِينَ بَايَعْنَا رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ بِالْعَقَبَةِ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِي مَنْشَطِنَا وَمَكْرَهِنَا وَمَكْسَلِنَا، وَأَثَرَةٍ عَلَيْنَا، وَأَلَّا نُنَازِعَ الْأَمْرَ أَهْلَهُ، وَأَنْ نَقُومَ بِالْحَقِّ حَيْثُ كُنَّا لَا نَخَافُ فِي اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ. وَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: إِذَا رَأَيْتُمُ الْمَدَّاحِينَ، فَاحْثُوا فِي أَفْوَاهِهِمُ التُّرَابَ.

''سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ معاویہ بن ابی سفیان کے لشکر میں تھے کہ ایک دن اُنہوں نے اذان کہی تو ایک خطیب کھڑے ہو کر معاویہ کی شان وتعریف کرنے لگا۔ حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ اُٹھے اور خاک کی ایک مٹھی بھر کر خطیب کے منہ پر پھینک دی۔ اس پر معاویہ غضبناک ہوا تو اُس کو سیدنا عبادہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم اُس وقت نہیں تھے جب ہم نے عقبہ میں رسول اللہ ﷺ کی بیعت کی تھی کہ ہم اپنی پسند اور ناپسند میں آپ کی اطاعت کریں گے اور اپنی پسند پر آپ کے فرمان کو ترجیح دیں گے، کسی امر میں ناحق تنازع نہیں کریں گے اور ہر حال میں حق کی خاطر کھڑے ہوں گے اور اللہ کے معاملہ میں کسی ملامت گر کی پرواہ نہیں کریں گے اور آپ نے فرمایا تھا: جب تم تعریف کرنے والوں کو دیکھو تو اُن کے مونہوں (بوتھوں) میں مٹی ٹھونسنا''۔(۱)

(تاريخ دمشق لابن عساكر ج٢٦ ص١٩٦؛ سير أعلام النبلاء ج٢ ص٧؛ عبادة بن الصامت رضي الله عنه للدكتور وهبة الزحيلي ١٣٣، ١٣٤)

---

(۱) امام ابونعیم لکھتے ہیں: سُئِلَ وَهْبٌ مَنِ الْمُنَافِقُ؟ قَالَ: الَّذِي يُحِبُّ الْحَمْدَ وَيَكْرَهُ الذَّمَّ. ''وہب بن منبہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا: منافق کون؟ فرمایا: جو تعریف کو پسند کرے اور برائی کو ناپسند''۔

(صفة النفاق ونعت المنافقين لأبي نعيم ص١٥١، أثر: ١٣٣)

نوٹ:

یہ وہی عبادہ بن الصامت انصاری رضی اللہ عنہ ہیں جنہوں نے معاویہ بن ابی سفیان کو سودی معاملہ میں ٹوکا تھااور ارشادِ نبوی ﷺ کی پرواہ نہ کرنے پر اُن کے ساتھ بول چال بھی بند کردی تھی، اور یہی ہیں وہ جنہوں نے خمر (شراب) کی مشکوں کو چھری سے پھاڑ ڈالا تھا تو معاویہ بن ابی سفیان اُن پر غضبناک ہوا تھا، وہ شراب اونٹوں کی قطار پرلدی ہوئی تھی اور انہوں نے پوری قطار ہی ضائع کردی تھی۔ یہ مکمل واقعہ درجِ بالا کتب میں دیکھا جاسکتا ہے۔ جولوگ "**الصَّحَابَةُ عَدُوْلٌ**"، ہی نہیں بلکہ بلا استثنا "**کُلُّهُمْ عَدُوْلٌ**" کے مدعی ہیں اُنہیں ایسے حقائق کو ضرور مدنظر رکھنا چاہیئے۔

جب سلطان کو ایسا دھندہ پسند آجائے تو پھر سوداگروں اور ضمیر فروشوں کی کوئی کمی نہیں رہتی۔ نثر و نظم کی صورت میں سوداگر ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں اور اگر سلطانِ وقت کا دور زمانۂ نبوی ﷺ کے قریب ہو تو پھر اُس کی شان میں ازخود احادیث گھڑ کر رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کرنے والے ماہرینِ علم بھی میدان میں آجاتے ہیں اور ایسی ملمع سازی کرتے ہیں کہ بعض مرتبہ علماء حق بھی اُن کے جھوٹ کو سچ تصور کرتے ہوئے قبول کر لیتے ہیں۔ چنانچہ صحاح ستہ کے حاذق محدثین کرام رحمۃ اللہ علیہم بھی ایسے مکاروں اور منافقوں کے مکروفریب سے محفوظ نہیں رہ سکے، حتیٰ کہ صحیح مسلم جیسی کتاب میں بھی اسلام کے پہلے بادشاہ کی شان میں جھوٹی حدیث گھس گئی اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کو محسوس تک نہ ہوا، جیسا کہ ہم "**شرح خصائص علي** رضی اللہ عنہ" اور "**الأحاديث الموضوعة في فضائل معاوية**" میں تحقیق کے ساتھ لکھ چکے ہیں۔ سنن ترمذی میں "**اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ هَادِيًا مَّهْدِيًّا وَاهْدِ بِهٖ**" بھی ایسے ہی مکار کاریگروں کا کمال ہے کہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ جیسے عظیم محدث بھی دھوکہ کھا گئے۔

علماءِ حق سے ناجائز دفاع کیوں؟

سو جب قرونِ اولیٰ کے بعض کذاب لوگوں کی دسیسہ کاریوں سے امام مسلم اور امام ترمذی ایسے ماہر محدثین کرام رحمۃ اللہ علیہم بھی دھوکہ کھا بیٹھے تو پھر بعد والے تو اپنے حُسنِ ظن کی بنا کر اُنہیں کے نقش قدم پر

چلیں گے، الا یہ کہ کوئی سر پھرا شخص تحقیق کی چھانی اُٹھالے تو وہ اختلاف کرنے پر مجبور ہو جائے۔ خود سوچئے! آخر کیا وجہ ہوئی کہ بعض قدآور علماء نے سورۃ الحدید کی آیت [۱۰] کا ایسا ترجمہ کر دیا جس سے فتح مکہ سے لے کر [۶۰ھ] تک بعض طلقاء کے تمام اعمال کو بلا حساب بنا دیا؟ یقیناً اِس کا سبب وہی جھوٹی احادیث ہیں جو پہلی بادشاہی کے دور میں گھڑی گئیں۔ چنانچہ بعض ایسی احادیث بھی بنائی گئیں جن کے ذریعے بعض طلقاء کے تاریک مستقبل پر مہر سکوت لگانے کی کوشش کی گئی، اور پھر امت کی بدقسمتی دیکھئے کہ ایسی جھوٹی روایات کو کتب صحاح میں بھی جگہ مل گئی۔

"لَا تَذْكُرُوْا مُعَاوِيَةَ إِلَّا بِخَيْرٍ" کا بطلان

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ يَحْيَى حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ مُحَمَّدٍ النُّفَيْلِيُّ حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ وَاقِدٍ عَنْ يُونُسَ بْنِ حَلْبَسَ عَنْ أَبِي إِدْرِيسَ الْخَوْلَانِيِّ قَالَ لَمَّا عَزَلَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ عُمَيْرَ بْنَ سَعْدٍ عَنْ حِمْصَ وَلَّى مُعَاوِيَةَ فَقَالَ النَّاسُ : عَزَلَ عُمَيْرًا وَوَلَّى مُعَاوِيَةَ فَقَالَ عُمَيْرٌ : لَا تَذْكُرُوْا مُعَاوِيَةَ إِلَّا بِخَيْرٍ فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ اللّٰهُمَّ اهْدِ بِهِ. قَالَ أَبُوْ عِيسٰى: هٰذَا حَدِيثٌ غَرِيبٌ ، قَالَ: وَعَمْرُو بْنُ وَاقِدٍ يُضَعَّفُ.

"ابو ادریس خولانی سے روایت ہے جب حضرت عمر بن خطاب ﷺ نے حمص سے عمیر بن سعد کو معزول کر کے معاویہ کو والی بنایا تو لوگوں نے کہا: اُنہوں نے عمیر کو معزول کر دیا اور معاویہ کو امیر مقرر کر دیا۔ اس پر عمیر بن سعد نے کہا: معاویہ کا ذکر خیر سے کیا کرو، کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا تھا: اے اللہ! اس کے ذریعہ لوگوں کو ہدایت دے۔ امام ترمذی فرماتے ہیں: یہ حدیث غریب ہے، عمرو بن واقد کی تضعیف کی گئی ہے"۔

(الجامع الكبير وهو سنن الترمذي ج٦ ص١٥٨ حديث١٨٤٣)

علامہ البانی کا تضاد

ہر چند کہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ "وَعَمْرُو بْنُ وَاقِدٍ يُضَعَّفُ" کے الفاظ استعمال کر کے اِس حدیث کو قبول کرنے یا مسترد کرنے کی ذمہ داری دوسروں پر ڈال گئے، تاہم اُن کا اپنی جامع میں اس کو درج کرنا بھی باعث حیرت ہے، کیونکہ عمرو بن واقد کی تضعیف ہی نہیں بلکہ تکذیب بھی کی گئی ہے اور یہ حدیث ضعیف نہیں بلکہ موضوع ہے۔ اِس سے زیادہ حیرت اُن لوگوں پر ہے جنہوں نے اِس جعلی حدیث کو صحیح قرار دے دیا ہے، اور یہ غلطی علامہ ناصر الدین البانی سے ہوئی، وہ لکھتے ہیں:

صَحِيحٌ بِمَا قَبْلَهُ.

"یہ پہلی حدیث کی وجہ سے صحیح ہے"۔

(صحيح سنن الترمذي للألباني ج٣ ص ٥٦١ حديث ٣٨٤٣)

یہ علامہ البانی کی سنگین غلطی ہے، کیونکہ اِس کی سند میں عمرو بن واقد راوی کو کئی حضرات نے کذاب کہا ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

> "یزید بن محمد بن عبد الصمد کہتے ہیں: ابو مسہر نے کہا: وہ جھوٹ بولتا تھا۔ امام بخاری ابو حاتم، دُحیم اور یعقوب بن سفیان نے کہا: وہ بیکار آدمی تھا۔ یعقوب بن سفیان نے دُحیم سے نقل کیا ہے: ہمارے مشائخ اُس سے حدیث نہیں لیتے تھے، وہ کہتے ہیں: گویا کہ دُحیم کو اِس میں شک نہیں تھا کہ وہ جھوٹ بولتا ہے۔ عبد اللہ بن احمد بن ذکوان کہتے ہیں: محمد بن مبارک صوری عمرو بن واقد سے مروان طاطری کی وفات تک حدیث روایت نہیں کرتے تھے، اور مروان کہا کرتا تھا: عمرو بن واقد بڑا جھوٹا ہے۔ ابراہیم جوزجانی کہتا ہے: میں نے محمد بن مبارک سے اُس کے متعلق دریافت کیا تو اُنہوں نے کہا: وہ سلطان کی پیروی کرتا تھا اور سچا تھا، ابراہیم جوزجانی کہتے ہیں: میں نہیں سمجھ سکا کہ محمد بن مبارک صوری کے اِس قول کا کیا مطلب ہے؟ اُس کی احادیث معضل اور منکر تھیں اور ہم مدت سے اُس کی حدیث کو منکر سمجھتے تھے۔ امام ابن حبان نے کہا: یہ سندوں کو تبدیل کرتا ہے،

مشہور راویوں سے منکر احادیث روایت کرتا ہے، لہٰذا یہ ترک کر دینے کا مستحق ہے“۔

(تھذیب التھذیب ملخصاً ج۵ ص ۱۰٤،۱۰۵)

حافظ ابن حجر عسقلانی نے ”تھذیب التھذیب“ کی تلخیص میں اِن تمام اقوال کا خلاصہ اور نتیجہ یوں بیان کیا ہے:

عَمْرُو بْنُ وَاقِدٍ الدِّمَشْقِيُّ أَبُوْ حَفْصٍ مَوْلٰی قُرَيْشٍ مَتْرُوْكٌ.

”قریش کا غلام ابوحفص عمرو بن واقد دمشقی متروک (مسترد کیا ہوا) ہے“۔

(تقريب التهذيب ص٧٤٨؛ تحرير تقريب التهذيب ج٣ ص١١١)

لطف کی بات یہ ہے کہ خود علامہ ناصر الدین البانی نے بھی اِس راوی کے بارے میں اپنی دو کتابوں میں لکھا ہے:

وَعَمْرُو بْنُ وَاقِدٍ مَتْرُوْكٌ، كَمَا فِي ”التقريب“.

”عمرو بن واقد متروک ہے، جیسا کہ ”تقریب التھذیب“ میں ہے“۔

(سلسلة الأحاديث الضعيفة ج٢ ص ٣٤١؛ سلسلة الأحاديث الصحيحة ج١ ص ٥١٤)

حیرت ہے کہ علامہ البانی نے عمرو بن واقد کو متروک تسلیم کرنے کے باوجود اُس کی روایت کردہ حدیث کو صحیح کہہ دیا؟ ظاہر ہے کہ کسی راوی کے متروک ہونے کی کوئی وجہ ہوتی ہے، اور جب ”تھذیب التھذیب“ میں اِس کے متروک ہونے کی دوسری وجوہ کے علاوہ اِس کا سندوں کو تبدیل کرنا اور کذاب ہونا واضح طور پر لکھ دیا گیا ہے اور علامہ البانی بھی اس کو متروک تسلیم کر چکے ہیں تو پھر اِس کی روایت کردہ حدیث صحیح کیسے ہوگئی؟ علامہ البانی نے اِس حدیث کو جس پہلی حدیث کی بنا پر صحیح کہا ہے وہ بھی تو موضوع ہے، کیونکہ اُس کا وہ راوی جس کو صحابی تصور کیا گیا ہے اُس کی صحابیت میں اختلاف ہے تو پھر وہ سند اس سند کی مؤید کیوں کر ہو سکتی ہے؟

”لَا تَذْكُرُوْا مُعَاوِيَةَ إِلَّا بِخَيْرٍ“ کے شانِ ورود کا جھوٹا ہونا

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اِس حدیث کے شانِ ورود میں جو حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ عنہ کی معزولی اور

اُن کی جگہ پر معاویہ کی تقرری کا واقعہ بیان کیا گیا ہے، وہ واقعہ ہی سراسر جھوٹ ہے، کوئی مائی کا لعل یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ عنہ کو معزول کر کے اُن کی جگہ پر معاویہ کو لگایا تھا۔ راقم الحروف نے اِس سلسلے میں جو مطالعہ کیا ہے اُس کی تفصیل فی الحال سپردِ قلم کرنا مناسب نہیں سمجھتا، سردست اتنا سمجھ لیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ عنہ اِس قدر پسند تھے کہ وہ چاہتے تھے کہ اُن کی مثل کچھ اور بھی قابل حضرات ہوتے تو اُن سے مسلمانوں کی بہبود کا کام لیا جاتا۔ چنانچہ متعدد علماء کرام لکھتے ہیں:

كَانَ عُمَرُ يَقُوْلُ : وَدِدْتُ أَنَّ لِيْ رِجَالًا مِثْلَ عُمَيْرِ بْنِ سَعْدٍ أَسْتَعِيْنُ بِهِمْ عَلٰى أَعْمَالِ الْمُسْلِمِيْنَ.

''سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: میرا جی چاہتا ہے کہ مجھے عمیر بن سعد جیسے کچھ اور حضرات بھی مل جاتے تو میں اُن سے مسلمانوں کے کاموں میں مدد حاصل کرتا''۔

(الإصابة ج٤ ص٥٩٦؛ تاريخ دمشق ج٤٦ ص٤٨٥؛ أسد الغابة ج٤ ص٢٨١؛ تهذيب الكمال ج٢٢ ص٣٧٥؛ تهذيب التهذيب ج٥ ص١٣٤)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اِن کو پسند فرماتے تھے اور اِن کی کارکردگی پر حیران ہوتے تھے، حتیٰ کہ وہ اُنہیں اُن کی خوبیوں کی وجہ سے فرمایا کرتے تھے:

نَسِيْجَ وَحْدِهٖ.

''وہ اپنی مثال آپ ہے''۔

(الإصابة ج٤ ص٥٩٦؛ تاريخ دمشق ج٤٦ ص٤٨٥؛ الاستيعاب ج٢ ص٥١١؛ أسد الغابة ج٤ ص٢٨١؛ تهذيب الكمال ج٢٢ ص٣٧٥؛ البداية والنهاية ج١١ ص٤٠٤؛ تهذيب التهذيب ج٥ ص١٣٤)

علامہ عبدالحفیظ بلیاوی نے اِس لفظ کا معنیٰ یوں کیا ہے:

''صفاتِ محمودہ میں بے نظیر ولاثانی''۔

(مصباح اللغات ص ٨٧٠)

ایسے شخص کو سیدنا عمرؓ جیسی صاحبِ عزیمت ہستی کیوں معزول کرتی؟ مذکورہ بالا کتب میں سے اکثر میں ہے کہ سیدنا عمرؓ نے تادمِ وصال ان کو معزول نہیں کیا تھا۔ ہاں بعض وہ حضرات جو عزیمت پر قائم نہ رہ سکے اُن کے بارے میں روایات ملتی ہیں کہ اُنہوں نے ان کو معزول کیا تھا یا اُن سے معزول کرالیا گیا تھا اور ان کی جگہ پر معاویہ بن ابی سفیان کو مقرر کیا گیا تھا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ بعض حضرات کون تھے؟ اِس پر میں اتنا عرض کرتا ہوں کہ ''یہ کہانی پھر سہی''۔

فی الجملہ یہ کہ جب سیدنا عمرؓ کی طرف حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ عنہما کی معزولی کی نسبت کا واقعہ کذب پر مبنی ہے تو پھر وہ روایت از خود جھوٹی قرار پا گئی جس کی بنیاد یہ جھوٹا واقعہ ہے۔

ایک اور قابل غور بات یہ ہے کہ بعض محدثین کے مطابق سیدنا عمیر بن سعدؓ سے فقط ایک حدیث منقول ہے اور وہ یہ زیر بحث حدیث نہیں ہے۔ چنانچہ امام ذہبی لکھتے ہیں:

عُمَيْرُ بْنُ سَعْدِ الأَنْصَارِيُّ الأَوْسِيُّ الزَاهِدُ ، نَسِيْجَ وَحْدِهِ ، لَهُ حَدِيثٌ وَاحِدٌ......لا عَدْوىٰ ، وَلَا طِيَرَةَ ، وَلَاهَامَةَ.

''سیدنا عمیر بن سعد الانصاری الاوسی الزاھدؓ صفاتِ محمودہ میں یکتا تھے، اُن سے فقط ایک حدیث نبوی منقول ہے...... **لا عَدْوىٰ ، وَلَا طِيَرَةَ ، وَلَا هَامَةَ**''۔

(سير أعلام النبلاء ج٢ ص١٠٣، ١٠٤)

اِس سے معلوم ہوا کہ سنن الترمذی کی یہ روایت: ''**لَا تَذْكُرُوا مُعَاوِيَةَ إِلَّا بِخَيْرٍ**......'' سراسر جھوٹ ہے۔ تعجب ہے کہ جب صحاح ستہ کے محدثین کرام میں سے کسی نے بھی ''**باب مناقب معاوية**'' قائم نہیں کیا تو نہ معلوم امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ خواہ مخواہ کیوں تکلف میں پڑ گئے، جبکہ دو موضوع روایات کے علاوہ کچھ لا بھی نہیں سکے۔

سو جب کتبِ صحاح تک میں ایسی جھوٹی روایات آ گئیں جن میں آیا ہے کہ بعض طلقاء کا تذکرہ خیر کے علاوہ کیا ہی نہ جائے تو پھر ایسی احادیث سے دھوکہ کھا کر بعد والے لوگ ﴿**وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيْرٌ**﴾ کے ترجمہ سے اُن طلقاء کے مستقبل کے معاملات کو محفوظ کرنے کی کوشش نہ کرتے تو اور کیا کرتے؟

متنِ حدیث درست نہ ہو تو اُس کا راوی صحابی نہیں

علامہ البانی نے "لَا تَذْكُرُوْا مُعَاوِيَةَ إِلَّا بِخَيْرٍ......" کے متن کی صحت کو جس پہلی حدیث کی بنا پر صحیح ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے وہ یہ ہے: "اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ هَادِيًا مَّهْدِيًّا وَاهْدِ بِهِ" یہ روایت بھی موضوع ہے، کیونکہ اِس کے راوی عبدالرحمان ابن ابی عمیرہ کے صحابی ہونے میں اختلاف ہے، اور بعض حاذق محدثین کرام نے لکھا ہے کہ جب کسی حدیث کا متن درست نہ ہو تو سمجھ لو کہ اُس کا مرکزی راوی صحابی نہیں ہے۔ بطور نمونہ ایک مثال ملاحظہ فرمایئے! ایک مشہور جھوٹی روایت ہے:

اُطْلُبُوا الْخَيْرَ عِنْدَ حِسَانِ الْوُجُوْهِ.

"خیرات حسین چہروں سے طلب کرو"۔

اِس متن کو رسول اللہ ﷺ سے نقل کرنے میں جس شخص کو صحابی ظاہر کیا گیا ہے اُس کو ابو مصعب انصاری کہا گیا ہے۔ حافظ ابونعیم، امام ابن اثیر جزری اور حافظ علاء الدین مغلطائی لکھتے ہیں:

مُخْتَلَفٌ فِيْهِ.

"اس میں اختلاف ہے"۔

(معرفة الصحابة لأبي نعيم ج٥ ص ٣٠٣١ ترجمة: ٣٤٦٤؛ أسد الغابة ج٦ ص ٢٨٥؛ الإنابة إلى معرفة المختلف فيهم من الصحابة ج٢ ص٢٨٦)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُس میں کیسا اختلاف تھا؟ اِس کی وضاحت حافظ ابن حجر عسقلانی کے کلام سے ہو جاتی ہے۔ اُنہوں نے اس کی صحابیت کی نفی میں بڑے کام کی بات کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

قَالَ أَبُوْنُعَيْمٍ فِيْ "مَعْرِفَةِ الصَّحَابَةِ": أَبُوْمُصْعَبٍ مُخْتَلَفٌ فِيْ صُحْبَتِهِ. قُلْتُ : لَوْكَانَ صَحَابِيًّا لَكَانَ هٰذَا الْخَبَرُ صَحِيْحًا لِصِحَّةِ إِسْنَادِهِ إِلَيْهِ ، وَقَدْ حَكَمَ أَئِمَّةُ الْحَدِيْثِ بِأَنَّ هٰذَا الْمَتْنَ بَاطِلٌ ، فَوَجَبَ الْحُكْمُ بِأَنَّهُ غَيْرُ صَحَابِيٍّ ، وَهُوَ غَيْرُ مَعْرُوْفٍ فِي التَّابِعِيْنَ أَيْضًا.

حافظ ابونعیم نے "معرفة الصحابة" میں کہا ہے کہ ابو مصعب کے صحابی ہونے

میں اختلاف ہے۔ میں (عسقلانی) کہتا ہوں: اگر وہ صحابی ہوتا تو یہ حدیث اُس تک صحتِ سند کے ساتھ صحیح ہوتی، اور بلاشبہ ائمہ حدیث نے اِس کے متن پر بطلان کا حکم لگایا ہے، پس یہ امر ثابت ہو گیا کہ وہ صحابی نہیں ہے، اور وہ تابعین میں بھی معروف نہیں''۔

(لسان المیزان ج۹ص ۱۶۳)

اس سے معلوم ہوا کہ بعض ادوار میں ظالم لوگ فقط حدیثیں ہی نہیں گھڑتے رہے بلکہ اپنی طرف سے صحابہ بھی تیار کرتے رہے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ.

سو جب ''اُطْلُبُوا الْخَيْرَ عِنْدَ حِسَانِ الْوُجُوْهِ'' کے متن کی دلالت کی وجہ سے ابو مصعب انصاری کا غیر صحابی ہونا ثابت ہو گیا تو پھر ''اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ هَادِيًا مَّهْدِيًّا وَاهْدِ بِهٖ'' کے متن کا راوی بھی تو اسی طرح مختلف فیہ ہے، اور یہ متن بھی اُس شخص پر صادق نہیں آتا جس کے لیے وضع کیا گیا ہے تو پھر اِس متن کے راوی عبدالرحمان ابن ابی عمیرہ کے غیر صحابی ہونے پر حکم واجب کیوں نہیں ہوتا؟ صرف اِس لیے کہ یہاں مذہبی تعصب آڑے آجاتا ہے؟

خلاصہ یہ ہے کہ اِس طرح کی موضوع، جعلی اور باطل روایات محض شاہی برکات کی بدولت وجود میں آتی رہیں، ورنہ طلقاء تو اور بھی بہت تھے۔ بس یوں سمجھنا چاہیئے کہ یہ اسلام کی پہلی بادشاہی کا سکہ ہے جو کسی نہ کسی صورت میں اب تک چلا آرہا ہے۔ اس میں خال المومنین ہونے کی عظمت، کتابت اور صحابیت کا کوئی دخل نہیں، اس لیے کہ اِن باتوں میں دوسرے حضرات ان سے بڑھ کر تھے مگر اُنہیں اِس قدر طویل بادشاہت کی کرامت حاصل نہیں ہوئی تھی، موصوف کو بادشاہت حاصل ہوئی تو اُس کی بدولت لوگوں نے اُنہیں ہر اُس فضیلت سے متصف کر دیا جو خلفاء راشدین اور دوسرے صحابہ کرامؓ میں سے کسی کو بھی حاصل تھی۔ یہ محض اُن کی بادشاہی کی کرامت تھی کہ بعض دنیوی چالاک لوگوں نے اُنہیں عشرہ مبشرہ کے بعد فضیلت میں گیارھویں ہستی بنا دیا تھا اور دوسرے تمام مہاجرین وانصارؓ کو ایک طلیق سے پیچھے دھکیل دیا تھا اور یہ بھی اُن کی بادشاہی کا کرشمہ تھا کہ بعض ماہر بدبختوں نے اُنہیں شیخین کریمین رضی اللہ عنہما سے بھی ''أَسْوَدُ'' (بڑا

سردار) کہہ ڈالا تھا اور افسوس کی بات ہے کہ نواصب میں یہ کھوٹے سکّے اور جھوٹے کرشمے آج تک چل رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر تقدیم؟

ابن آکلۃ الاکباد معاویہ بن ابی سفیان کی بے جا حمایت اور ناجائز دفاع کرنے والے لوگ محض اُن کی خاطر اِس قدر فیاضی وسخاوت کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ غفلت میں اُن سے اللہ تعالیٰ اور سراپا جود عطا سید الاسخیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بھی تقدیم ہو جاتی ہے۔ قرآن وسنت میں تمام کے تمام صحابہ کو جنتی نہیں کہا گیا مگر یہ لوگ محض اپنے ممدوح ومحبوب کی خاطر بلا استثناء سب کے سب اور تمام کے تمام صحابہ کہے جانے والوں کو جنتی قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ بعض نامور علماء کرام دفاعِ معاویہ کے جذبہ سے سرشار ہو کر لکھتے ہیں:

> ''سب سے اللہ نے بھلائی کا وعدہ فرما لیا اور ساتھ ہی اُن کے افعال کی تفتیش کرنے والوں کا منہ بند فرما دیا ''وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ'' (اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کرنے والے ہو) با ایں ہمہ وہ تم سب سے بھلائی کا وعدہ فرما چکا پھر دوسرا کون ہے کہ اُن میں سے کسی کی بات پر طعن کرے؟''۔

(فتاویٰ رضویہ ج۲۹ ص۳۳۷)

ایک اور عالم اِنہیں صاحب کی خاطر بات بناتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''جس طرح سارے نبی گناہ سے معصوم ویسے ہی سارے صحابہ فسق سے مامون ومحفوظ ہیں۔ کیونکہ قرآن کریم نے اُن سب کے عادل متقی پرہیزگار ہونے کی گواہی دی اور اُن سے وعدہ فرمایا مغفرت وجنت کا، إلیٰ أن قال: وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى﴾ (اور سارے صحابہ سے اللہ نے جنت کا وعدہ فرمایا''۔

(امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ص۱۹، ۲۰)

اسی ناجائز دفاع میں کچھ اور حضرات سورۃ التوبہ کی آیت نمبر ۱۰۰ کے تحت لکھتے ہیں:

''اس آیت کے تحت تفسیر صراط الجنان جلد۴، صفحہ ۲۱۹ پر ہے: اس سے معلوم ہوا

کہ سارے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم عادل اور جنتی ہیں ان میں سے کوئی گنہگار اور فاسق نہیں''۔

(فیضان امیر معاویہ ص ۱۶۳)

پہلی بات تو یہ ہے کہ اِن دونوں آیتوں میں ''مِنْ'' تبعیضیہ ہے، سورۃ التوبہ کی آیت میں نہ تو تمام مہاجرین و انصار کا ذکر ہے اور نہ ہی اُن کے بعد آنے والے تمام لوگوں کا ذکر ہے بلکہ فقط اُن کا ذکر ہے جنہوں نے اُن کی اتباع بالاحسان کی، اسی طرح سورۃ الحدید کی آیت میں تمام صحابہ کا ذکر نہیں ہے بلکہ فقط پہلے یا بعد میں انفاق وقتال کرنے والوں کا ذکر ہے۔ اگر ﴿مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْأَنْصَارِ﴾ اور ﴿مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ﴾ میں ہی غور کرلیا جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر سارے کے سارے صحابہ کہے جانے والے عادل اور جنتی ہوں تو پھر متعدد احادیث کی تکذیب لازم آتی ہے۔ مثلاً ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے:

فِيْ أَصْحَابِيْ اِثْنَا عَشَرَ مُنَافِقًا ، فِيْهِمْ ثَمَانِيَةٌ لَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ.

''میرے صحابہ میں بارہ منافق ہیں، اُن میں سے آٹھ جنت میں داخل نہیں ہوں گے حتیٰ کہ اونٹ سوئی کے ناکہ میں داخل ہو''۔

(صحيح مسلم : كتاب صفات المنافقين وأحكامهم، ص ۱۲۸۲ حديث ۲۷۷۹؛ الجامع بين الصحيحين للشامي ج ۱ ص ٥٤ حديث ۷٦)

اِس حدیث میں تو بارہ کا عدد ہے جبکہ بعض احادیث میں بلا عدد مذکور ہے کہ قیامت کے دن صحابہ میں سے کچھ لوگوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دور کردیا جائے گا۔ چنانچہ صحیحین میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حوض کوثر کے ذکر میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

''تم میں سے کچھ لوگ میرے پاس لائے جائیں گے پھر اُنہیں مجھ سے دور کردیا جائے گا، تو میں عرض کروں گا: اے رب! یہ تو میرے صحابہ ہیں۔ کہا جائے گا: آپ نہیں جانتے کہ

انہوں نے آپ کے بعد کیا کیا؟"۔

(بخاري: كتاب الرقاق، باب في الحوض، ص٩٠٩ حديث٦٥٧٦؛صحيح مسلم: باب إثبات حوض نبيناﷺ ١٠٨٦ حديث٢٢٩٠، ٢٢٩١، ٢٢٩٣، ٢٢٩٤، ٢٢٩٥)

مشہور قول "اَلصَّحَابَةُ كُلُّهُمْ عَدُوْلٌ" کو حدیث گمان کرنے والے بعض لوگ مغالطہ آفرینی سے کام لیتے ہوئے اس حدیث سے صحابی نہیں بلکہ امتی مراد لینے کی کوشش کرتے ہیں لیکن دوسری احادیث سے اُن کی ہیرا پھیری کا پول کھل جاتا ہے۔ چنانچہ بعض احادیث کے الفاظ ہیں:

لَيَرِدَنَّ عَلَيَّ الْحَوْضَ رِجَالٌ مِمَّنْ صَحِبَنِيْ وَرَآنِيْ، حَتّٰى إِذَا رَفَعُوْا إِلَيَّ وَرَأَيْتُهُمْ اُخْتُلِجُوْا دُوْنِيْ.

"حوض پر میرے پاس کچھ ایسے اشخاص آئیں گے جو میری صحبت میں رہے ہوں گے اور جنہوں نے مجھے دیکھا ہوگا، حتی کہ جب وہ میری طرف بلند ہوں گے اور میں انہیں دیکھوں گا تو وہ مجھ سے دور کر دیے جائیں گے"۔

(مسند أحمد بتحقيق أحمد شاكر ج١٥ ص٢٣٠ حديث٢٠٣٧٣؛مجمع الزوائد ج١٠ ص٣٦٤ وط: ج٢٢ ص١٣٧ حديث١٨٤١٠؛فتح الباري [دار طيبة] ج١٥ ص٣٣)

سو حلوائی کی دکان پر نانا جی کی فاتحہ دلانے والے فیاض لوگوں سے گزارش ہے کہ وہ جس جس کو جنت میں لے جانے کی استطاعت رکھتے ہوں بے شک لے جائیں لیکن تمام کے تمام صحابہ کو عادل اور جنتی قرار دے کر اللہ جل جلالہ اور اُس کے رسول ﷺ پر تقدیم سے گریز فرمائیں۔

قارئین کرام! دراصل روافض اور نواصب دونوں افراط و تفریط کا شکار ہیں۔ چنانچہ روافض اکثر صالحین کو ظالمین قرار دیتے ہیں اور نواصب بعض ظالمین کو صالحین ثابت کرنے کی کوشش میں رہتے ہیں، جبکہ اعتدال اِن دونوں کے وسط میں ہے۔

دستِ طلقاء پر بیعتِ اطاعت؟

فتاوی رضویہ ج۲۹ ص۳۷۸ پر قوسین میں دو مقام پر لکھا ہوا ہے کہ امام حسن رضی اللہ عنہ نے معاویہ کے

ہاتھ پر بیعتِ اطاعت فرمائی تھی۔قوسین کے وہ الفاظ فاضل بریلی کے نہیں بلکہ کسی اور شخص کے ہیں، لیکن چونکہ نام نہاد مسلکِ رضا کے ٹھیکیدار فتاوی رضویہ میں مرقوم ہر بات کو حجت سمجھتے اور جبراً منواتے ہیں، اِس لیے ہم پہلے اُس مقام کے الفاظ مع سیاق وسباق مکمل نقل کرتے ہیں پھر اُن پر تبصرہ کریں گے۔فتاوی رضویہ میں ہے:

''ہمارے شہزادہ اکبر حضرت سبط (اکبر، حسن) مجتبیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حسبِ بشارت اپنے جدامجد سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ (وآلہ) وسلم کے، بعد اختتام مدت (خلافت راشدہ کہ منہاجِ نبوت پر تیس سال رہی اور سیدنا امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے چھ ماہ مدتِ خلافت پر ختم ہوئی) عین معرکۂ جنگ میں (ایک فوج جرار کی ہمراہی کے باوجود) ہتھیار رکھ دیے (بالقصد والاختیار) اور ملک (اور امور مسلمین کا انتظام وانصرام) امیر معاویہ کو سپرد کر دیا (اور اُن کے ہاتھ پر بیعت اطاعت فرمالی) اگر مدت خلافت ختم ہو چکی تھی اور آپ (خود) بادشاہت منظور نہیں فرماتے تو صحابہ حجاز میں کوئی اور قابلیتِ نظم ونسقِ دین نہ رکھتا تھا جو اُنہیں کو اختیار کیا (اور اُنہیں کے ہاتھ پر بیعتِ اطاعت کرلی) ؟''۔

(فتاوی رضویہ ج۲۹ ص۳۷۸)

قوسین کے مابین''اور اُن کے ہاتھ پر بیعتِ اطاعت فرمالی'' کے الفاظ سے بعض نواصبِ زمانہ نے انتہائی سفیہانہ نتائج اخذ کیے ہیں، اُنہوں نے اِس بیعتِ اطاعت سے یہ سمجھ لیا کہ معاویہ امام حسن وحسین علیہما السلام کے پیرومرشد تھے، جیسا کہ ہم''**شرح کتاب الأربعین في فضائل آل البیت الطاهرین**'' میں اُن کی حماقت پر تبصرہ کر چکے ہیں، جبکہ بعض لوگوں نے اِس سے یہ نتیجہ اخذ کرلیا کہ معاویہ بن ابی سفیان، سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کو پسند تھے۔ہم اِس قول کی کافی تردید کر چکے ہیں، یہاں ہم آپ کے سامنے کسی سربراہِ مملکتِ اسلامیہ کی بیعت کی حقیقت بیان کر رہے ہیں تاکہ آپ خود ہی فیصلہ کرسکیں کہ امام پاک نے بیعت اطاعت فرمائی تھی یا اُنہیں مجبوراً معاہدۂ صلح کرتے ہوئے ہاتھ بڑھانا پڑا تھا۔

خلیفہ یا حاکمِ اسلام کی بیعت کی حقیقت

نواصب اور وکلائے طلقاء راگ الاپتے رہتے ہیں کہ چونکہ سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے ابن صخر کی بیعت کر لی تھی، لہٰذا وہ خلیفہ ہو گئے تھے۔ اِس غلط فہمی کا شکار قدیم و جدید بڑے بڑے لکھاری ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ تو امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے بیعتِ اطاعت فرمائی تھی اور نہ ہی معاویہ بن ابی سفیان خلیفہ تھا۔ اہل سنت کے نزدیک خلیفہ وہ ہوتا ہے جس کو اہل عقد و حل (بااثر علماء وفقہاء) بلا جبر و اکراہ منتخب کریں۔ چنانچہ امام ماوردی شافعی اور قاضی ابویعلیٰ حنبلی لکھتے ہیں:

فَإِذَا اجْتَمَعَ أَهْلُ الْعَقْدِ وَالْحَلِّ لِلِاخْتِيَارِ تَصَفَّحُوا أَحْوَالَ أَهْلِ الْإِمَامَةِ الْمَوْجُودَةِ فِيهِمْ شُرُوطًا، فَقَدَّمُوا لِلْبَيْعَةِ مِنْهُمْ أَكْثَرَهُمْ فَضْلًا وَ أَكْمَلَهُمْ شُرُوطًا، وَمَنْ يَسْرَعُ النَّاسُ إِلَىٰ طَاعَتِهِ وَلَا يَتَوَقَّفُونَ عَنْ بَيْعَتِهِ، فَإِذَا تَعَيَّنَ لَهُمْ مِنْ بَيْنِ الْجَمَاعَةِ مَنْ أَدَّاهُمُ الِاجْتِهَادُ إِلَىٰ اخْتِيَارِهِ عَرَضُوهَا عَلَيْهِ، فَإِنْ أَجَابَ إِلَيْهَا بَايَعُوهُ عَلَيْهَا، وَانْعَقَدَتْ بِبَيْعَتِهِمْ لَهُ الْإِمَامَةُ فَلَزِمَ كَافَّةُ الدُّخُولِ فِي بَيْعَتِهِ وَالِانْقِيَادُ لِطَاعَتِهِ، وَإِنْ امْتَنَعَ عَنِ الْإِمَامَةِ وَلَمْ يُجِبْ إِلَيْهَا لَمْ يُجْبَرْ عَلَيْهَا، لِأَنَّهَا عَقْدُ مُرَاضَاةٍ وَاخْتِيَارٍ، لَا يَدْخُلُهُ إِكْرَاهٌ وَلَا إِجْبَارٌ، وَعَدَلَ عَنْهُ إِلَىٰ مَنْ سِوَاهُ مِنْ مُسْتَحِقِّيهَا فَبُويِعَ عَلَيْهَا.

"پس جب اہل عقد و حل انتخاب کے لیے جمع ہو جائیں تو اُن لوگوں کے کوائف و احوال کی تحقیق کریں جن میں امامت (اقتدار) کی شرائط موجود ہوں، پھر اُن میں اُس شخص کو مقدم رکھیں جو اُن سب سے افضل اور شرائط میں اکمل ہو، جس کی اطاعت میں لوگ دلچسپی لیں اور اُس کی بیعت سے گریز نہ کریں۔ پس جب اہل عقد و حل کی سوچ جماعت میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے پر متفق ہو جائے تو وہ اُس سوچ کو اُس اہل شخص کے سامنے پیش کریں۔ پھر اگر وہ اُسے قبول کر لے تو سب اُس کی بیعت کر

لیس، اُن کی بیعت سے اُس کی امامت منعقد ہو جائے گی تو پوری امت پر اُس کی بیعت میں داخل ہونا اور اُس کی اطاعت کے لیے سرِ تسلیم خم کرنا لازم ہو جائے گا، اور اگر وہ شخص امامت سے منع کرے اور اُس کو قبول نہ کرے تو اُس کو اُس پر مجبور نہیں کیا جائے گا، کیونکہ یہ جانبین سے رضا اور اختیار کا سودا ہے، اِس میں زور و جبر کا کوئی دخل نہیں۔ اُس کے انکار کی صورت میں اُس کو چھوڑ کر دوسرے استحقاق رکھنے والوں کا رُخ کیا جائے اور بیعتِ امامت کی جائے''۔

(الأحکام السلطانیة للماوردي ص ۸،۷ ؛الأحکام السلطانیة لأبي یعلیٰ الحنبلي ص ۲٤)

اِس اقتباس کی چند موٹی موٹی باتوں میں غور فرمایئے:

۱۔ اِس اقتباس میں خلافت و امامت کے بہت زیادہ امیدواروں کی نہیں بلکہ اہلیت رکھنے والے گنتی کے چند لوگوں کی بات ہو رہی ہے۔

۲۔ اِس اقتباس میں خلافت و امامت کے لیے خود کو پیش کرنے کی بات نہیں ہو رہی بلکہ اہل شخص کو تلاش کرنے کی بات ہو رہی ہے۔

۳۔ امام و خلیفہ کو منتخب کرنا اور اربابِ عقد و حل کی سوچ و بچار کے بعد اُس کا منتخب ہونا دونوں باتیں جانبین کی رضامندی سے ہوتی ہیں، اس میں جبر و اکراہ کا کوئی دخل نہیں۔

ایمان و انصاف سے بتایئے! صلح امام حسن علیہ السلام و معاویہ میں اِن میں سے کوئی ایک بھی بات پائی جاتی ہے؟

- کیا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے اہلیتِ خلافت رکھنے والے متعدد لوگوں میں سے معاویہ کو منتخب کیا تھا، یا اُنہیں مجبوراً معاویہ سے ہی صلح کرنا پڑی تھی؟
- کیا معاویہ آرام سے گھر میں بیٹھے تھے کہ اربابِ عقد و حل نے اُنہیں سب سے بہتر جان کر اُنہیں خلافت کی پیش کش کی تھی؟
- کیا معاویہ بن ابی سفیان خلافت کو مسترد کرتے رہے؟

- کیا اربابِ عقد وحل نے اُنہیں خلافت سنبھالنے پر مجبور کیا تھا؟
- کیا یہ معاملہ جانبین سے محض رضا واختیار سے تھا؟
- اگر اِن ساری باتوں کا جواب ہاں میں ہو تو پھر "هُدْنَةٌ عَلىٰ دَخَنٍ" کا کیا مطلب ہوگا؟
- امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے اُس ارشاد کا کیا مطلب ہوگا کہ اُنہوں نے فرمایا: معاویہ جس بات کی طرف بلا رہا ہے اُس میں عزت ہے اور نہ ہی انصاف؟
- اگر سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے معاویہ کو بقصدِ خود اور رضا اور رغبت سے اختیار فرمایا تھا تو پھر اُنہوں نے اُسے فتنہ کیوں کہا تھا؟
- اگر امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے رضا اور رغبت سے بیعت اطاعت کی تھی تو بعد از بیعت معاویہ کے خلاف جنگ کرنے کو خوارج کی جنگ سے بہتر کیوں فرمایا تھا؟
- اگر امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام اور معاویہ کے مابین یہ معاملہ باہمی رضامندی سے تھا تو پھر معاویہ نے امام حسن علیہ السلام کی اچانک شہادت کو مصیبت کیوں نہ سمجھا؟
- اگر امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے اپنی خوشی اور رضا سے معاویہ کو اقتدار سپرد فرمایا تھا تو پھر وہ معاویہ کے محسن ہوئے اور اگر بندہ احسان فراموش نہ ہو تو اُسے اُس کا محسن محبوب ہوتا ہے لیکن کیا وجہ ہے کہ جب معاویہ کے روبرو ایک بدبخت نے امام پاک کو انگارہ کہا تو معاویہ اُس پر غضبناک نہ ہوا؟
- کیا خاندانی آدمی کے نزدیک محسن شخص کا اچانک شہید ہو جانا مصیبت نہیں ہوتا؟

بیعت اور پھر نافرمانی؟

بیعت رضامندی سے ہوتی ہے، خواہ بیعتِ امامت (اقتدار) ہو یا بیعتِ طریقت۔ چنانچہ علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں:

اِعْلَمْ أَنَّ الْبَيْعَةَ هِيَ الْعَهْدُ عَلَى الطَّاعَةِ.

"جان لو کہ بیعت اطاعت کا عہد ہے"۔

(مقدمة ابن خلدون ج۲ ص۵۸۹)

علامہ خازن لکھتے ہیں:

وَأَصْلُ الْبَيْعَةِ: الْعَقْدُ الَّذِي يَعْقِدُهُ الإِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهِ مِنْ بَذْلِ الطَّاعَةِ لِلإِمَامِ ، وَالْوَفَاءُ بِالْعَهْدِ الَّذِي الْتَزَمَهُ لَهُ.

''بیعت کی حقیقت وہ عقد (گرہ) ہے جو انسان خود پر لگاتا ہے امام کی اطاعت کے لیے، اور اُس عہد کو نبھانا ہے جس کو اُس نے خود پر لازم کرلیا''۔

(لباب التأويل ج٤ ص١٥٦)

بتایئے! کیا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام اور اُن کے پیروکاروں نے اپنی مرضی اور رغبت سے معاویہ بن صخر کی بیعت کو خود پر لازم کیا تھا؟ اگر نہیں تو پھر کیونکر سمجھ لیا گیا کہ معاویہ حقیقی امام وخلیفہ ہوگیا اور امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام اُس کے پیروکاروں میں شامل ہوگئے؟ حیرت ہے کہ امام پاک تو محض کشت وخون سے بچنے کی خاطر شرعی اصولوں کے تحت اُس کے ساتھ شرائط طے کر کے خود اقتدار سے دست بردار ہوگئے مگر نواصب وملوکیت پسند لوگوں نے اِس مجبوری کو امام پاک کی رضا ورغبت اور بیعتِ اطاعت کا نام دے دیا، اور بعض نامرادوں نے تو اِس کو پیری مریدی کی بیعت سمجھ لیا۔ تف ہے ایسی عقل مندی پر، افسوس ہے ایسے پڑھنے پڑھانے پر اور پھٹکار ہے ایسی نام نہاد دین داری پر۔

اگر امام پاک علیہ السلام نے از خود بیعتِ معاویہ کا قلادہ زیبِ گردن فرمایا ہوتا تو کیا وہ معاویہ کے اولین حکم کو ہی مسترد کردیتے؟ ذرا سوچیے تو سہی! جب امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے معاویہ کے پہلے حکم کو ہی ٹھوکر مارتے ہوئے فرمایا تھا کہ خوارج کے خلاف جنگ کرنے سے تیرے خلاف جنگ کرنا زیادہ بہتر ہے تو پھر اُن کی صلح کو بیعتِ اطاعت کہنا کہاں کی دانش مندی ہے؟ غور کر کے بتایئے کہ متقی اور اصول پسند بندہ جس شخص کو فتنہ سمجھتا ہو تو اُس کی بیعتِ اطاعت قبول کرسکتا ہے؟ سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے تو صلح اور دست برداری کے بعد بھی معاویہ کو فتنہ قرار دیا تھا، تو پھر وہ اُس کی بیعتِ اطاعت کیسے قبول کرتے؟

تنبیہ:

یاد رکھنا چاہیئے کہ بیعتِ اطاعت کے الفاظ اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے نہیں ہیں، لیکن چونکہ موجود

اُنہیں کے فتاوی میں ہیں، اس لیے بعض لوگ دھوکہ کھا جاتے ہیں جبکہ کچھ ٹھیکیدار قسم کے لوگ اُن الفاظ کو قولِ اعلیٰ حضرت گردانتے ہوئے حجت بنا لیتے ہیں، لہٰذا ملحوظِ خاطر رہے کہ یہ اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ نہیں ہیں۔ بالفرض اگر یہ اُن کے اپنے الفاظ بھی ہوتے تو پھر بھی مسترد کر دیے جاتے، کیونکہ ''کُلٌّ مَأْخُوْذٌ مِنْ قَوْلِهٖ وَمَرْدُوْدٌ عَلَيْهِ إِلَّا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ'' (رسول اللہ ﷺ کے علاوہ ہر ایک کا کلام مقبول بھی ہوتا ہے اور مردود بھی)

مملکت بذریعہ قوت و بغاوت

رضا و رغبت، بیعتِ اطاعت اور اہلیتِ معاویہ وغیرہ الفاظ یہ سب بعد والوں کے ڈھکوسلے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ معاویہ بن ابی سفیان تختِ اقتدار پر مکر و فریب، لاؤلشکر اور زور و جبر سے پہنچا تھا، اور اِس انداز سے حاصل کیا جانے والا اقتدار خلافت نہیں سلطنت ہوتا ہے اور تختِ اقتدار پر براجمان ہونے والا انسان خلیفہ نہیں بلکہ ملک (بادشاہ) ہوتا ہے۔ بعد والے لوگ خلیفہ یا خلیفۂ راشد کی رٹ لگا لگا کر بیشک سادہ لوح عوام کو گمراہ کرتے رہیں لیکن اُس دور کے باہوش، معتبر اور حقائق شناس لوگ بخوبی سمجھتے تھے کہ موصوف اقتدار پر کیسے پہنچے؟ آیئے! پہلے ہم آپ کے سامنے اُس دَور کی بعض معتبر ہستیوں کا قول پیش کرتے ہیں پھر پوچھیں گے کہ کس کا قول زیادہ معتبر ہے؟ امام ذہبی لکھتے ہیں:

> ''عمرو بن الحکم عوانہ سے روایت کرتے ہیں کہ سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ معاویہ کے پاس گئے تو اُنہیں امیر المومنین کے الفاظ سے سلام نہ کیا (اور کہا: اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ أَیُّهَا الْمَلِکُ! أنساب الأشراف) معاویہ نے اس کی وجہ پوچھی تو اُنہوں نے فرمایا: ہم مومن ہیں اور ہم نے آپ کو اپنا امیر نہیں بنایا، پھر سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم تو اس حال میں بہت خوش ہو، اور اللہ کی قسم! میں اگر اس مقام پر ہوتا جہاں اب تم ہو تو مجھے اس میں خوشی نہ ہوتی کہ میں ذرہ برابر خون بہا کر یہ مقام حاصل کرتا''۔

(سیر أعلام النبلاء ج۱ ص۱۲۲؛ الکامل فی التاریخ ج۳ ص۹؛ تاریخ مدینۃ دمشق ج۲۰ ص

۳۵۹؛حلم معاوية لابن أبي الدنياص ۲۴؛مسالك الأبصار لابن فضل الله العمري ج۲۴ص ۲۷۲؛أنساب الأشراف للبلاذري،في ترجمة معاوية ج۵ص ۳۱؛مختصر تاريخ دمشق ج ۹ ص ۲۶۹)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے ساتھ تو معاویہ کی صلح ہوئی تھی اور کسی قسم کی خون ریزی نہیں ہوئی تھی، پھر سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے معاویہ کو کیوں فرمایا تم خون بہا کر اقتدار پر پہنچے ہو؟ جواب ظاہر ہے کہ اِس حقیقت کا اظہار سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے موصوف کی سابقہ تمام کوششوں کو مدنظر رکھتے ہوئے فرمایا تھا، کیونکہ موصوف نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ جنگ بھی اقتدار کی خاطر کی تھی، پھر تحکیم کی چال بھی اسی لیے چلی تھی اور تحکیم کے بعد سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے پیروکاروں کے علاقہ جات، مکہ، مدینہ اور یمن وغیرہ پر حملے اور لوٹ مار کی غرض بھی یہی تھی۔ سو سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے ماضی قریب میں تسلسل کے ساتھ رونما ہونے والے خونی واقعات کو مدنظر رکھتے ہوئے مذکورہ بالا الفاظ میں اظہارِ خیال فرمایا تھا۔ اب بتائیے کہ کس کی بات حق ہے، آیا صحابہ میں سے سیدنا سعد بن ابی وقاص اور دوسرے متعدد حضرات کا یہ مشاہدہ حق ہے کہ موصوف خون ریزی اور زور و جبر سے اقتدار پر پہنچے یا چودھویں صدی کے بعض علماء ہند کا یہ لکھنا حق ہے کہ امام حسن رضی اللہ عنہ نے معاویہ کو پورے حجاز سے زیادہ اہل سمجھ کر اُسے اقتدار سونپا تھا؟

بیٹا خون بہانے سے مجتنب رہا اور بابا نے خون بہا دیا؟

گذشتہ سطور میں تفصیلاً بیان ہو چکا ہے کہ سیدنا امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ معاویہ بن ابی سفیان کے خلاف جنگ کرنے کو خوارج کے خلاف جنگ سے زیادہ اہم سمجھتے تھے مگر اُنہوں نے جنگ نہ فرمائی اور اس کی وجہ بیان فرمائی "لِحَقْنِ دِمَاءِ الْمُسْلِمِيْنَ" (مسلمانوں کے خون کے تحفظ کی خاطر) یہاں اکثر ذہنوں میں سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ بیٹا خونِ مسلمین کی خاطر جس شخص کے ساتھ جنگ کرنے سے مجتنب رہا اُس کے بابا نے اُس شخص کے ساتھ جنگ کر کے خون کیوں بہایا تھا؟

اِس کا جواب یہ ہے کہ اُس کے بابا پر جنگ مسلط کر دی گئی تھی۔ سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے بابا کریم علیہ السلام نے بارہا اُس شخص کو کتاب و سنت کی طرف بلایا تھا مگر بسیار کوششوں کے باوجود وہ شخص اپنی بغاوت

سے باز نہ آیا اور جنگ پر آمادہ رہا تو اُس پیکرِ صدق وصفا کو مجبوراً قرآن پر عمل کرتے ہوئے جنگ کرنا پڑی۔ نبی کریم ﷺ پہلے ہی صحابہ کرام کو فرما چکے تھے کہ ”تم میں سے ایک شخص تاویلِ قرآن پر اسی طرح جنگ کرے گا جس طرح میں نے تنزیلِ قرآن پر جنگیں کیں“۔ دوسری حدیث میں فرمایا کہ ”وہ جہاں ہوگا حق اُسی کے ساتھ ہوگا“۔ سو قصاصِ عثمان کا دعویٰ محض بہانہ تھا اصل ہدف اقتدار کو پانا تھا۔ ابن صخر کی تو پہلے سے ہی خواہش تھی کہ حضرت عثمان قتل ہو جائیں تاکہ اُنہیں کا کاروبار چلے، جیسا کہ اِس سے قبل امام ذہبی اور دوسرے محدثین کے حوالے سے لکھا جا چکا ہے۔ سو سیدنا علی بغاوت کو کچلنے پر مجبور ہوئے تھے، وہ بغاوت ختم ہونے کو تھی کہ قرآن مجید کو نیزوں پر اٹھا لیا گیا تو پھر سیدنا علی علیہ السلام تحکیم کو ماننے پر مجبور ہو گئے۔ تحکیم میں کیے ہوئے معاہدوں پر معاویہ بن ابی سفیان قائم نہ رہا تو سیدنا علی پھر اُس کی بغاوت کو کچلنے کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ اُنہیں شہید کر دیا گیا اور پھر اُسی لشکر کو لے کر سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے شام کا رُخ فرمایا تو معاویہ نے اُنہیں صلح کی پیش کش کر دی تو امام پاک نے سمجھ لیا کہ قصاص تو اس کا مطمحِ نظر ہی نہیں ہے، اِس کا مقصد تو فقط کرسی ہے تو اُنہوں نے شرائط طے فرما کر باقاعدہ معاہدہ نامہ پر دستخط کرا کر صلح فرمالی۔ صلح کی وہ موٹی موٹی شقیں آپ پڑھ چکے ہیں، اُن میں دوسری شرائط کے ساتھ ساتھ باقاعدہ یہ شرط بھی تھی کہ مولا علی علیہ السلام کے پیروکار جہاں جہاں بھی ہوں اُنہیں چھیڑا نہیں جائے گا۔ اِس شرط پر مخالف بول سکتا تھا کہ نہیں قاتلین سے تو قصاص لیا جائے گا مگر وہ نہیں بولا۔ اِس سے ثابت ہوا کہ قصاص اُس کا مقصد نہیں تھا، اُس کا مقصد اقتدار تھا، اگر قصاص ہی مقصد ہوتا تو وہ بول اُٹھتا کیونکہ مقصد کبھی بھولا نہیں جاتا۔ پورا تو اُس نے دوسری شرائط کے ساتھ ساتھ اِس شرط کو بھی نہیں کیا تھا، چونکہ بعد میں اُس نے سیدنا حجر بن عدی، اُن کے ساتھیوں اور دوسرے کئی حضرات کو تہ تیغ کیا تھا مگر فی الفور اُس نے اِس شرط کو اِس لیے تسلیم کر لیا تھا کہ اُس کی دلی خواہش پوری ہو رہی تھی۔ گویا سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے شرائط لکھواتے وقت ہی اُس کے دعوائے قصاصِ عثمان کی قلعی کھول کر رکھ دی تھی۔ بعد میں بھی لوگوں پر امام پاک کی بصیرت عیاں ہوگئی کہ ابن صخر نے مطلق العنان بادشاہ ہونے کے باوجود باقاعدہ شرعی طریقے سے گواہیاں قائم کر کے حضرت عثمان بن عفان کے قاتلین سے قصاص نہ لیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح سیدنا علی المرتضیٰ علیہ السلام کو مجبوراً جنگ کرنا پڑی اور مجبوراً ہی تحکیم کو قبول کرنا پڑا، اسی طرح سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کو بھی مجبوراً ایک نااہل شخص کے ساتھ صلح کرنا پڑی۔ یہ دنیا عالم اسباب ہے، اِس میں ظاہری اسباب کو مدنظر رکھتے ہوئے فیصلے کرنے ہوتے ہیں اور بسا اوقات غلط لوگوں کی اُلٹی شرائط کو بھی ماننا پڑتا ہے۔ بتائیے! صلح حدیبیہ میں اُلٹی شرائط ماننے کی آخر ظاہری وجوہ کیا تھیں؟ سو جس طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قریش کے غلط لوگوں کے ساتھ مجبوراً معاہدہ کرنا پڑ گیا تھا اسی طرح سیدنا علی مرتضیٰ اور امام حسن مجتبیٰ علیہما السلام کو بھی قریش کے غلط لوگوں کے ساتھ مجبوراً معاہدہ کرنا پڑ گیا تھا۔ اہل اسلام کو کبھی بھی وقت کے تقاضوں کے مطابق دشوار فیصلے کرنے پڑ جائیں تو ایسے فیصلے اُن کے لیے اُسوہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ علامہ آلوسی سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۹۵ کے الفاظ ﴿وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

وَاُسْتُدِلَّ بِالآيَةِ عَلٰى تَحْرِيمِ الإِقْدَامِ عَلٰى مَا يَخَافُ مِنْهُ تَلَفُ النَّفْسِ، وَجَوَازُ الصُّلْحِ مَعَ الْكُفَّارِ وَالْبُغَاةِ إِذَا خَافَ الإِمَامُ عَلٰى نَفْسِهٖ أَوْ عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ.

"اِس آیت سے ایسا قدم اُٹھانے کی حرمت کی دلیل حاصل کی گئی ہے جس سے جان ضائع ہونے کا اندیشہ ہو، اور اِس میں یہ بھی دلیل ہے کہ کفار اور باغیوں کے ساتھ ایسے حالات میں صلح جائز ہے جب امام کو اپنی یا مسلمانوں کی جان کا خوف ہو"۔

(روح المعاني ج۳ ص ۱۷۰)

شیخ محمد جمال الدین قاسمی نے اِس بات کو زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

تَدُلُّ الآيَةُ عَلٰى جَوَازِ الْهَزِيْمَةِ فِي الْجِهَادِ إِذَا خَافَ عَلَى النَّفْسِ، وَتَدُلُّ عَلٰى جَوَازِ تَرْكِ الْأَمْرِ بِالْمَعْرُوْفِ إِذَا خَافَ، لِأَنَّ كُلَّ ذٰلِكَ إِلْقَاءُ النَّفْسِ إِلَى التَّهْلُكَةِ، وَتَدُلُّ عَلٰى جَوَازِ مُصَالَحَةِ الْكُفَّارِ وَالْبُغَاةِ إِذَا خَافَ الإِمَامُ عَلٰى نَفْسِهٖ أَوْ عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ، كَمَا فَعَلَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ

عَامَ الْحُدَيْبِيَةِ، وَكَمَا فَعَلَهُ أَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلِيٌّ علیہ السلام بِصِفِّيْنَ، وَكَمَا فَعَلَهُ الْحَسَنُ علیہ السلام مِنْ مُصَالَحَةِ مُعَاوِيَةَ.

''یہ آیت دلالت کر رہی ہے کہ جب انسان کو اپنی جان کا خدشہ ہو تو اُس وقت جہاد سے پیچھے ہٹنا جائز ہے، اور یہ کہ جب خوف ہو تو امر بالمعروف ترک کرنا جائز ہے، کیونکہ یہ صورتیں خود کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف ہیں، اور اِس جواز پر بھی دلالت کرتی ہے کہ جب امامِ وقت کو اپنی اور مسلمانوں کی جانوں کا خدشہ ہو تو وہ کافروں اور باغیوں کے ساتھ مصالحت کر لے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے حدیبیہ کے سال کی تھی اور جیسا کہ سیدنا مولیٰ علی علیہ السلام نے جنگِ صفین میں کی تھی اور جیسا کہ سیدنا امام حسن علیہ السلام نے معاویہ کے ساتھ صلح فرمائی تھی''۔

(محاسن التأويل ج۳ ص ۴۸۱)

علامہ محمد جمال الدین قاسمی کی بیان کردہ ترتیب سے معلوم ہوا کہ بنو ہاشم کو حق کے تسلسل کی خاطر بار بار باطل سے صلح کرنا پڑی، لہٰذا اِس میں مستقبل میں اکابرینِ اُمتِ مسلمہ کے لیے بھی اُسوہ ہے کہ اُنہیں بھی کبھی مجبوراً باطل سے سمجھوتہ کرنا پڑ جائے تو وہ باطل کو باطل سمجھتے ہوئے اُس کے ساتھ بالشرائط معاہدۂ صلح کر سکتے ہیں۔

فی الجملہ یہ کہ مجبوری کے عالم میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے اقدام سے معاویہ اور اُن کے گروہ کا باغی ہونا ظاہر ہوا، اور جب سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد بھی باغی لوگوں کی چشمِ بصیرت وا نہ ہوئی تو پھر یہ حقیقت بھی کھل کر سامنے آگئی کہ اُن کی تمام تر تگ و دو فقط اقتدار کی خاطر تھی۔ اِس سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا حق پر ہونا اور مخالف کا باطل پر ہونا روزِ روشن سے بھی زیادہ عیاں ہو گیا، یہی وجہ ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ پر جب قاتلانہ حملہ ہوا تو اُنہوں نے نعرہ مارا ''فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ'' (ربِ کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا) نعرہ مارنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ اُس وقت بھی باغیوں کی وعدہ خلافی کو مدِنظر رکھتے ہوئے بارِ دگر اُن کے خلاف جہاد کی تیاریوں میں مصروف تھے اور چونکہ یہ نبوی اور قرآنی مشن کی تکمیل کی مصروفیات تھیں اور اسی دوران اُن پر

حملہ ہو گیا تو اُنہوں نے خود کو بارگاہِ الٰہی میں سرخرو سمجھتے ہوئے یہ نعرہ مارا۔

امام حسن رضی اللہ عنہ پر چونکہ یہ تمام تر حقائق و احوال عیاں ہو چکے تھے اور وہ سمجھ چکے تھے کہ مخالف قصاصِ عثمان رضی اللہ عنہ یا دین کی خاطر برسرِ پیکار نہیں بلکہ اُس کا مطمحِ نظر فقط دنیا ہے تو وہ اپنے لشکر کے تمام معاملات اور مخالف کی تمام چالوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اُمتِ مسلمہ کی بھلائی کی خاطر چندروزہ اقتدار سے دست بردار ہو گئے۔ یوں سمجھئے کہ سید العالمین محمد رسول اللہ ﷺ ہوں، سید المسلمین علی المرتضیٰ علیہ السلام ہوں یا سید اشبابِ اہل الجنۃ حسنین کریمین علیہما السلام ہوں، سب اپنے اپنے وقت میں اپنی اپنی ذمہ داریاں پوری فرما کر اُس مقام کی طرف روانہ ہو گئے جہاں ہمیشہ کے لیے اُن کا اقتدار ہو گا۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰی آلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ.

سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ. وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ.

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

مآخذ ومراجع

حديث

١۔ **الآحاد والمثاني:** أبوبكرأحمد بن عمروبن أبي عاصم،متوفّیٰ٢٨٧ ھ، دارالراية، الرياض، الطبعةالأولیٰ١٤١١ھ.

٢۔ **إتحاف الخيرة المهرة بزوائد المسانيد العشرة:** أحمدبن أبي بكربن إسماعيل البوصيري،متوفّیٰ٨٤٠ھ،دارالوطن،الرياض،الطبعةالأولیٰ١٤٢٠ھ. وط:مكتبةالرشد، الرياض،الطبعةالأولیٰ١٤١٩ھ.

٣۔ **الأحاديث المختارة مما ليس في الصحيحين:** ضياء الدين محمد بن عبد الواحد الحنبلي،متوفّیٰ٦٤٣ھ،مكتبة النهضة الحديثية،مكةالمكرمة، الطبعة الأولیٰ ١٤١٠ھ.

٤۔ **الإحسان بترتيب صحيح ابن حبان:** أبوحاتم محمد بن حبان البستي،متوفّیٰ٣٥٤ھ، مؤسسة الرسالة، بيروت،الطبعة الثالثة ١٤١٨ھ.

٥۔ **أخبارالحسن :** أبوالقاسم سليمان بن أحمد الطبراني، متوفّیٰ٣٦٠ھ، دار الأوراد، الكويت،١٤١٢ھ.

٦۔ **تقريب البغية بترتيب أحاديث الحلية:** نورالدين علي بن أبي بكر الهيثمي، متوفّیٰ ٨٠٧ھ،دارالكتب العلمية،بيروت،الطبعةالأولیٰ١٤٢٠ھ.

٧۔ **الجامع الصحيح المسند من حديث رسول الله ﷺ وسننه وأيامه:** (بخاري)إمام محمد بن إسمعيل البخاري ،متوفّیٰ ٢٥٦ھ،دارالسلام،الرياض،الطبعة الثانية١٤١٩ھ.

٨۔ **الجامع الصغيرفي أحاديث البشيرالنذير ﷺ:** جلال الدين عبدالرحمان بن أبي بكر السيوطي،متوفّیٰ٩١١ھ،مكتبةنزارالمصطفیٰ الباز،مكةالمكرمة،الطبعةالأولی١٤١٨ھ.

٩۔ **الجامع الكبيروهوسنن الترمذي:** إمام أبوعيسیٰ محمد بن عيسیٰ الترمذي،متوفّیٰ ٢٧٩ھ، دارالغرب الإسلامي،بيروت،الطبعةالأولیٰ١٩٩٦.

١٠۔ **جامع المسانيد:** أبوالفرج عبدالرحمن بن علي الجوزي الحنبلي، متوفى ٥٩٧ ھ، مكتبة الرشد، الرياض، الطبعة الأولىٰ ١٤٢٦ھ.

١١۔ **جامع المسانيد والسنن:** أبوالفداء إسماعيل بن كثير الدمشقي، متوفىٰ ٧٧٤ھ، دار الفكر، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤٢٠ھ.

١٢۔ **الجمع بين الصحيحين:** محمد بن فتوح الحُميدي، متوفّى ٤٨٨ھ، دار ابن حزم، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٩ھ.

١٣۔ **جمع الجوامع:** حافظ جلال الدين عبدالرحمان بن أبي بكر السيوطي، متوفىٰ ٩١١ھ، دار السعادة، مصر ١٤٢٦ھ.

١٤۔ **حلية الأولياء وطبقات الأصفياء:** أبو نُعَيم أحمد بن عبد الله الأصبهاني، متوفىٰ ٤٣٠ھ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤١٨ھ، وط: دار الفكر، بيروت، ١٤١٦ھ.

١٥۔ **خصائص أمير المؤمنين علي بن أبي طالب ﷺ:** إمام أبو عبدالرحمان أحمد بن شعيب النسائي، متوفىٰ ٣٠٣ھ، دار الكتاب العربي، بيروت، الطبعة الثانية ١٤١٧ھ. وط: بتحقيق البلوشي، مكتبة المعلىٰ، الكويت، الطبعة الأولىٰ ١٤٠٦ھ.

١٦۔ **السنة:** إمام أحمد بن عمرو بن أبي عاصم الشيباني، متوفىٰ ٢٨٧ھ، المكتب الإسلامي، بيروت، الطبعة الثالثة ١٤١٣ھ، وط: دار الصميعي، الرياض، الطبعة الأولىٰ ١٤١٩ھ.

١٧۔ **سنن ابن ماجة:** إمام أبو عبد اللّٰه محمد بن يزيد متوفىٰ ٢٧٣ھ، دار المعرفة، بيروت، الطبعة الثانية ١٤١٨ھ .

١٨۔ **سنن أبي داود:** أبوداود سليمان بن الأشعث السجستاني، متوفىٰ ٢٧٥ھ، دار المعرفة، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤٢٣ھ، وط: دار ابن حزم، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤١٨ھ.

١٩۔ **سنن الدارمي:** إمام أبو عبدالله عبدالرحمان الدارمي، متوفىٰ ٢٥٥ھ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤١٧ھ.

٢٠۔ **سنن سعيد بن منصور:** إمام سعيد بن منصور خراساني مكي، متوفىٰ ٢٢٧ھ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤٠٥ھ.

٢١۔ **السنن الکبریٰ:** إمام أبوعبدالرحمن أحمدبن شعیب النسائي،متوفّیٰ٣٠٣ھ،مؤسسة الرسالة،بیروت،الطبعةالأولیٰ١٤٢١ھ،وط:دارالکتب العلمیة،بیروت،الطبعةالأولیٰ١١ ١٤ھ.

٢٢۔ **السنن الکبریٰ** :إمام أبو بکر أحمد بن حسین البیهقي، متوفّیٰ٤٥٨ھ،دارالکتب العلمیة،بیروت،الطبعةالأولیٰ١٤١٤ھ ، وط:مرکزهجرللبحوث والدراسات العربیة والإسلامیة،القاهرة،الطبعةالأولیٰ١٤٣٢ھ.

٢٣۔ **السنن المجتبی (سنن النسائي):** إمام أبو عبد الرحمن أحمد بن شعیب النسائي، متوفّیٰ ٣٠٣ھ ، دارالمعرفة، بیروت ،الطبعة الثالثة ١٤١٤ھ.

٢٤۔ **شرح السنة:** إمام حسین بن مسعود الفراء البغوي،متوفّیٰ٥١٦ھ،المکتب الإسلامي، بیروت،الطبعةالثانیة١٤٠٣ھ.

٢٥۔ **شرح مشکل الآثار:** إمام أبوجعفرأحمدبن محمدالطحاوي،متوفّیٰ٣٢١ھ،مؤسسة الرسالة،بیروت،الطبعةالأولیٰ١٤١٥ھ

٢٦۔ **شرح معاني الآثار:** إمام أبو جعفرأحمدبن محمدالطحاويمتوفّیٰ٣٢١ھ،عالم الکتب، بیروت، الطبعةالأولیٰ ١٤١٤ھ .

٢٧۔ **صحیح الجامع الصغیروزیادته:** محمدناصرالدین الألباني،متوفّیٰ١٤٢٠ھ،المکتب الإسلامي،بیروت،الطبعةالثالثة١٤٠٨ھ.

٢٨۔ **غایةالمقصد في زوائد المسند:** نورالدین علي بن أبي بکر الهیثمي، متوفّیٰ ٨٠٧ھ،دارالکتب العلمیة،بیروت،الطبعةالأولیٰ١٤٢١ھ.

٢٩۔ **کتاب الأموال:** إمام أبوعبید القاسم بن سلام،متوفّیٰ٢٢٤ھ،دارالهدي النبوي، مصر، الطبعة الأولیٰ١٤٢٨ھ.

٣٠۔ **کتاب الأموال** : إمام حمید بن زنجویه ، متوفّیٰ ٢٥١ھ ، مرکز الملك فیصل للبحوث والدراسات الإسلامیة،الریاض،الطبعة الأولیٰ ١٤٠٦ھ.

٣١۔ **کتاب الأموال:** أبوجعفرأحمدبن نصرالداودي المالکي،متوفّیٰ٤٠٢ھ،دار الکتب العلمیة،بیروت،الطبعةالأولیٰ١٤٢٩ھ.

٣٢۔ **كتاب الفتن:** حافظ أبوعبدالله نعيم بن حماد المروزي، متوفّیٰ ٢٢٨ھ، مكتبة التوحيد، القاهرة، الطبعة الأولیٰ ١٤١٢ھ، وط: دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولیٰ ١٤١٨ھ.

٣٣۔ **كشف الأستار عن زوائد البزار:** حافظ نور الدين علي بن أبي بكر الهيثمي، متوفّیٰ ٨٠٧ھ، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الأولیٰ ١٤٠٤ھ.

٣٤۔ **كنز العمال في سنن الأقوال والأفعال:** علامة علي متقي بن حسام الدين برهانبوري، متوفّیٰ ٩٧٥ھ، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الأولیٰ ١٤٠٥ھ.

٣٥۔ **مجمع الزوائد ومنبع الفوائد:** حافظ نور الدين علي بن أبي بكر الهيثمي، متوفّیٰ ٨٠٧ھ، دار الفكر، بيروت، الطبعة الأولیٰ ١٤١٤ھ. وط: دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الثانية ٢٠٠٩ء وط: دار المنهاج، جدة، الطبعة الأولیٰ ١٤٣٦ھ.

٣٦۔ **مختصر زوائد مسند البزار:** حافظ أحمد بن علي بن حجر العسقلاني، متوفّیٰ ٨٥٢ھ، مؤسسة الكتب الثقافية، الصنائع، الطبعة الثالثة ١٤١٤ھ.

٣٧۔ **المستدرک علی الصحيحين:** إمام أبو عبد الله محمد بن عبدالله الحاكم نيشاپوري متوفّیٰ ٤٠٥ھ، دار المعرفة، بيروت، الطبعة الأولیٰ ١٤١٨ھ، وط: قديمة، دار المعرفة، بيروت، وط: دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الثانية ١٤٢٢ھ.

٣٨۔ **مسند أبي يعلى الموصلي:** إمام أحمد بن علي المثنى التميمي، متوفّیٰ ٣٠٧ھ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولیٰ ١٤١٨ھ. وط: دار المأمون، دمشق، الطبعة الأولیٰ ١٤٣٠ھ.

٣٩۔ **المسند:** إمام أحمد بن حنبل، متوفّیٰ ٢٤١ھ، عالم الكتب، بيروت، الطبعة الأولیٰ ١٤١٩ھ. وط: دار الحديث القاهرة، الطبعة الأولیٰ ١٤١٦ھ، وط: مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الأولیٰ ١٤٢١ھ، وط: دار المنهاج، الرياض، ١٤٢٩ھ.

٤٠۔ **مسند الشافعي مع شرح الشافي لابن الأثير:** إمام محمد بن إدريس الشافعي، متوفّیٰ ٢٠٤ھ، مكتبة الرشد، الرياض، الطبعة الأولیٰ ١٤٢٦ھ.

٤١۔ **مسند الشاميين:** إمام أبو القاسم سليمان بن أحمد الطبراني، متوفّیٰ ٣٦٠ھ، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الأولیٰ ١٤١٦ھ.

٤٢ـ **مسند فاطمة الزهراء علیها السلام**: إمام جلال الدين سيوطي، متوفّیٰ ٩١١هـ، مؤسسة الكتب الثقافية، الصنائع، الطبعة الأولیٰ ١٤١٣هـ.

٤٣ـ **المسند**: إمام سليمان بن داود بن جارود الطيالسي، متوفّیٰ ٢٠٣هـ، دار المعرفة، بيروت. وط: دار الكتب العلمية، الطبعة الأولیٰ ١٤٢٥هـ، وط:

٤٤ـ **المسند الجامع** : دكتور بشار عواد معروف وشركاه، دار الجيل، بيروت، الطبعة الأولیٰ ١٤١٣هـ.

٤٥ـ **مشكاة المصابيح**: إمام عبدالله محمد بن عبدالله الخطيب التبريزي، متوفّیٰ ٧٤١هـ، دار الأرقم، بيروت. وط: المكتب الإسلامي، بيروت، الطبعة الثانية ١٣٩٩هـ.

٤٦ـ **المصنّف**: إمام عبد الرزاق بن همام الصنعاني، متوفّیٰ ٢١١هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولیٰ ١٤٢١هـ. وط: المجلس العلمي، جنوب إفريقة، الطبعة الأولیٰ ١٣٩٠هـ.

٤٧ـ **المصنّف** : إمام أبوبكر عبدالله بن محمد بن أبي شيبة، متوفّیٰ ٢٣٥هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولیٰ ١٤١٦هـ وط: مكتبة الرشد، الرياض، الطبعة الأولیٰ ١٤٢٥هـ.

٤٨ـ **المطالب العالية بزوائد المسانيد الثمانية** : أحمد بن علي بن حجر العسقلاني، متوفّیٰ ٨٥٢هـ، دار العاصمة، الرياض، الطبعة الأولیٰ ١٤١٩هـ.

٤٩ـ **المعجم الكبير**: أبو القاسم سليمان بن أحمد الطبراني، متوفّیٰ ٣٦٠هـ ، دار إحياء التراث العربى، بيروت، وط: دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولیٰ ١٤٢٨هـ. وط: مكتبة ابن تيمية، القاهرة.

٥٠ـ **المقصد العلي في زوائد مسند أبي يعلى الموصلي**: حافظ نور الدين علي بن أبي بكر الهيثمي، متوفّیٰ ٨٠٧هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولیٰ ١٤١٩هـ.

٥١ـ **موطأ الإمام مالك ، رواية محمد بن الحسن الشيباني: [موطأ محمد]** متوفّیٰ ١٨٩هـ ، دار القلم، دمشق، الطبعة الأولیٰ ١٤١٣هـ.

٥٢ـ **المهذب في اختصار السنن الكبير للبيهقي**: إمام أبو عبد الله محمد بن أحمد الذهبي، متوفّیٰ ٧٤٨هـ، دار الوطن، الطبعة الأولیٰ ١٤٢٢هـ.

تفسیر

۵۳۔ **أحكام القرآن:** حجة الإسلام إمام أبوبكر أحمد بن علي الرازي الجصاص، متوفّیٰ ۳۷۰ھ،دار إحياء التراث العربي،بيروت،۱۴۱۲ھ.

۵۴۔ **البحر المحيط:** علامة أبوالحيان بن محمد بن يوسف أندلسي،متوفّیٰ ۷۵۴ھ،دار الفكر، بيروت،الطبعة الأولیٰ ۱۴۱۲ھ،وط: دار الكتب العلمية،بيروت،الطبعة الأولیٰ ۱۴۱۳ھ.

۵۵۔ **تأويلات أهل السنة:** أبومنصور محمد بن محمد بن محمود الماتريدي، متوفّیٰ ۳۳۳ھ،دار الكتب العلمية،بيروت،الطبعة الأولیٰ ۱۴۲۶ھ.

۵۶۔ **التحرير و التنوير:** محمد الطاهر بن عاشور،دار التنسية،تونس،۱۹۸۴ء.

۵۷۔ **تفسير عثماني:** مولانا شبير أحمد العثماني، متوفّیٰ ۱۳۶۹ھ، دار الإشاعت، كراچي، ۱۴۲۸ھ.

۵۸۔ **تفسير القرآن العزيز:** إمام عبد الرحمن بن محمد إدريس بن أبي حاتم الرازي، متوفّیٰ ۳۲۷ھ،مكتبة نزار مصطفى الباز،مكة المكرمة،الطبعة الثانية ۱۴۱۹ھ.

۵۹۔ **تفسير القرآن العظيم:** عماد الدين إسماعيل بن عمر بن كثير الشافعي،متوفّیٰ ۷۷۴ھ، دار طيبة،الرياض،الطبعة الثانية ۱۴۲۰ھ، وط:: مؤسسة قرطبة، الطبعة الأولیٰ ۱۴۲۱ھ.

۶۰۔ **جامع البيان عن تأويل آي القرآن :** إمام أبو جعفر محمد بن جرير الطبري، متوفّیٰ ۳۱۰ھ،دار هجر،جيزة، الطبعة الأولیٰ ۱۴۲۲ھ.

۶۱۔ **خزائن العرفان:** صدر الأفاضل سيد محمد نعيم الدين مرادآبادي،متوفّیٰ،تاج كمپنی .

۶۲۔ **الدر المنثور في التفسير بالمأثور:** إمام جلال الدين السيوطي، متوفّیٰ ۹۱۱ھ، مركز هجر للبحوث والدراسات العربية والإسلامية، القاهرة، الطبعة الأولیٰ ۱۴۲۴ھ.

۶۳۔ **روح المعاني في تفسير القرآن العظيم والسبع المثاني:** أبوالفضل سيد محمود آلوسي حنفي بغدادي،متوفّیٰ ۱۲۷۰ھ، مؤسسة الرسالة،بيروت،الطبعة الأولیٰ ۱۴۳۱ھ.

۶۴۔ **ضياء القرآن:** جسٹس علامة پير محمد كرم شاه الأزهري،متوفّیٰ ۱۴۱۸ھ، ضياء القرآن پبلی کیشنز، لاهور.

٦٥- **فتح البيان في مقاصد القرآن**: سيدمحمد صديق حسن خان بهوپالي،متوفّیٰ١٣٠٧هـ، المكتبة العصرية، بيروت،الطبعة ١٤١٢ هـ.

٦٦- **فتح القدير**: قاضي محمدبن علي الشوكاني،متوفّیٰ ١٢٥٠،دارابن كثير،دمشق،الطبعة الأولیٰ ١٤١٤هـ.

٦٧- **في رحاب التفسير**: عبدالحميد كشك،المكتب المصري الحديث،القاهرة۔

٦٨- **لباب التأويل فى معانى التنزيل**: علي بن محمدالبغدادي الشهيربا لخازن،متوفّیٰ ٧٥٢هـ، دارالكتب العلمية،بيروت،الطبعة الأولیٰ ١٤١٥هـ.

٦٩- **محاسن التأويل**: الشيخ محمد جمال الدين القاسمي،متوفّیٰ١٣٣٢هـ،دارإحياء الكتب العربية،عيسیٰ البابي الحلبي وشركاه،الطبعة الأولیٰ١٣٧٦هـ.

٧٠- **المحرر الوجيز في تفسير الكتاب العزيز**: علامة أبوبكر قاضي عبدالحق بن غالب بن عطية الأندلسي،متوفّیٰ٥٤٦هـ،دارالخير،دمشق،الطبعة الثانية١٤٢٨هـ.

٧١- **معارف القرآن**: مفتي محمد شفيع عثماني ديوبندي،متوفّیٰ١٣٩٩هـ ،مكتبة معارف القرآن، كراچی١٤٢٤هـ.

٧٢- **نور العرفان علیٰ كنز الإيمان**: مفتي أحمد يارخان نعيمي،متوفّیٰ١٣٩١هـ،نعيمي كتب خانه،لاهور.

شُرُوحِ حدیث

٧٣- **إرشاد الساري لشرح صحيح البخاري**: أحمد بن أبي بكر الخطيب القسطلاني، متوفّیٰ٩٤٢هـ،دارالكتب العلمية،بيروت،الطبعة الأولیٰ١٤١٦هـ.

٧٤- **إكمالُ إكمالِ المُعْلِم**: أبوعبد الله محمدبن خليفة الوشتاني أبي المالكي،متوفّیٰ ٨٢٨هـ، دارالكتب العلمية،بيروت،الطبعة الأولیٰ١٤١٩هـ.

٧٥- **إكمال المعلم بفوائد مسلم**: قاضي عياض بن موسیٰ مالكي الأندلسي،متوفّیٰ٥٤٤هـ، دارالوفاء،المنصورة،الطبعة الأولیٰ١٤١٩هـ.

٧٦- **البحر المحيط الثجاج،في شرح صحيح الإمام مسلم بن الحجاج**: محمد بن علي

بن آدم الإتيوبي،دارابن الجوزي،الدمام،السعودية،الطبعة الأولیٰ١٤٢٦هـ.

٧٧۔ **بذل المجهود في حل سنن أبي داود:** علامة خليل أحمد سهارنپوري، متوفّیٰ ١٣٤٦هـ، دارالكتب العلمية،بيروت،الطبعة الثانية١٤٣٦هـ، وط: الإمارات العربية، دبي،الطبعة الأولیٰ١٤٢٧هـ.

٧٨۔ **تحفة الأحوذي بشرح جامع الترمذي:** عبد الرحمن مباركپوري، متوفّیٰ ١٣٢٥هـ، دار إحياء التراث العربي بيروت، الطبعة الأولیٰ ١٤١٩هـ،وط:دارالفكر،بيروت.

٧٩۔ **التوضيح لشرح الجامع لصحيح:** أبوحفص عمربن عليالمعروف بابن الملقن، ٨٠٤هـ،دارالفلاح،مصر،الطبعة الأولیٰ١٤٢٩هـ.

٨٠۔ **حاشية التأودي على البخاري:** محمد التاودي بن محمد الطالب بن علي بن سودة الفاسي المالكي،متوفّیٰ١٢٠٩هـ،دارالكتب العلمية،بيروت،الطبعة الأولیٰ ١٤٢٨هـ .

٨١۔ **حاشية السندهي على مسند أحمد:** أبوالحسن محمدبن عبد الهادي السندي، التتوي، متوفّیٰ ١١٣٨هـ، وزارة الأوقا ف والشؤون الإسلامية،قطر،الطبعة الأولیٰ١٤٢٨هـ.

٨٢۔ (**شرح ابن بطال على البخاري:** أبوالحسن علي بن خلف بن عبد الملك،متوفّیٰ ٤٤٩هـ،مكتبةالرشد،الرياض.

٨٣۔ **شرح سنن أبي داود:** شهاب الدين أبوالعباس أحمد بن حسين بن علي بن رسلان الرملي الشافعي،متوفیٰ ٨٤٤هـ،دارالفلاح،القاهرة،١٤٣٧هـ.

٨٤۔ **شرح صحيح مسلم:** علامةغلام رسول سعيدي،متوفّی٢٠١٦ء،فريدبك سٹال،لاهور.

٨٥۔ **عمدة القاري شرح صحيح البخاري:** حافظ بدرالدين محمود بن أحمدالعيني الحنفي، متوفیٰ٨٥٥هـ،دارالكتب العلمية، بيروت،الطبعة الأولیٰ١٤٢١هـ، وط: السّحار للطباعة والنشر،القاهرة،الطبعة الأولیٰ.

٨٦۔ **عون المعبود شرح سنن أبي داود:** شمس الحق عظيم آبادي،متوفّیٰ١٣٢٩هـ،دارابن حزم،الطبعة الأولیٰ١٤٢٦هـ،وط:المكتبةالسلفية،المدينةالمنورة،الطبعةالثانية ١٣٨٩هـ.

٨٧- **فتح الباري شرح صحيح البخاري:** أحمد بن علي بن حجر العسقلاني، متوفّى ٨٥٢هـ، دار الفكر، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٦هـ. وط: دار طيبة، الرياض، الطبعة الأولى ١٤٢٦هـ.

٨٨- **فتح الملهم بشرح إمام المسلم:** علامة شبير أحمد عثماني، دار إحياء التراث العربي، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٦هـ

٨٩- **فتح المنعم شرح صحيح مسلم:** دكتور موسى شاهين لاشين، دار الشروق، مصر، الطبعة الأولى ١٤٢٣هـ.

٩٠- **فتح الودود في شرح سنن أبي داود:** أبو الحسن نور الدين محمد بن عبد الهادي السندي، متوفّى ١١٣٨هـ، مكتبة لينة، دمنهور، مصر، الطبعة الأولى ١٤٣١هـ.

٩١- **فيض القدير شرح جامع الصغير:** محمد عبد الرؤف المناوي، متوفّى ١٠٠٣هـ، دار المعرفة، بيروت، الطبعة الثانية ١٣٩١هـ، وط: مكتبة نزار مصطفى البازمكة المكرمة، الطبعة الأولى ١٤١٨هـ.

٩٢- **لمعات التنقيح في شرح مشكاة المصابيح:** الشيخ عبد الحق محدث دهلوي، متوفّى ١٠٥٢هـ، دار النوادر، دمشق، الطبعة الأولى ١٤٣٥هـ.

٩٣- **مرآة المناجيح أُردو ترجمة وشرح مشكاة المصابيح:** مفتي أحمد يار خان نعيمي، متوفّى ١٣٩١هـ، ضياء القرآن پبلی کیشنز، لاهور.

٩٤- **مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح:** ملا علي القاري، متوفّى ١٠١٤هـ، المكتبة التجارية، مكة المكرمة، وط: دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٢هـ.

٩٥- **المعلم بفوائد مسلم:** : أبو عبد الله محمد بن علي بن عمر المازري، متوفّى ٥٣٦هـ، دار التونسية، تونس، ١٩٨٨ء.

٩٦- **المفهم لما أشكل من تلخيص كتاب مسلم:** إمام أبوا لعباس أحمد بن عمر القرطبي المالكي، متوفّى ٦٥٦هـ، دار ابن كثير، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٧هـ.

٩٧- **مكمل إكمال الأكمال:** علامة محمد بن محمد السنوسي المالكي، متوفّى ٨٩٥هـ، دار

الکتب العلمیة، بیروت، الطبعة الأولیٰ ١٤١٥ھ.

٩٨۔ **المنتقیٰ شرح موطأ:** قاضي أبوالولید سلیمان بن خلف بن سعد بن أیوب الباجي المالکي، متوفّیٰ ٤٩٤ھ، دارالکتب العلمیة، بیروت، الطبعة الأولیٰ ١٤٢٠ھ.

٩٩۔ **المنهاج بشرح مسلم لابن الحاج:** علامة یحییٰ بن شرف النووي، متوفّیٰ ٦٧٦ھ، دار المعرفة، بیروت، الطبعة الأولیٰ ١٤١٤ھ، وط: مؤسسة قرطبة، الطبعة الثانیة ١٤١٤ھ.

سیرت و فضائل

١٠٠۔ **إشراق مصابیح السیرة المحمدیة بمزج أسرار المواهب اللدنیة (شرح الزرقاني علی المواهب):** محمد عبدالباقي الزرقاني، متوفّیٰ ١١٢٢ھ، دارالکتب العلمیة، بیروت، الطبعة الأولیٰ ١٤١٧ھ.

١٠١۔ **دلائل النبوة ومعرفة أحوال صاحب الشریعة:** إمام أبوبکر أحمد بن حسین البیهقي، متوفّیٰ ٤٥٨ھ، دارالکتب العلمیة، بیروت، الطبعة الأولیٰ ١٤٠٥ھ.

١٠٢۔ **دلائل النبوة:** أبونُعَیم أحمد بن عبد اللّٰہ الأصفهاني، متوفّیٰ ٤٣٠ھ، دارالنفائس، بیروت الطبعة الثالثة ١٤٠٦ھ.

١٠٣۔ **الروض الأنف:** أبوالقاسم عبد الرحمان بن عبد الله السهیلي، متوفّیٰ ٥٧١ھ، دارالکتب العلمیة، بیروت، الطبعة الأولیٰ ١٤١٨ھ.

١٠٤۔ **سبل الهدیٰ والرشاد في سیرة خیر العباد:** إمام محمد بن یوسف الصالحي الشامي، متوفّیٰ ٩٤٢ھ، دارالکتب العلمیة، بیروت، الطبعة الأولیٰ ١٤١٤ھ.

١٠٥۔ **سیرة النبي:** علامة شبلي نعماني، علامة سیدسلیمان الندوي، الفیصل ناشران وتاجران کتب، لاهور.

١٠٦۔ **السیرة النبویة:** محمد بن إسحاق بن یسار المطلبي المدني، متوفّیٰ ١٥١ھ، دارالکتب العلمیة، بیروت، الطبعة الأولیٰ ١٤٢٤ھ.

١٠٧۔ **شرح الشفا:** علی بن سلطان القاري، متوفّیٰ ١٠١٤ھ، دارالکتب العلمیة، بیروت، الطبعة الأولیٰ ١٤٢١ھ.

۱۰۸۔ **الطبقات الكبرىٰ** : محمد بن سعدبن منيع الظهري،متوفّىٰ ۲۳۰ھ،دارإحياء التراث العربي،بيروت،الطبعة الأولىٰ۱٤۱۷ھ. وط:مكتبة الخانجي القاهرة،الطبعة الأولىٰ۱٤۲۱ھ ،وط:دار الكتب العلمية،بيروت،الطبعة الثانية۱٤۳۳ھ.

۱۰۹۔ **عيون الأثر في فنون المغازي والشمائل والسير**: أبوالفتح محمد بن محمد بن سيدالناس اليعمري،متوفّى۷۳٤ھ،مكتبة دار التراث،المدينة المنورة،

۱۱۰۔ **كفاية الطالب اللبيب في خصائص الحبيب ﷺ(الخصائص الكبرىٰ)**: إمام جلال الدين السيوطي،متوفّىٰ۹۱۱ھ،دارالكتب العلمية،بيروت،الطبعة الأولىٰ ۱٤۰۵ ھ.وط:دارالكتب الحديثية،القاهرة.

۱۱۱۔ **مدارج النبوة فارسي**: شيخ عبد الحق محدث دهلوي،متوفّىٰ ۱۰۵۲ھ،نوريةرضوية پبلشنگ كمپني،لاهور،طبع دوم۱۹۹۷ء،وط:مترجم اردو،شبيربرادرز،لاهور.

۱۱۲۔ **مزيل الخفاء عن ألفاظ الشفاء**: علامةأحمد بن محمد الشمني،متوفّى ۸۷۲ھ،دارلكتب العلمية،بيروت،الطبعة الثانية۱٤۲۲ھ.

۱۱۳۔ **المواهب اللدنية بالمنح المحمدية**: إمام أحمدبن محمدالقسطلاني،متوفّىٰ ۹۲۳ھ، المكتب الإسلامي، بيروت،الطبعة الأولىٰ ۱٤۱۲ھ.

۱۱٤۔ **نسيم الرياض في شرح الشفاء القاضي عياض**: علامة أحمد شهاب الدين الخفاجي المصري،متوفّىٰ ۱۰٦۹ھ،المطبعة الأزهرية المصرية،الطبعة الأولى ۱۳۲۷ھ. وط: دار الكتب العلمية،بيروت،الطبعة الأولىٰ۱٤۲۱ھ.

۱۱۵۔ **نورالعيون في تلخيص سيرة الأمين المأمون**: أبوالفتح محمد بن محمد بن سيد الناس اليعمري،متوفّى۷۳٤ھ،دارالمنهاج،جدة،الطبعة الرابعة۱٤۳۱ھ.

أُصُولِ حَدِيْث

۱۱٦۔ **التبصرةوالتذكرة**: الحافظ الشيخ زكريابن محمد الأنصاري السنكي،متوفّىٰ ۹۲۵ھ، دارا لكتب العلميةبيروت.

١١٧ـ **تحفة الأخيار بإحياء سنة سيد الأبرار**: أبو الحسنات محمد عبد الحي اللكنوي، متوفّىٰ ١٣٠٤هـ، دار القلم، دمشق، الطبعة الأولىٰ ١٤١٢هـ.

١١٨ـ **فتح المغيث شرح الفية الحديث**: شمس الدين محمد بن عبد الرحمن السخاوي، متوفّىٰ ٩٠٢هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤١٤هـ، مكتبة دار المنهاج، الرياض، الطبعة الأولىٰ ١٤٢٦هـ.

اسماء الرّجال

١١٩ـ **الاستيعاب في معرفة الأصحاب**: إمام أبو عمرو يوسف بن عبد الله بن محمد بن عبد البر القرطبي، متوفّىٰ ٤٦٣هـ، دار الفكر، بيروت، ١٤٢٦هـ.

١٢٠ـ **الإصابة في تمييز الصحابة**: حافظ شهاب الدين أحمد بن علي بن حجر العسقلاني، متوفّىٰ ٨٥٢هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤١٥هـ. وط: مركز هجر للبحوث والدراسات العربية والإسلامية، القاهرة، الطبعة الأولىٰ ١٤٢٨هـ.

١٢١ـ **الإنابة إلىٰ معرفة المختلف فيهم من الصحابة**: أبو عبد الله علاؤ الدين بن قليج الحنفي، متوفىٰ ٧٦٢هـ، مكتبة الرشد، الرياض، الطبعة الأولىٰ ١٤٢٠هـ.

١٢٢ـ **أسد الغابة في معرفة الصحابة**: إمام أبو الحسن علي بن محمد المعروف بابن الأثير الجزري، متوفّىٰ ٦٣٠هـ، دار إحياء التراث العربي، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤١٧هـ.

١٢٣ـ **إكمال تهذيب الكمال في أسماء الرجال**: حافظ علاؤ الدين مغلطائي بن قليج الحنفي، متوفىٰ ٧٦٢هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ٢٠١١ء.

١٢٤ـ **التاريخ الصغير**: إمام محمد بن إسماعيل البخاري، متوفّىٰ ٢٥٦هـ، دار المعرفة، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤٠٦هـ.

١٢٥ـ **التاريخ الكبير**: إمام محمد بن إسماعيل البخاري، متوفّىٰ ٢٥٦هـ، مطبعة دائرة المعارف العثمانية، حيدر آباد دكن.

١٢٦ـ **تحرير تقريب التهذيب**: دكتور بشار عواد معروف، الشيخ شعيب الأرنؤوط، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤١٧هـ.

۱۲۷۔ **تذهيب تهذيب الكمال في أسماء الرجال:** شمس الدين محمد بن أحمد الذهبي، متوفیٰ ۷۴۸ھ، الفاروق الحديثية، القاهرة، الطبعة الأولیٰ ۱۴۲۵ھ.

۱۲۸۔ **تقريب التهذيب:** حافظ شهاب الدين أحمد بن علي بن حجر العسقلاني، متوفیٰ ۸۵۲ھ، دار الفكر، بيروت، الطبعة الأولیٰ ۱۴۱۵ھ.

۱۲۹۔ **تهذيب التهذيب:** حافظ شهاب الدين أحمد بن علي بن حجر العسقلاني، متوفیٰ ۸۵۲ھ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولیٰ ۱۴۱۵ھ.

۱۳۰۔ **تهذيب الكمال في أسماء الرجال:** حافظ جمال الدين يوسف المزي متوفیٰ ۷۴۲ھ، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الثانية ۱۴۰۳ھ.

۱۳۱۔ **لسان الميزان:** أحمد بن علي بن حجر العسقلاني، متوفیٰ ۸۵۲ھ، دار البشائر الإسلامية، بيروت، الطبعة الأولیٰ ۱۴۲۳ھ.

۱۳۲۔ **معرفة الصحابة:** أحمد بن عبد الله بن أحمد أبو نعيم الأصبهاني، متوفیٰ ۴۳۰ھ، دار الوطن، الرياض، الطبعة الأولیٰ ۱۴۱۹ھ.

کتب عقائد وکلام

۱۳۳۔ **الإبانة عن شريعة الفرق الناجية ومجانبة الفرق المذمومة:** أبو عبد الله عبيد الله بن محمد بن بطة العكبري الحنبلي، متوفیٰ ۳۸۷، دار الراية، الرياض، الطبعة الأولیٰ ۱۴۰۹ھ.

۱۳۴۔ **الإذاعة لما كان وما يكون بين يدي الساعة:** أبو الطيب محمد صديق حسن بخاري قنوجي، متوفیٰ ۱۳۰۷ھ، دار ابن حزم، بيروت، الطبعة الأولیٰ ۱۴۲۱ھ.

۱۳۵۔ **الأساليب البديعة في فضل الصحابة وإقناع الشيعة، ملحق بشواهد الحق:** يوسف بن إسماعيل النبهاني، ۱۳۵۰ھ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الثالثة ۱۴۲۸ھ.

۱۳۶۔ **الإشاعة لأشراط الساعة:** محمد بن رسول البرزنجي، متوفیٰ ۱۱۰۳ھ، دار المنهاج، جدة، الطبعة الثالثة ۱۴۲۶ھ.

۱۳۷۔ **إمام پاک اور یزید پلید:** مولانا محمد شفیع أوکاڑوی، متوفیٰ ۱۹۸۴ء، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاهور، سال اشاعت ۲۰۱۷ء.

١٣٨۔ **أمير معاوية پرايک نظر**:مفتي أحمد يارخان نعيمي،متوفّیٰ١٣٩١ھ، مكتبة اسلامية، ميان ماركيٹ،غزني سٹريٹ،اردوبازار،لاهور.

١٣٩۔ **أجوبه أربعين،ردروافض**: مولانامحمد قاسم نانوتوي،متوفّیٰ١٢٩٧ھ،اداره نشرواشاعت،مدرسه نصرةالعلوم گوجرانواله،طباعت اول ١٤٠٢ھ.

١٤٠۔ **تحفة اثناء عشريه**: شاه عبدالعزيزمحدث دهلوي،متوفّٰی ١٢٢٩ھ،ميرمحمد كتب خانه آرام باغ كراچي.

١٤١۔ **تطهيرالجنان واللسان عن ثلب معاوية بن أبي سفيان**: علامةأحمد بن حجرالهيثمي المكي الشافعي،متوفّیٰ٩٧٥ھ،دارالصحابة للتراث بطنطا،الطبعة الأولیٰ١٤١٣ھ.

١٤٢۔ **حادثۂ كربلاكاپس منظر**:علامة محمدعبد الرشيدالنعماني،مكتبةالحسن،لاهور.

١٤٣۔ **حضرت علي اورقصاص عثمان غني**: علامةعبد الرشيد نعماني،مكتبةاهل سنت وجماعت،لياقت آباد،كراچي.

١٤٤۔ **السيف المسلول عَلى من سب الرسولﷺ**:الشيخ تقي الدين علي بن عبد الكافي السّبكي،متوفّیٰ ٧٥٦ھ ،دارابن حزم، بيروت،الطبعةالأولی١٤٢٦ھ،وط:دارالفتح عمان،الأردن،الطبعةالأولیٰ١٤٢١ھ.

١٤٥۔ **السيف المسلول**: قاضي ثناء الله پاني پتي نقشبندي،متوفّی١٢٢٥ھ،مطبع أحمدي،دهلي،سنةالطبع١٢٦٨ھ.

١٤٦۔ **شرح أصول إعتقاد أهل السنة والجماعة**: أبوالقاسم هبة الله بن الحسن الطبري المعروف باللالكائي،متوفّیٰ٤١٨ھ دارالكتب العلمية،بيروت،الطبعةالأولیٰ١٤٢٣ھ.

١٤٧۔ **شرح العقائد النسفية**: إمام مسعودبن عمرسعدالدين تفتازاني،متوفّیٰ ٧٩٠ھ، مكتبة رشيدية، كوئٹه،وط:مكتبة الحسن،لاهور.

١٤٨۔ **شرح العقيدة الطحاوية**: محمدبن علاء الدين بن أبى العزالحنفي، متوفّیٰ٧٩٢ھ، بتحقيق عبدالله التركي،وشعيب الأرنؤوط،مؤسسةالرسالة،بيروت،الطبعةالثانية ١٤١١ ھ.

۱۴۹ـ **شرح العقيدة الطحاوية:** محمد بن علاء الدين بن أبي العز الحنفي، متوفی ۷۹۲ھ، بتخريج الألباني، المكتب الإسلامي، بيروت، الطبعة الثامنة ۱۴۰۴ھ.

۱۵۰ـ **شرح العقيدة الطحاوية:** محمد بن علاء الدين بن أبي العز الحنفي، متوفی ۷۹۲ھ، بتحقيق محمد أحمد شاكر، وزارة الشؤون الإسلامية، الرياض، ۱۴۱۸ھ.

۱۵۱ـ **شرح المقاصد:** إمام مسعود بن عمر الشهير بسعد الدين تفتازاني، متوفی ۷۹۳ھ، عالم الكتب، بيروت، الطبعة الثانية ۱۴۱۹ھ.

۱۵۲ـ **شرح المواقف:** السيد الشريف علي بن محمد الجرجاني، متوفی ۸۱۶ھ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ۱۴۱۹ھ.

۱۵۳ـ **الصواعق المحرقة:** أحمد بن حجر الهيثمي المكي الشافعي، متوفی ۹۷۵ھ، مكتبة فياض منصورة، الطبعة الأولى ۱۴۲۹ھ، وط: دار الوطن، الرياض، الطبعة الأولى ۱۴۱۷ھ.

۱۵۴ـ **العواصم من القواصم:** أبو بكر بن العربي المالكي، متوفی ۵۴۳ھ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الثالثة ۱۴۲۵ھ.

۱۵۵ـ **العواصم والقواصم في الذب عن سنة أبي القاسم:** محمد بن إبراهيم الوزير اليماني، متوفی ۸۴۰ھ، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الثانية ۱۴۱۵ھ.

۱۵۶ـ **الفَرْقُ بَيْنَ الْفِرَق:** عبد القاهر بن طاهر الإسفرائيني التميمي، متوفی ۴۲۹ھ، دار الكتب العلمية، بيروت.

۱۵۷ـ **فیضانِ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ:** مجلس المدینۃ العلمیۃ، مکتبۃ المدینہ، کراچي، بار اول ۲۰۱۶ء.

۱۵۸ـ **القول السديد في حكم يزيد:** محمد سراج أحمد سعيدي، معاصر، ناشر سنهڑا ادبي اكيڈمي، بهاول پور.

۱۵۹ـ **كتاب الاعتقاد:** قاضي أبو العلاء صاعد بن محمد بن أحمد الأستوائي النيسابوري، متوفی ۴۳۲ھ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ۱۴۲۶ھ.

۱۶۰ـ **مختصر تطهير الجنان:** اختصره: سليمان بن صالح الخراشي، دار علوم السنة، الرياض، الطبعة الأولى ۱۴۲۲ھ.

١٦١ـ **المعتمد فى المعتقد:المروف رساله توريشتي:** أبو عبد الله فضل الله التوربشتي، متوفّیٰ٦٦١هـ،نوريه پبلشنگ كمپني،لاهور.

١٦٢ـ **المستند المعتمد شرح المعتقد المنتقد:** إمام أحمدرضاخان الحنفي الماتريدي، متوفّیٰ١٣٤٠هـ،النورية الرضوية پبلي كيشنز،لاهور،الطبعة الأولیٰ١٤٣٥هـ.

١٦٣ـ **منهاج السنة النبوية:** أبوالعباس أحمدبن عبدالحليم بن تيمية،متوفّٰی ٧٢٨هـ، ناشر جامعة الإمام محمدبن سعود الإسلامية،الطبعة الأولیٰ١٤٠٦هـ.

١٦٤ـ **النبراس على شرح العقائد:** محمد عبد العزيز فرهاروي، متوفّیٰ، مكتبة حقانية، ملتان،وط:مكتبة رشيدية كوئٹه.

١٦٥ـ **هدية الشيعة:** مولانامحمد قاسم نانوتوي،متوفّیٰ١٢٩٧هـ،اداره تاليفات اشرفيه، ملتان.

علم الأصول

١٦٦ـ **الرسالة:** إمام محمد بن إدريس الشافعي،متوفّیٰ٢٠٤هـ،مطبعة مصطفیٰ البابي الحلبي،مصر،الطبعة الأولیٰ١٣٥٨هـ.

كُتُبِ فقه حنفي

١٦٧ـ **الاختيار لتعليل المختار:** إمام عبد الله بن محمد الموصلي الحنفي، متوفّیٰ ٦٨٣هـ،دار الرسالة العالمية،الطبعة الأولیٰ١٤٣٠هـ.

١٦٨ـ **البحر الرائق شرح كنز الدقائق:** زين الدين بن إبراهيم المعروف بابن نجيم المصري، الحنفي،متوفّیٰ٩٧٠هـ،دارالكتب العلمية،بيروت،الطبعة الأولى١٤١٨هـ.

١٦٩ـ **البناية في شرح الهداية:** محمود بن أحمد المعروف ببدرالدين العيني، متوفّی ٨٥٥هـ، دارالكتب العلمية،بيروت،الطبعة الأولى١٤٢٠هـ.

١٧٠ـ **بهار شريعت:** مولانا أمجد علي أعظمی، متوفّیٰ١٣٧٦هـ، مكتبة المدينة، كراچي.

١٧١ـ **تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق:** فخرالدين عثمان بن علي الزيلعي،٧٤٣هـ،المطبعة الكبرى الأميرية،ببولاق مصر،الطبعة الأولیٰ١٣١٤هـ.

۱۷۲ـ **حاشية الشلبي على تبيين الحقائق:** شهاب الدين أحمد الشلبي، متوفّیٰ ۱۰۲۱ھ، المطبعة الكبرى الأميرية، ببولاق مصر، الطبعة الأولىٰ ۱۳۱٤ھ.

۱۷۳ـ **حجة اللّٰه البالغة:** شيخ أحمد بن عبد الرحيم [شاه ولى الله دهلوي] متوفّیٰ ۱۱۷٦ھ، دار الجيل، بيروت، الطبعة الأولىٰ ۱٤۲٦ھ.

۱۷٤ـ **رد المحتار على الدر المختار:** سيد محمد أمين إبن عابدين الشامي متوفّیٰ ۱۲٥۲ھ، دار إحياء التراث العربي، بيروت ۱٤۱۹ھ.

۱۷٥ـ **شرح أدب القاضي:** حسام الدين عمر بن عبد العزيز بن مازة البخاري، المعروف بالصدر الشهيد، متوفّیٰ ٥۳٦ھ، مطبعة الإرشاد، بغداد، الطبعة !! الأولىٰ ۱۳۹۷ھ.

۱۷٦ـ **شرح الهداية:** أبو الحسنات محمد عبد الحي اللكنوي، ۱۳۰۳ھ، إدارة القرآن والعلوم الإسلامية، كراچي، الطبعة الأولىٰ ۱٤۱۷ھ.

۱۷۷ـ **العناية في شرح الهداية:** أكمل الدين محمد بن محمود البابرتي، متوفّیٰ ۷۸٦ھ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ۱٤۱٥ھ.

۱۷۸ـ **فتاویٰ رضوية:** إمام أحمد رضا حنفي، متوفّیٰ ۱۳٤۰ھ، مكتبة رضوية آرام باغ، كراچي، و ط: رضا فاؤنڈيشن، ية نظامية رضوية، لاهور.

۱۷۹ـ **فتاوى عزيزي:** شاه عبد العزيز محدث دهلوي، متوفّیٰ ۱۲۲۹ھ، مترجم اردو، ايچ ايم سعيد كمپني، كراچي، سنة الطبع ۱۳۸۷ھ.

۱۸۰ـ **فتاوى قاضي خان:** أبو المحاسن الحسن بن منصور المعروف بقاضي خان الأوزجندى الفرغاني، متوفّیٰ ٥۹۲ھ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ۲۰۰۹ء.

۱۸۱ـ **فتح القدير في شرح الهداية:** إمام كمال الدين محمد بن عبد الواحد المعروف بابن الهمام، متوفّیٰ ٦۸۱ھ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ۱٤۱٥ھ.

۱۸۲ـ **لسان الحكام في معرفة الأحكام:** أبو الوليد إبراهيم بن محمد المعروف بابن الشحنة الحلبي، متوفّیٰ ۸۸۲ھ، مطبعة الجريدة البرهان، اسكندرية، ۱۲۹۹ھ.

۱۸۳ـ **المبسوط**: شمس الأئمة أبوبكر محمد بن أحمد بن أبي سهل السرخسي، متوفّیٰ ۴۹۰ھ، دار الکتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولیٰ ۱۴۲۱ھ، و ط: دار المعرفة، بيروت.

۱۸۴ـ **المحيط البرهاني في الفقه النعماني**: برهان الدين أبوالمعالي محمود بن أحمد بن عبد العزيز ابن مازة البخاري، متوفّیٰ ۶۱۶ھ، دار الکتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولیٰ ۱۴۲۴ھ.

۱۸۵ـ **النهر الفائق شرح كنز الدقائق**: سراج الدين عمر بن إبراهيم ابن نجيم الحنفي، متوفّیٰ ۱۰۰۵ھ، دار الکتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولیٰ ۱۴۲۲ھ.

۱۸۶ـ **الهداية شرح بداية المبتدي**: أبو الحسن علي بن أبي بكر المرغيناني، متوفّیٰ ۵۹۳ھ، دار إحياء التراث العربي، بيروت، الطبعة الأولیٰ ۱۴۱۶ھ.

فقہ شافعی

۱۸۷ـ **كفاية الأخيار في حل غاية الاختصار**: تقي الدين أبوبكر بن محمد بن عبد المؤمن الحصني الشافعي، متوفّیٰ ۸۲۹ھ، وزارة الأوقاف والشؤون الإسلامية، قطر، الطبعة الخامسة ۱۴۳۷ھ.

۱۸۸ـ **منهج الطلاب**: زكريا بن محمد الأنصاري الشافعي، متوفّیٰ ۹۲۶ھ، دار الکتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولیٰ ۱۴۱۷ھ.

مذاہب

۱۸۹ـ **شرح مذاهب أهل السنة**: أبوحفص عمر بن أحمد بن عثمان بن شاهين، متوفّیٰ ۳۸۵ھ، الطبعة الأولیٰ ۱۴۱۵ھ.

۱۹۰ـ **فتاوی ثنائیه**: أبوالوفا ثناء الله امرتسري، اداره ترجمان السنة، لاهور، تاريخ طباعت فروري ۱۹۷۲ء.

۱۹۱ـ **الموسوعة الفقهية**: وزارة الشؤون الإسلامية، الكويت، الطبعة الثانية ۱۴۰۴ھ.

ترغیب وترہیب

۱۹۲ـ **بغض و کینہ**: دعوتِ إسلامي، شعبه اصلاحي کتب، مکتبة المدينة، کراچی.

۱۹۳۔ **التذكرة في أحوال الموتى وأمور الآخرة**: إمام أبو عبد الله محمد بن أبي بكر القرطبي، متوفّیٰ ٦٦٨ھ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولیٰ ١٤١٩ھ، وط: مكتبة دار المنهاج، الرياض، الطبعة الأولیٰ ١٤٢٥ھ.

۱۹۴۔ **تعظيم قدر الصلاة**: محمد بن نصر المروزي، متوفّیٰ ٣٩٤ھ، مكتبة الدار بالمدينة المنورة، الطبعة الأولیٰ ١٤٠٦ھ.

۱۹۵۔ **جامع بيان العلم وفضله**: إمام أبو عمرو يوسف بن عبد الله بن محمد بن عبد البر القرطبي، متوفّیٰ ٤٦٣ھ، دار ابن الجوزي، الدمام، الطبعة الرابعة ١٤١٩ھ.

۱۹۶۔ **درأ تعارض العقل والنقل**: أبو العباس أحمد بن عبد الحليم ابن تيمية، متوفّیٰ ٧٢٨ھ، إدارة الثقافة والنشر بالجامعة، السعودية، الطبعة الثانية ١٤١١ھ.

۱۹۷۔ **ذم الكلام وأهله**: أبو إسماعيل عبد الله بن محمد الأنصاري الهروي، متوفّیٰ ٤٨١ھ، مكتبة العلوم والحكم، المدينة المنورة، الطبعة الأولیٰ ١٤١٦ھ.

۱۹۸۔ **صفة النفاق ونعت المنافقين**: أبو نعيم أحمد بن عبد الله الأصبهاني، متوفّیٰ ٤٣٠ھ، دار البشائر الإسلامية، بيروت، الطبعة الأولیٰ ١٤٢٢ھ.

۱۹۹۔ **فضائل صدقات**: مولانا محمد زكريا سهارنپوري، متوفّیٰ ١٤٠٢ھ، دار الإشاعت، كراچي.

۲۰۰۔ **ما ثبت بالسنة عن أعمال السنة: عربي واردو**: شيخ عبدالحق محدث دهلوي، متوفّیٰ ١٠٥٢ھ، دار الإشاعت، كراچي ١٤٠٣ھ.

۲۰۱۔ **المحاسن والمساوي**: إبراهيم بن محمد البيهقي، كان حيًا في سنة ٣٢٠ھ، دار المعارف، مصر.

كتبِ اخلاق وتصوّف

۲۰۲۔ **الطبقات الكبرىٰ**: عبد الوهاب الشعراني، متوفّیٰ ٩٧٣ھ، مكتبة الثقافة الدينية، القاهرة، الطبعة الأولیٰ ١٤٢٦ھ.

۲۰۳۔ **الفتوحات المكية**: أبوعبدالله محمد المعروف بابن عربي، متوفّیٰ ۶۳۸ھ، دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۴ھ، وط: دارالکتب العلمیة، بیروت، الطبعة الثالثة ۲۰۱۱ء.

فَضَائِلُ وَمَنَاقِب

۲۰۴۔ **حضرت سیدنا عمر بن عبد العزیز کی 425 حکایات**، منجانب: دعوتِ اسلامی شعبہ اصلاح، مکتبۃ المدینہ، کراچی)

۲۰۵۔ **در السحابة في مناقب القرابة والصحابة**: قاضي محمد بن علي الشوكاني، متوفّیٰ ۱۲۵۰، دار الفکر، دمشق، الطبعة الأولیٰ ۱۴۰۴ھ.

۲۰۶۔ **الرياض النضرة في مناقب العشرة**: أحمد بن عبدالله الطبري، متوفی ۶۹۴، دار الغرب الإسلامي، بیروت، الطبعة الأولیٰ ۱۹۹۶ وط: دار المعرفة، بیروت، الطبعة الأولی ۱۴۱۸ھ.

۲۰۷۔ **ریحانة النبي ﷺ، سیدنا إمام حسن علیہ السلام**: پروفیسر ڈاکٹر محمد حسین آزاد، معاصر، ادارہ جمالِ مصطفیٰ ملتان، اشاعت دوم ۲۰۱۹ء.

۲۰۸۔ **شهادت حسین**: محي الدين أحمد، المعروف مولانا أبوالكلام آزاد، متوفّیٰ ۱۹۵۸ء، مکتبہ جمال کرم، لاهور، اشاعت ۲۰۱۴ء.

۲۰۹۔ **شهید کربلا**: مفتي محمد شفیع عثماني دیوبندي، متوفّیٰ ۱۳۹۹ھ، دار الإشاعت، کراچي، طباعت ۲۰۰۷ء.

۲۱۰۔ **عبادة بن الصامت ﷺ**: دکتور وهبة الزحیلي، دار القلم، دمشق، الطبعة الثالثة ۱۴۰۸ھ.

۲۱۱۔ **عمار بن یاسر ﷺ رجل المحنة ومیزان الفتنة**: أسامة بن أحمد سلطان، معاصر، المکتبة المکیة، مکة المرمة، الطبعة الأولیٰ ۱۴۳۰ھ.

۲۱۲۔ **الفصول المهمة في معرفة أحوال الأئمة**: علي بن محمد المشهور بابن الصباغ المالکي المکي، متوفّی ۸۵۵ھ، دار الأضواء، بیروت، الطبعة الثانية ۱۴۰۹ھ.

۲۱۳۔ **فضائل الصحابة**: إمام أبوعبدالله أحمد بن محمد بن حنبل، متوفّیٰ ۲۴۱ھ، دار ابن الجوزي، الدمام، الطبعة الثالثة ۱۴۲۶ھ.

٢١٤۔ **كتاب الأربعين في فضائل آل البيت الطاهرين:** عبدالله بن صالح بن محمد العبيد، دار البشائر الإسلامية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤٣١ھ.

٢١٥۔ **المرتضىٰ ﷺ:** علامة أبوالحسن علي الندوي، متوفّىٰ ١٤٢٠ھ، دار القلم دمشق، الطبعة الثانية ١٤١٩ھ، وط: مترجم اردو، مجلس نشرياتِ اسلام، ناظم آباد، كراچي ١٤١٢ھ.

٢١٦۔ **مقصد حسين ﷺ:** علامة محمد إسحاق مدني فيصل آبادي، متوفّىٰ ٢٠١٣ء، سلطان العلماء اكيڈمي، جيلاني پوره، فيصل آباد.

٢١٧۔ **مناقب الإمام أبي حنيفة:** إمام موفق بن أحمد الخوارزمي، متوفّىٰ ٥٦٨ھ، دائرة المعارف النظامية، حيدرآباد دكن ١٣٣٢ھ.

٢١٨۔ **مناقب الإمام أبي حنيفة:** إمام محمد بن محمد المعروف بابن البزاز الكردري، متوفّىٰ ٨٢٧ھ، دائرة المعارف النظامية، حيدرآباد دكن ١٣٣٢ھ.

٢١٩۔ **مناقب سيدنا امير معاويه ﷺ: ترجمة: تطهير الجنان:** مولانا عبد الشكور لكهنوي، مكتبه امداديه، ملتان.

لُغت

٢٢٠۔ **الكامل في اللغة والأدب:** إمام أبوالعباس محمد المبرد، متوفّىٰ ٢٨٥ھ، مؤسسة الرسالة ناشرون، دمشق، الطبعة الأولىٰ ١٤٢٧ھ، وط: وزارة الأوقاف والشؤون الإسلامية، السعودية.

٢٢١۔ **مصباح اللغات:** عبدالحفيظ بلياوي، مدينه پبلشنگ كمپنى، كراچى، الطبعة الأولىٰ ١٩٨٢ء.

٢٢٢۔ **موسوعة كشاف اصطلاحات الفنون:** علامة محمد بن علي التهانوي، متوفّىٰ بعد ١١٥٨ھ، مكتبة لبنان ناشرون، الطبعة الأولىٰ ١٩٩٦ء.

٢٢٣۔ **النهاية في غريب الحديث:** علامة محمود بن أثير الجزري، متوفّىٰ ٦٠٦ھ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤١٨ھ.

سیرو تاریخ

۲۲۴۔ **أسماء الخلفاء والولاة وذكر مددهم:ملحق بجوامع السيرة:** أبومحمد علي بن أحمد بن سعيد بن حزم،متوفّیٰ۴۵۶ھ،دارالمعارف بمصر.

۲۲۵۔ **الإعلام بمن في تاريخ الهند من الأعلام،المسمیٰ:** عبدالحي بن فخرالدين الحسني،اللكهنوي،متوفّیٰ۱۳۴۱ھ، دارابن حزم،بيروت،الطبعةالأولیٰ۱۴۲۰ھ.

۲۲۶۔ **أنساب الأشراف:** أحمد بن يحییٰ المعروف بالبلاذري،متوفیٰ۲۷۹ھ، دارالفكر، بيروت،الطبعةالأولیٰ۱۴۱۷ھ.

۲۲۷۔ **البداية والنهاية:** عماد الدين إسماعيل بن عمربن كثيرالدمشقي الشافعي،متوفّیٰ ۷۷۴ھ،دارابن كثير،دمشق،الطبعة الأولیٰ۱۴۲۸ھ، وط:دارهجر،الطبعةالأولیٰ ۱۴۱۷ھ،وط:مترجم اردو،نفيس اكیڈمی كراچی،طبع اوّل ۱۹۸۷ء.

۲۲۸۔ **بغية الطلب في تاريخ حلب:** كمال الدين عمربن أحمد المعروف بابن العديم ، ۶۶۰ھ،دارالفكر،بيروت.

۲۲۹۔ **تاريخ ابن خلدون:** عبد الرحمان بن خلدون،متوفّیٰ۸۰۸ھ، دارالفكر، بيروت، ۱۴۱۲ھ.

۲۳۰۔ **تاريخ الإسلام ووفيات المشاهيروالأعلام:** إمام شمس الدين محمدبن أحمدبن عثمان الذهبي،متوفّیٰ۷۴۸ھ ،دارالكتاب العربي،بيروت، الطبعة الثانية ۱۴۱۰ھ.

۲۳۱۔ **تاريخ الخلفاء:** الإمام الحافظ جلال الدين عبدالرحمان بن أبي‌بكر السيوطي،متوفّیٰ ۹۱۱ھ،وزارةالشؤون ال. سلامية،قطر،الطبعةالثانية۱۴۳۴ھ.

۲۳۲۔ **تاريخ الأمم والملوك :** إمام أبو جعفر محمدبن جريرالطبري،متوفّیٰ۳۱۰ھ، دار المعارف،بمصر،الطبعة الثانية ۱۳۸۷ھ.

۲۳۳۔ **تاريخ خليفه بن خياط :** إمام أبو عمرو خليفة بن خيّاط العصفري، متوفّیٰ۲۴۰ھ،دار طيبة،الرياض،الطبعةالثانية ۱۴۰۵ھ.

۲۳۴۔ **تاريخ دعوت وعزيمت:** علامة سيدأبوالحسن علي الندوي،متوفّیٰ۱۴۲۰ھ،مجلس

نشریات اسلام، کراچي.

۲۳۵۔ **تاریخ مدینه دمشق:** إمام أبوالقاسم علي بن الحسن بن هبةالله بن عبدالله بن عساكر، متوفّیٰ ۵۷۱ھ، دارالفكر، بيروت، ۱٤۱٦ھ.

۲۳٦۔ **تاریخ مكة:** أبوالوليد محمد بن عبد الله الأزرقي، متوفّیٰ ۲٤٤ھ، المكتبة التجارية الكبرىٰ، مكة المكرمة، الطبعة الأولىٰ ۱٤۱٦ھ.

۲۳۷۔ **التبيين في أنساب القرشيين:** موفق الدين أبومحمد عبد الله بن أحمد ابن قدامة، متوفّیٰ ٦۲۰ھ، منشورات المجمع العلمي العراقي، ۱٤۰۲ھ.

۲۳۸۔ **الجواهر المضية في طبقات الحنفية:** محي الدين عبد القادر بن محمد أبوالوفا القرشي الحنفي، متوفّیٰ ۷۷۵ھ، دارهجر، جيزة، الطبعة الثانية ۱٤۱۳ھ.

۲۳۹۔ **رجال الفكر والدعوة:** علامة سيد أبوالحسن علي الندوي، متوفّیٰ ۱٤۲۰ھ، دارابن كثير، دمشق، الطبعة الثالثة ۱٤۲۸ھ.

۲٤۰۔ **سير أعلام النبلاء :** شمس الدين محمد بن أحمد بن عثمان الذهبي، متوفّیٰ ۷٤۸ھ، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الحادية العشرة ۱٤۲۲ھ.

۲٤۱۔ **سير الصحابة:** شاه معين الدين أحمد ندوي، متوفّیٰ ۱۹۷٤ء، دارالإشاعت اردوبازار، کراچي، طباعت ۲۰۰٤ء.

۲٤۲۔ **شفاء الغرام بأخبار البلد الحرام:** أبوالطيب تقي الدين محمد بن أحمد بن علي الفاسي، متوفّیٰ ۸۳۲ھ، دارالكتاب العربي، بيروت، الطبعة الأولىٰ ۱٤۰۵ھ.

۲٤۳۔ **العبر في خبر من غبر:** شمس الدين محمد بن أحمد بن عثمان الذهبي، متوفّیٰ ۷٤۸ھ، دائرة المطبوعات والنشر، الكويت، ۱۹٦۰ء.

۲٤٤۔ **عيون الأخبار:** أبومحمد عبد الله بن مسلم بن قتيبة الدينوري، متوفّیٰ ۲۷٦ھ، دار الكتاب العربي، بيروت، تصوير ۱۳٤۳ھ.

۲٤۵۔ **كتاب المحن:** محمد بن أحمد بن تميم التميمي، متوفّیٰ ۳۳۳ھ، دارالغرب الإسلامي، بيروت، الطبعة الثالثة ۱٤۲۷ھ.

٢٤٦ـ **کنز الدرر و الغرر**: أبوبکر بن عبد الله بن أیبك الدواداري، بیروت، ١٤١٤ھ.

٢٤٧ـ **الکامل فی التاریخ**: عزالدین أبوالحسن علي بن محمد الشهیر بابن الأثیر الجزري، متوفّیٰ ٦٣٠، دار الکتب العلمیة، بیروت، الطبعة الرابعة ١٤٢٤ھ.

٢٤٨ـ **مختصر تاریخ دمشق**: إمام محمد بن مکرم المعروف بابن منظور، متوفّیٰ ٧١١ھ، دار الفکر، دمشق، الطبعة الأولیٰ ١٤٠٩ھ.

٢٤٩ـ **المختصر في أخبار البشر**: عمادالدین إسماعیل أبوالفداء، متوفّیٰ ٧٣٢ھ، المطبعة الحسینیة، مصر.

٢٥٠ـ **مرآة الزمان في تواریخ الأعیان**: أبوالمظفر یوسف بن قزأوغلي، المعروف سبط ابن الجوزي، متوفّیٰ ٦٥٤ھ، الرسالة العالمیة، بیروت، الطبعة الأولیٰ ١٤٣٤ھ.

٢٥١ـ **مروج الذهب ومعدن الجوهر**: أبوالحسن علي بن الحسین بن علي المسعودي، متوفّیٰ ٣٤٦ھ، المکتبة العصریة، بیروت، الطبعة الأولیٰ ١٤٢٥ھ.

٢٥٢ـ **مسالك الأبصار في ممالك الأمصار**: شهاب الدین أحمد بن یحییٰ، متوفّیٰ ٧٤٩ھ، دار الکتب العلمیة، بیروت، الطبعة الأولیٰ ٢٠١٠ء.

٢٥٣ـ **المعرفة و التاریخ**: أبویوسف یعقوب بن سفیان الفسوي، متوفّیٰ ٢٧٧ھ، مکتبة الدار بالمدینة المنورة، الطبعة الأولیٰ ١٤١٠ھ.

٢٥٤ـ **المنتظم في تاریخ الملوك و الأمم**: أبوالفرج عبد الرحمان بن الجوزي، متوفّیٰ ٥٩٧ھ، دار الکتب العلمیة، بیروت الطبعة الأولیٰ ١٤١٢ھ.

٢٥٥ـ **وفیات الأعیان و أنباء أبناء الزمان**: شمس الدین أحمد بن محمد بن أبي بکر بن خلکان، متوفّیٰ ٦٨١ھ، دار صادر، بیروت، سنة الطبع ١٤١٤ھ.

سیاست

٢٥٦ـ **الأحکام السلطانیة و الولایات الدینیة**: أبوالحسن علي بن محمد بن حبیب الماوردي، متوفّیٰ ٤٥٠ھ، مکتبة دار ابن قتیبة، الکویت، الطبعة الأولیٰ ١٤٠٩ھ.

٢٥٧ـ **الأحکام السلطانیة**: قاضي أبویعلیٰ محمد بن حسین الفراء الحنبلي، متوفّیٰ ٤٥٨ھ،

۴۵۸ھ،دار الكتب العلمية،بيروت،۱۴۲۱ھ.

۲۵۸۔ **اسلام اور جمهوریت:** محي الدين أحمد،المعروف مولانا ابوالكلام آزاد،متوفیٰ ۱۹۵۸ء،مکتبہ جمال کرم، لاہور،اشاعت ۲۰۱۷ء.

۲۵۹۔ **اسلام کا نظامِ حکومت:** مولانا حامد انصاري غازي،متوفیٰ ۱۴۱۲ھ،الفيصل ناشران وتاجران[تصوير]،۲۰۱۵ء.

۲۶۰۔ **فلسفة ابن رشد:** دكتور فرح انطون ، مؤسسة هنداوي للتعليم والثقافة ، القاهرة، الطبعة ۲۰۱۲ء.

۲۶۱۔ **مآثر الإنافة في معالم الخلافة:** أحمد بن عبد الله القلقشندي،متوفّٰى ۸۲۱ھ،عالم الكتب،بيروت.

۲۶۲۔ **مسلمانوں کا عروج وزوال:** مولانا سعيد أحمد اكبرآبادي،متوفیٰ ۱۴۰۶ھ،ادارہ اسلاميات،انار كلي،لاہور،اشاعت ۱۹۸۳ء.

۲۶۳۔ **منصبِ امامت:** شاہ محمد إسماعيل شهيد متوفیٰ ۱۲۴۶ھ،طيب پبلشرز،يوسف ماركيٹ،اردو بازار،لاہور،اشاعت چهارم ۲۰۰۸ء.

كُتُبِ مُتَفَرِّقَة

۲۶۴۔ **الأوائل:** حسن بن عبد الله بن سهل أبوهلال العسكري،متوفیٰ ۳۹۵ھ،دار البشير للثقافة والعلوم الإسلامية،طنطا،الطبعة الأولىٰ ۱۴۰۸ھ.

۲۶۵۔ **الأجوبة الفاضلة للأسئلة العشرة الكاملة:** عبد الحي اللكنوي، متوفیٰ ۱۳۰۴ھ، مكتب المطبوعات الإسلامية،بحلب،الطبعة الثالثة ۱۴۱۴ھ.

۲۶۶۔ **الإمام الصادق** عليه السلام: شيخ محمد أبوزهرة مصري ، متوفیٰ ۱۳۹۴ھ،مطبعة أحمد علي مخيمر، مصر.

۲۶۷۔ **حلم معاوية:** أبوبكر عبد الله بن محمد بن عبيد بن سفيان المعروف بابن أبي الدنيا، متوفیٰ ۲۸۱ھ،دار البشائر الإسلامية،بيروت،الطبعة الأولیٰ ۱۴۲۳ھ.

۲۶۸۔ **حياة الحيوان الكبرىٰ:** كمال الدين محمد بن موسى الدميري ، متوفیٰ ۸۰۸ھ ، دار

البشائر،دمشق،الطبعۃالأولیٰ۱۴۲۶ھ.

۲۶۹۔ **رسائل ابن حزم**: أبومحمد علي بن أحمد بن حزم الأندلسي، متوفّیٰ ۴۵۶ھ، المؤسسة العربية،بيروت،الطبعةالثانية۱۹۸۷ء.

۲۷۰۔ **عطارالجنان ترجمه حيات الحيوان**: أبوزين محمداقبال قادري، معاصر، اكبر بك سيلرز،لاهور،اشاعت ۲۰۱۳ء.

۲۷۱۔ **العقدالفريد**: أحمد بن محمد بن عبدربه الأندلسي،متوفّیٰ۳۲۸ھ،دارالكتب العلمية،بيروت،الطبعةالأولیٰ۱۴۰۴ھ.

۲۷۲۔ **كتاب الأوائل**: أبوبكرأحمد بن عمروبن أبي عاصم،متوفّیٰ۲۸۷ھ،دارالخلفاء للكتاب الإسلامي.وط: دارالبشائر الاسلامية، بيروت،الطبعة الأولى۱۴۲۵ھ.

۲۷۳۔ **كلياتِ اقبال (اُردو)**: علامةمحمدإقبالؒ،متوفّیٰ۱۹۳۸ء،الفيصل، شيخ غلام علي اينڈ سنز،لاهور.

۲۷۴۔ **مقدمة ابن خلدون**: عبدالرحمان بن محمد بن خلدون، متوفّیٰ ۸۰۸ھ، دار نهضة،مصر،الطبعةالسابعة۲۰۱۴ء.

۲۷۵۔ **ملفوظاتِ اعلیٰ حضرت**: إمام أحمد رضا بريلوي ، متوفّیٰ ۱۳۴۰ھ،مكتبةالمدينة كراچي،اشاعت۱۴۳۹ھ.

۲۷۶۔ **النصيحة للراعي والرعية**: أبوالخيربدل بن أبى المعمربن إسماعيل التبريزي،متوفّى ۶۳۶ھ،دارالصحابة للتراث بطنطا ، الطبعةالأولیٰ۱۴۱۱ھ.

۲۷۷۔ **نهاية الأرب في فنون الأدب**: شهاب الدين أحمد بن عبد الوهاب النويري، متوفّیٰ ۷۳۳ھ،دارالكتب العلمية،بيروت،الطبعةالأولیٰ۱۴۲۴ھ.

فہرست مضامین

مؤلف کی مطبوعہ تصنیف

أنوار العرفان في أسماء القرآن (کا اجمالی تعارف)

- لفظِ قرآن کی تحقیق، جمع قرآن، محفوظیتِ قرآن کا راز، حافظِ قرآن، اس کے والدین، معلمِ قرآن اور تعلیمِ قرآن میں معاونین کے فضائل اور ان کا اجر وثواب۔
- جامعیت قرآن، علوم قرآن کی تعداد، قرآن کے ہر حرف کا ایک ظاہر اور ایک باطن اور ہر ظاہر و باطن کا ایک مطلب۔
- جامعیت قرآن کے لیے حدیث شریف کی ناگزیریت اور صاحبِ قرآن ﷺ کی وسعتِ علمی کی شانِ بے پایاں۔
- قرآن کریم کے خاتم الکتب اور نبی کریم ﷺ کے خاتم الانبیاء ہونے کے حوالے سے جامعیتِ قرآن۔
- حضور اکرم ﷺ کے خُلق اور آپ کی سیرتِ طیبہ کی ہمہ گیریت کی روشنی میں جامعیتِ قرآن۔
- "الکوثر" سے قرآن کریم کا مراد ہونا اور صاحبِ قرآن ﷺ کا ازل سے امینِ قرآن ہونا۔
- اسم قرآن "الروح" اور "النور" کی روشنی میں صاحبِ قرآن ﷺ کے ازل سے امینِ قرآن ہونے کا تذکرہ۔
- الفاظِ قرآن کے ساتھ ساتھ روحِ قرآن اور نورِ قرآن کے حصول کا طریقہ۔
- تفسیر اور تأویل کا فرق، تفسیر قرآن کے لیے ضروری علوم، فقط ترجمہ کے بھیانک نتائج، اربابِ فہم حضرات کی شان، الفاظِ قرآن کے باطن سے مسائل مستنبط کرنے کا طریقہ۔
- ناظرہ قرآن مجید سیکھنے، سکھانے کے فضائل، ناظرہ سیکھنے والے بچوں کے والدین کے فضائل، قرآن مجید کو بھلانے کا گناہ، حفظ قرآن کی دعائیں، ماہرین اساتذہ کے تجربات اور ترتیل و تجوید کے ساتھ حفظ کرانے کا طریقہ۔
- بکثرت تلاوتِ قرآن کے اسباب، تلاوتِ قرآن کی کثرت اور سرعتِ تلاوت پر حیرت انگیز واقعات۔
- ترتیل و تجوید کی فرضیت، خوش آوازی کی فضیلت اور اسکے طبعی اور طبی فوائد، غیر معمولی تأثیر اور تدبر فی القرآن کا بیان۔
- قرآن کریم کا امام الکل ہونا، واعظین، مرشدین اور عام لوگوں پر کس حد تک قرآن کا علم حاصل کرنا فرض ہے؟
- قرآن کریم کا شفا ہونا، دم کرنے، کرانے اور تعویذ لٹکانے وغیرہ امور پر انتہائی مدلل بحث۔
- قرآن کریم کو چھونے اور پڑھنے کے آداب، اساتذہ، طلباء اور عام تلاوت کرنے والوں کے آداب، حفظِ قرآن میں رکاوٹیں اور ان کا ازالہ، ختم قرآن میں شمولیت اور ختم قرآن کے وقت دعا کی مقبولیت وغیرہ۔

شَرحُ خَصَائِصِ عَلِيٍّ رضی اللہ عنہ (مطبوع، الطبعة السادسة)

چند خصوصیات:

- مکمل عربی متن مع سند
- سابقہ عربی طبعات کی غلطیوں کی اصلاح
- ہر حدیث کی مکمل تخریج وتشریح
- سند کے لحاظ سے علماء اصولِ حدیث سے ہر حدیث پر حکم
- ہر حدیث پر وارد ہونے والے تمام اعتراضات کا متین جواب
- مصنف (امام نسائی رحمہ اللہ) کے قائم فرمودہ عنوانات کی روشنی میں خصوصیاتِ مرتضوی
- متن میں مذکور پنجتن پاک علیہم السلام کا تعارف اور ان کے اہم فضائل وخصائص
- جدید وقدیم تمام ناصبی اعتراضات کا انتہائی علمی اور مہذب رد
- علماء ومشائخ اہلِ سنت دامت برکاتہم کی گرانقدر تقریظات
- پانچ سو سے زائد مآخذ ومراجع (کتابیات) کی فہرست مع سنہ طباعت اور مطبع وغیرہ
- صفحات (1150) گیارہ سو پچاس
- مکمل بیروتی طرزِ طباعت وبائنڈنگ اور امپورٹڈ کاغذ۔

اذانِ مغرب واقامت کے مابین وقفہ (مطبوع)

مغرب کی اذان اور اقامت (تکبیر) کے درمیان مناسب وقفہ کے ثبوت میں پہلی کاوش۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسمِ اقدس کی نفاست و لطافت
اور فضلات شریفہ کی طہارت و برکت کے موضوع پر
اپنی مثال آپ کتاب۔

تصنیف:
قاری ظہور احمد فیضی

أسنى المطالب في مناقب
أمير المؤمنين علي بن أبي طالب رضي الله عنه

تصنیف:

امام ابوالخیر شمس الدین محمد بن محمد الجزری المقری الشافعی متوفی ۸۳۳ھ،

صاحبِ "حِصنِ حَصِین" اور صاحبِ "المقدمة الجزرية"۔

ترجمة، تخریج، تحقیق، تشریح

قاری ظہور احمد فیضی

مطبوع

اللّٰهُمَّ إِنَّهُمْ مِنِّيْ وَأَنَا مِنْهُمْ

"اے اللہ! یہ مجھ سے ہیں اور میں اِن سے ہوں"

اہل بیت کرام کے ساتھ

"علیہ السلام"

کہنے/لکھنے کا مسئلہ

تالیف:

قاری ظہور احمد فیضی

مکتبہ باب العلم

لاہور، پاکستان

کتاب الأربعین

في فضائل آل البیت الطاهرین

تصنیف

عبد الله بن صالح بن محمد العبید

استاذ کلیة الشریعة و وکیل مرکز دراسات الطالبات

بجامعة الامام محمد بن سعود الاسلامیة، الریاض

ترجمہ، تخریج، تحقیق، تشریح

قاری ظہور احمد فیضی

مکتبہ باب العلم

لاہور، پاکستان

الشمائل المحمدية

للإمام أبي عيسى محمد بن عيسى الترمذي

(۲۰۹ - ۲۷۹ھ)

ترجمہ، تخریج، تحقیق، تشریح

قاری ظہور احمد فیضی

مکتبۃ باب العلم
لاہور، پاکستان

مطبوع

شرح

أنوار العرفان في أسماء القرآن

اسماءِ قرآن کی روشنی میں فضائل وعلوم قرآن اور مقام
صاحبِ قرآن ﷺ پر اپنی نوعیت کی پہلی کتاب

تصنیف

قاری ظہور احمد فیضی

ریسرچ سکالر جامعہ اسلامیہ، لاہور

مکتبہ باب العلم

لاہور، پاکستان

مطبوع

أنزل الناس منازلهم من الخير والشر
لوگوں کو خیر و شر میں ان کے مقام پر رکھو

الأحاديث الموضوعة في فضائل معاوية

تالیف
قاری ظہور احمد فیضی
ریسرچ سکالر: جامعہ اسلامیہ، لاہور

مکتبہ باب العلم
لاہور، پاکستان

شرح

إتحاف السائل بما لفاطمة
من المناقب والفضائل

المعروف

مناقبِ الزہراء

تصنیف

امام زین الدین محمد بن عبد الرؤف المناوی

متوفی ۱۰۳۱ھ

ترجمہ، تخریج، تحقیق، تشریح

قاری ظہور احمد فیضی

مکتبہ باب العلم

لاہور، پاکستان